سلسلۂ دار المصنفین

(نمبر ۷۳)

ان من الشعر لحکمۃ وان من البیان لسحرا

اقبالِ کامل

یعنی

ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانحِ حیات کے ساتھ اُن کی تصنیفات اور

اُن کے فلسفہ اور شاعری پر نقد و تبصرہ

از

مولانا عبد السّلام ندوی

باہتمام: مسعود علی ندوی

مطبع معارف اعظم گڈھ میں چھپی

سنہ ۱۳۶۸ھ
۱۹۴۸ء

فہرست مضامین

اقبال کامل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ محمد وآلہٖ

واصحابہٖ اجمعین

تصنیف وتالیف کا میدان ایک ایسا میدان ہے جس کی تنگی اور وسعت دونوں ایک مصنف کے لیے مشکلات کا سبب بن جاتی ہین، اگر یہ میدان تنگ اور محدود ہے تو اس کیلیے یہ مشکل پیش آتی ہے کہ تھوڑی سی معلومات سے کیونکر اس طرح کام لے کہ وہ پھیل کر ایک مستقل تصنیف کا قالب اختیار کرلین، اس لیے وہ اس مشکل کے حل کرنے کے لیے بعض اوقات نہایت تصنع وتکلف سے کام لیتا ہے، اور بہت سی غیر ضروری اور غیر متعلق باتون کو شامل کرکے کتاب کے حجم وضخامت کو بڑھانا چاہتا ہے، اس طریقہ سے اگرچہ ایک کتاب تو تیار ہوجاتی ہے لیکن اسکو اصل موضوع کتاب سے کوئی تعلق نہین رہتا، لیکن اگر یہ میدان وسیع اور غیر محدود ہوتا ہے تو اس کو یہ دشواری پیش آتی ہے کہ وہ ان غیر محدود اور وسیع معلومات کو سمیٹ کر کیونکر متوسط حجم وضخامت کی ایک خوبصورت کتاب مرتب کرسکتا ہے، معلومات کا ایک بے پایان ذخیرہ اس کی نگاہ کے سامنے

ہوتا ہے، اور اس مین اس کو اپنے ذوق سلیم کی مدد سے مفید اور ضروری معلومات کا انتخاب کر کے اپنی راہ سب سے الگ نکالنی پڑتی ہے،

ڈاکٹر اقبال پر مین نے یہ کتاب لکھنی چاہی تو مجھکو یہی دوسری مشکل پیش آئی، اس کتاب کے متعلق مجھکو یہ شکایت نہین تھی کہ اس کے لیے معلومات کا جو سرمایہ درکار ہے وہ کم اور محدود ہے بلکہ ان کے متعلق اس قدر مضامین، اس قدر رسالے اور اس قدر کتابین لکھی گئی ہین کہ ان کے پڑھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ

شد پریشان خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا

اسلیے ان خوابہاے پریشان کو جمع کر کے ان کی صحیح تعبیر نکالنا مشکل اور سخت مشکل کام تھا، لیکن بااینہمہ مین نے یہ کوشش کی ہے کہ میری اس کتاب سے یہ خواب اور زیادہ پریشان نہ ہونے پائے، بلکہ اس کی ایک ایسی تعبیر نکل آئے جو اس کو خواب پریشان کے بجائے رویاے صالحہ بنا دے، اس غرض سے مین نے ان مضامین، ان رسالون اور ان کتابون کا مطالعہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ ان سے مکمل طور پر ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا کوئی گوشہ نمایان نہین ہوتا، زیادہ تر مضامین اور رسالے تو نہایت سطحی ہین، اور لکھنے والون نے صرف یہ سمجھ کر لکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب پر لکھنا نہایت آسان ہے، اس لیے مین نے ان کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے، چند رسالے، چند مضامین اور چند کتابین بے شبہہ تحقیقی طور پر لکھی گئی ہین، لیکن ان مین بھی جامعیت نہین پائی جاتی، بلکہ وہ خاص خاص عنوانات تک محدود ہین، لیکن بااینہمہ ان مین کوئی چیز بیکار نہین ہے، بلکہ ان کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس مین کونسا حصہ قابلِ اخذ و انتخاب ہے، کون سی باتین منتشر و پراگندہ ہین جن کو ایک خوبصورت ترتیب سے یکجا جمع کیا جا سکتا ہے، اور کونسی چیز تشنہ و نامکمل ہے جس کی تکمیل کی جا سکتی ہے،

اس حیثیت سے میں نے اس ذخیرۂ معلومات پر نگاہ ڈالی تو مجھے محسوس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کے سوانح وحالات پر اگرچہ کوئی مکمل مضمون، کوئی مکمل رسالہ اور کوئی مکمل کتاب نہیں لکھی گئی، تاہم انھی میں اس کا مواد اس کثرت سے موجود ہے کہ ان کو جمع کرکے ڈاکٹر صاحب کے سوانح وحالات کو مکمل صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے، اس لیے میں نے اس مواد کو تقریباً انھی کے الفاظ وعبارت میں مناسب ترتیب کے ساتھ ایک جگہ جمع کر دیا ہے، اگر یہ مواد عربی، فارسی یا کسی دوسری زبان میں ہوتا تو مجھے اس کو اردو زبان میں لانا پڑتا، لیکن ڈاکٹر صاحب کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا زیادہ تر حصہ چونکہ خود اردو میں ہے اس لیے معمولی سے تغیر وتبدل کے بعد مین نے اس کو بعینہ درج کر دیا ہے اور اس کا حوالہ دیدیا ہے، ڈاکٹر صاحب کے مکاتیب کے جو مجموعے شائع ہوئے ہین ان سے بھی اس معاملے مین مدد لی ہے، سوانح حیات کے علاوہ دوسرے عنوانات مین بھی مضامین ورسائل سے جو باتین قابل اخذ وانتخاب نظر آئین مین نے ان کو بھی انھی کے الفاظ وعبارت مین لے لیا ہے، اور ان کی مزید تشریح کر دی ہے، البتہ ڈاکٹر صاحب کی شاعری اور فلسفہ پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر مجھکو بہت کچھ اضافہ کی ضرورت معلوم ہوئی، اور اس کتاب مین مین نے جو کچھ واتی کاوش کی ہے وہ صرف اسی حصے کے ساتھ تعلق رکھتی ہے جس کے لیے صرف اخذ وانتخاب کافی نہین تھا بلکہ ڈاکٹر صاحب کے پورے کلام کے مطالعہ کی ضرورت تھی،

ڈاکٹر صاحب کا کلام اگرچہ زیادہ تر فلسفیانہ، صوفیانہ، مذہبی، سیاسی اور قومی مسائل پر مشتمل ہے، لیکن یہ مسائل شاعرانہ طرز واسلوب مین بیان کئے گئے ہین، اس لیے ان کی تمام حیثیتون پر شاعرانہ حیثیت کو تقدم حاصل ہے، اور ہم کو موقع پر اسی حیثیت کو پیش نظر رکھنا اور اس کو نمایان کرنا چاہیے، لیکن ڈاکٹر صاحب پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس مین ان کی اسی شاعرانہ حیثیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، اور انھون نے جن حقائق ومسائل کے متعلق اپنے خیالات ظاہر

کیے ہیں ان کی توضیح کے لیے جو مثالیں ان کے کلام سے پیش کی گئی ہیں ان میں شاعری بہت کم
پائی جاتی ہے، خود ڈاکٹر صاحب شاعری سے برأت ظاہر کرتے ہیں، اور غزلگو شاعر بننے سے
تو ان کو شدت سے انکار ہے، اس لیے دوسرے لوگوں نے بھی ان کی مجددانہ، مصلحانہ اور
فلسفیانہ حیثیت کو تو سامنے رکھا ہے، اور ان کی شاعرانہ حیثیت کو نمایاں نہیں کیا ہے، لیکن
میرے نزدیک ان کا کلام خشک فلسفیانہ مسائل کا مجموعہ نہیں ہے، یعنی وہ صرف ناظم نہیں
ہیں بلکہ ایک قادر الکلام شاعر ہیں، اس لیے میں نے فلسفیانہ، صوفیانہ اور سیاسی مسائل سے
پہلے ان کی ذات کو صرف ایک شاعر کی حیثیت سے پیش نظر رکھا ہے، اور مختلف عنوانات
میں ان کی شاعرانہ حیثیت کو زیادہ مکمل صورت میں نمایاں کیا ہے، فلسفیانہ اور صوفیانہ
حقائق و مسائل پر بھی جو کچھ لکھا ہے اس میں بھی اسی حیثیت کو سامنے رکھا ہے، اور زیادہ تر
ان کی غزلیات، قطعات اور نظموں سے ایسی مثالیں پیش کی ہیں جن میں شاعری اور
فلسفہ دونوں کا خوشگوار امتزاج موجود ہے، اس لیے اس طریقہ سے ان کے بہترین
کلام کا انتخاب بھی اس کتاب میں آگیا ہے، لیکن باایں‌ہمہ شاعرانہ اور فلسفیانہ دونوں
حیثیتوں کو پیش نظر رکھکر ان کے بہترین کلام کے ایک عمدہ انتخاب کی ضرورت اب بھی
باقی رہ جاتی ہے، ڈاکٹر صاحب کے متعلق اور تو بہت کچھ کرلیا گیا ہے، لیکن اب تک
اس ضرورت کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی ہے، ممکن ہے اس کتاب کی اشاعت کے
بعد میں خود اس کی طرف متوجہ ہوسکوں اور اس کتاب کا یہ تکمیلی حصہ بھی پورا ہوجائے
بہرحال اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب کی زندگی اور کارناموں کے ہر حصہ کے مکمل
کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور اسی مناسبت سے میں نے پہلے اسکا نام "مکمل اقبال"
تجویز کیا تھا، اور اب مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کا نام "اقبال کامل" رکھا ہے جو پہلے سے

زیادہ بہتر ہے، اس لیے یہ کتاب اسی نام سے شائع کی جاتی ہے، اس کتاب کا پورا مسودہ مولانا عبد الماجد دریا بادی کی نظر سے بھی گذر چکا ہے، جو فلسفی ہونے کے ساتھ صوفی اور سخن فہم بھی ہین، اور اب جب کہ اس کتاب کا مسودہ پریس مین جا رہا ہے، مزید اطمینان کے لیے اس کو ہمارے عزیز دوست اور دار المصنفین کے پرانے رفیق مولوی شاہ معین الدین صاحب ندوی نے بھی جو شعر و ادب دونون کا عمدہ ذوق رکھتے ہین، بہ نظر غائر دیکھ لیا ہے، اور ان کے مشورہ سے اس کتاب کی بہت سی خامیان دور ہو گئی ہین،

افسوس ہے کہ اس کتاب مین، مین اُن انگریزی تصنیفات سے جو ڈاکٹر صاحب کی شاعری اور فلسفہ پر لکھی گئی ہین، بہت کم فائدہ اٹھا سکا، تاہم جا بجا اس قسم کی جو معلومات نظر آتی ہین وہ ہمارے دوست سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم، اے کی توجہ و عنایت کا نتیجہ ہین، اور مین اس کے لیے ان کا شکر گذار ہون.

عبد السلام ندوی
دار المصنفین اعظم گڈھ
(۴ر دسمبر ۱۹۴۷ء)

سوانح حیات

تمہید

قدیم زمانے مین جبکہ اردو شاعری کا دائرہ صرف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ تک محدود تھا، سرزمین پنجاب مین کوئی نامور شاعر پیدا نہین ہوا، اس غرض سے ہم نے بہت سے قدیم تذکرون کی ورق گردانی بھی کی، لیکن پنجاب کے کسی ممتاز شاعر کا نام نظر سے نہین گذرا، قدیم زمانے مین لکھنؤ اور دلی اردو شاعری کے دو مستند مرکز تھے، لیکن لکھنؤ کو یہ خاص امتیاز حاصل ہے کہ اس نے اپنے قرب وجوار پر نمایان اثر ڈالا، اور خاص لکھنؤ کے علاوہ صوبہ اودھ اور صوبہ آگرہ کے مختلف شہرون مین بھی متعدد ممتاز شعرا پیدا ہو گئے، لیکن تعجب ہے کہ دلی نے باوجود قرب واتصال کے پنجاب پر کوئی اثر نہین ڈالا، لیکن اردو شاعری کے دور جدید کا آغاز پنجاب ہی سے ہوا، اور کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب نے اردو زبان کی ترقی واصلاح کے جو مختلف طریقے اختیار کئے اُن مین ایک یہ تھا کہ انھون نے ایک نئے طرز کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس مین مصرع طرح کے بجائے کسی مضمون کا عنوان دیا جاتا تھا تاکہ اردو شاعری کے دائرے مین وسعت

پیدا ہو، اور عاشقانہ خیالات کے بجائے مناظر قدرت اور مختلف جذبات انسانی کی تصویرین کھینچی
جائین، اگرچہ پہلے پہل یہ شرف دلی کے دو بزرگون کو حاصل ہوا، یعنی مولانا محمد حسین آزاد اور
مولانا الطاف حسین حالی نے جو اردو شاعری مین ذوق و غالب کی یادگار تھے، اور اسوقت
پنجاب کے سررشتۂ تعلیم سے تعلق رکھتے تھے، جدید طرز مین چند چھوٹی چھوٹی نظمین اور مثنویان
لکھین، لیکن بعد کو زندہ دلانِ پنجاب نے اس کو ترقی دے کر تلافیٔ مافات کر دی، اور اس
طرز مین کہنے والے متعدد شعراء پیدا ہو گئے، جن مین

ڈاکٹر اقبال

نے عالمگیر شہرت حاصل کی،

ڈاکٹر صاحب نسلاً کشمیری برہمنون کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے ہین، جس کی
ایک شاخ ابتک کشمیر مین موجود ہے، یون تو ہندؤن مین برہمن اپنے مذہبی تقدس کیوجہ
سے عموماً معزز سمجھے جاتے ہین، لیکن کشمیری برہمن کشمیر مین علمی حیثیت سے بھی امتیاز خاص رکھتے
تھے، اس لیے ڈاکٹر صاحب نے اس شرف پر ایک جگہ خاکسارانہ لہجے مین خاص طور پر فخر
کیا ہے، چنانچہ ایک فلسفہ زدہ سید کو اس طرح مخاطب کرتے ہین:۔

مین اصل کا خاص سومناتی ۔ آبا مرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد ۔ میری کفِ خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ میری آب و گل مین ۔ پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل مین

ذات پات کے لحاظ سے کشمیری برہمنون کی جو مختلف قسمین ہین اس کے رو سے ڈاکٹر صاحب
کی گوت یعنی ذات سپرو ہے، اور الہ آباد ہائیکورٹ کے مشہور وکیل سر تیج بہادر سپرو اور
ڈاکٹر صاحب چار یا پانچ پشت اوپر ایک ہی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، لیکن سوا دو سو سال

سے زیادہ کا زمانہ گذرا کہ ڈاکٹر صاحب کے جد اعلیٰ ایک بزرگ کی عقیدت کی وجہ سے مشرف به اسلام ہوکر سیالکوٹ چلے آئے۔ جو کشمیر کے علاقہ سے ملحق ہے، اور اس وجہ سے وہان نہایت کثرت سے کشمیری خاندان آباد ہین، اس لیے اختلاف مذہب کی وجہ سے اس خاندان کی مختلف شاخین ایک دوسرے سے بے تعلق ہوگئین،

ولادت — ڈاکٹر صاحب اسی سیالکوٹ مین ۱۸۷۶ء مین پیدا ہوئے، ان کی ولادت سے چند روز پہلے ان کے والد نے ایک خواب دیکھا تھا کہ "ایک بڑا ہی عجیب وغریب پرندہ فضا مین زمین کے قریب اڑ رہا ہے، اور بڑی کثرت سے لوگون کا ہجوم ہے، اس ہجوم مین مین بھی ہون، وہ پرندہ کسی کی کوشش سے ہاتھ نہین آتا لیکن خود بخود میرے دامن مین آکر گرا اور مین نے اس کو پکڑ لیا"، اس کے بعد ڈاکٹر صاحب پیدا ہوئے تو انھون نے اس خواب کی یہ تاویل کی کہ وہ پرندہ یہی بچہ ہے، اور یہ ضرور کوئی غیر معمولی کمال پیدا کرے گا۔

ڈاکٹر صاحب کے والد جن کا نام نور محمد تھا، اگرچہ صاحب ثروت نہ تھے، لیکن اپنے شہر مین اپنی مذہبی اور اخلاقی پاکیزگی کی وجہ سے قابل احترام سمجھے جاتے تھے، ان پر تصوف کا رنگ بہت زیادہ غالب تھا، اور ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس آبائی بلکہ خاندانی خصوصیت کی طرف بعض اشعار مین خود بھی اشارہ کیا ہے، چنانچہ اپنے فرزند جاوید کو مخاطب کرکے فرماتے ہین:

جس گھر کا مگر چراغ ہے تو — ہے اس کا مذاق عارفانہ

اس بنا پر ڈاکٹر صاحب نے ایک صوفیانہ ماحول مین نشو ونما پائی اور ان کے والد بزرگوار نے ان کی تربیت بالکل مذہبی اور اخلاقی اصول پر کی، چنانچہ خود ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ "جب مین سیالکوٹ مین پڑھتا تھا تو صبح اٹھ کر روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا، والد مرحوم اپنے اوراد ووظائف سے فرصت پاکر آتے اور مجھے دیکھ کر گذر جاتے۔ ایک دن صبح کو میرے

پاس سے گذرے تو فرمایا کہ کبھی فرصت ملی تو مین تم کو ایک بات بتاؤن گا، بالآخر انھون نے ایک مدت کے بعد یہ بات بتائی، اور ایک دن صبح کو جب مین حسبِ دستور قرآن کی تلاوت کر رہا تھا تو وہ میرے پاس آئے اور فرمایا "بیٹا! کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن تم ہی پر اترا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے"۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک شعر مین بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے،

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب　　گرہ کشا ہین نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

ایک بار ڈاکٹر صاحب کے دروازے پر ایک سائل نے صدا دی اور بری طرح اڑ گیا، ڈاکٹر صاحب کے شباب کا زمانہ تھا، انھون نے اس کو ایک ڈنڈا رسید کیا، اور اس کی جھولی زمین پر پھینک دی، باپ کا دل اس بیرحمی سے بھر آیا، آنکھون سے آنسو جاری ہوگئے، اور اس حالت مین انھون نے بیٹے کو جو نصیحت کی اس کو ڈاکٹر صاحب نے خود رموزِ بیخودی مین نہایت موثر طریقہ سے بیان کیا ہے:

گفت فردا امتِ خیر الرسل　　جمع گردد پیش آن مولائے کل

غازیان ملتِ بیضائے او　　حافظان حکمتِ رعنائے او

ہم شہیدانے کہ دین را حجت اند　　مثلِ انجم در فضائے ملت اند

زاہدان و عاشقان دل فگار　　عالمان و عاصیانِ شرمسار

درمیان انجمن گردد بلند　　نالہ ہائے این گدائے دردمند

اے صراطت مشکل از بے مرکبی　　من چہ گویم چون مرا پرسد نبی

یعنی انھون نے فرمایا کہ قیامت کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد تمام امت جس مین مجاہد، حکیم، شہید، زاہد، صوفی، عالم اور گنہگار ہر قسم کے لوگ ہون گے، جمع ہوگی،

اور اس مجمع مین یہ مظلوم سائل فریاد کرے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے اس کا جواب طلب کرین گے تو مین کیا کہون گا،

اند کے اندیش و یاد آر اے پسر	اجتماع امتِ خیر البشر
باز این ریشِ سفید من نگر	لرزۂ بیم و امید من نگر
بر پدر این جور نازیبا مکن	پیش مولا بندہ را رسوا مکن
غنچۂ از شاخسار مصطفےٰ	گل شو از باد بہار مصطفےٰ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت	بہرۂ از خلق او باید گرفت
فطرتِ مسلم سراپا شفقت است	در جہان دست و زبانش رحمت است
آنکہ مہتاب از سر انگشتش دو نیم	رحمتِ او عام اخلاقش عظیم
از مقام او اگر دور ایستی	از میان معشر ما نیستی

یعنی اس مجمع کا خیال کر اور میری سفید داڑھی کو دیکھ، باپ پر اس قدر ظلم کر کے آقا کے سامنے اس کو ذلیل نہ کر، تو چمن محمدی کی ایک کلی ہے، اور اسی چمن کی ہوا سے پھول بنکر کھل، اسی چمن کی بہار سے تجھکو رنگ و بو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق سے ایک حصہ لینا چاہیے، مسلمان کی فطرت سراپا شفقت اور اس کے ہاتھ اور زبان رحمت ہین جس نے ایک انگلی کے اشارے سے چاند کو دو ٹکڑے کر دیا، اس کی رحمت عام اور اسکے اخلاق نہایت بلند پایہ ہین، اس لیے اگر تو اس کے مقام سے دور ہے تو ہماری جماعت سے الگ ہے،

ڈاکٹر صاحب کی والدہ مرحومہ بھی ایک دیندار اور عبادت گذار خاتون تھین، اس لیے انھون نے بھی ان کی مذہبی اور اخلاقی تربیت مین نمایان حصہ لیا، چنانچہ ڈاکٹر صاحب

نے اپنی والدہ مرحومہ کا جو مرثیہ لکھا ہے اس مین اس کی طرف اشارے پائے جاتے ہین:

خاکِ مرقد پر تری لیکر یہ فریاد آؤنگا
اب دعائے نیم شب مین کسکو مین یاد آؤنگا

تربیت سے مین تری انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

دفتر ہستی مین تھی زرین ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

تعلیم و تربیت | ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی تعلیم قدیم طرز پر مکتب سے شروع ہوئی، لیکن بعد مین انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے سیالکوٹ کے مشن اسکول مین داخل ہوئے، اور چونکہ طبیعت مین ذکاوت و ذہانت کا مادہ خدا داد تھا، اس لیے ابتدا ہی سے اس کے جوہر نمایان ہونے لگے، چنانچہ پانچوین جماعت کا امتحان وظیفہ لے کر پاس کیا، مڈل کے آخری درجہ مین بھی وظیفہ حاصل کیا، اور انٹرنس کے امتحان مین بھی سرکاری وظیفہ کے ساتھ کامیابی حاصل کی، ڈاکٹر صاحب کی خوش قسمتی سے اس اسکول کے مدرسین مین قدیم طرز تعلیم کی ایک عمدہ یادگار مولوی میر حسن مرحوم مدرس عربی و فارسی تھے، اس لیے اس اسکول مین مولوی صاحب موصوف کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے تعلیمی تعلقات قائم ہوئے، جس کی تقریب یہ ہوئی کہ مولوی صاحب موصوف کا ایک لڑکا ڈاکٹر صاحب کا ہم جماعت تھا، اور اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے والد ماجد سے انکے دوستانہ تعلقات بھی تھے، اس لیے جس زمانہ مین ڈاکٹر صاحب چوتھی جماعت مین تعلیم پا رہے تھے ایک دن ان کے والد ماجد مولوی صاحب موصوف کے پاس تشریف لے گئے۔ اور کہا کہ "مین نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ بچے کو آپ اسکول کی تعلیم دینے کے بجائے دینیات کا درس دیا کرین اور آئندہ یہ مدرسہ جانے کے بجائے مسجد ہی مین پڑھا کرے"۔ لیکن مولوی صاحب نے مسکرا کر فرمایا "بچہ مسجد مین پڑھنے کے لیے نہین بلکہ مکتب مین پڑھنے کے لیے پیدا ہوا ہے اور یہ مدرسہ ہی مین پڑھے گا"۔

مولوی صاحب موصوف کی زندگی خالص علمی زندگی تھی، اور ان کو شعرائے عرب، شعرائے ایران اور شعرائے اردو کے بے شمار اشعار زبانی یاد تھے اور ان کی تعلیم کا یہ خاصہ تھا کہ جو شخص ان سے عربی اور فارسی زبان کی تعلیم حاصل کرتا تھا اس کی طبیعت مین اس زبان کا صحیح مذاق پیدا کر دیتے تھے، چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے ان کی تعلیم و صحبت سے پورا فائدہ اٹھایا اور میلان طبیعت کے علاوہ یہ انہی کے فیض صحبت کا اثر تھا کہ جوانی کے زمانے مین ڈاکٹر صاحب کو اساتذہ کے ہزارون اشعار ازبریاد تھے،

بہرحال ڈاکٹر صاحب مین عربی اور فارسی کی زباندانی اور شعر و سخن کا جو ذوق پیدا ہوا وہ انہی بزرگ کی تعلیم اور صحبت کا نتیجہ ہے، چنانچہ سفر انگلستان کے موقع پر حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر انھون نے "التجائے مسافر" کے عنوان سے جو نظم پڑھی اس مین عقیدت مندانہ طور پر ان کے اس علمی احسان کا اعتراف کیا،

وہ شمع بارگہِ خاندان مرتضوی — رہے گا مثل حرم جسکا آستان مجھکو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی — بنایا جس کی مروّت نے نکتہ دان مجھکو
دعا یہ کر کہ خداوند آسمان و زمین — کرے پھر اسکی زیارت سے شادمان مجھکو

مولوی صاحب کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی یہ عقیدت مندی عمر بھر قائم رہی، چنانچہ گورنمنٹ نے جب ڈاکٹر صاحب کو "سر" کا خطاب دینا چاہا تو ڈاکٹر صاحب نے اس کو اس شرط کے ساتھ قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی کہ ان کے استاد مولوی سید میر حسن صاحب کو بھی شمس العلماء کا خطاب عطا فرمایا جائے، چنانچہ اس شرط کے مطابق انکو بھی شمس العلماء کا خطاب دیا گیا،

شاگرد کو استاد کے ساتھ جس قدر عقیدت تھی، استاد کو بھی شاگرد کے ساتھ اسی قدر

محبت تھی، چنانچہ ایک بار ڈاکٹر صاحب ایک خطرناک مرض مین مبتلا ہو کر علاج کے لیے دہلی گئے تو مولوی سید میر حسن صاحب کو اس قدر تشویش ہوئی کہ ایک خاص آدمی کو اس غرض کے لیے مقرر کیا کہ وہ روزانہ اسٹیشن جاکر اخبار انقلاب لائے اور ڈاکٹر صاحب کی علالت کے متعلق اس مین جو تار شائع ہون ان کو پڑھ کر سنائے،

استادی اور شاگردی کا یہ سلسلہ صرف سیالکوٹ کے زمانہ طالب علمی ہی تک قائم نہین رہا بلکہ بعد کو بھی ڈاکٹر صاحب ان سے اپنے فارسی کلام کے متعلق اصلاح اور مشورہ لیتے رہے، چنانچہ رموز بیخودی کے دیباچہ مین خود اس کی تصریح کی ہے،

ڈاکٹر صاحب کے اساتذہ عربی و فارسی مین اگرچہ مولوی سید میر حسن صاحب کو خاص طور پر شہرت حاصل ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ان کے علاوہ اور بھی متعدد اساتذہ سے فارسی زبان کی تعلیم پائی ہے، چنانچہ اسد ملتانی نے اپنی ایک ملاقات کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ جب مین ان سے ملا تو ان کے سامنے ان کے ایک ہم عمر بزرگ تشریف رکھتے تھے جو سیالکوٹ کے رہنے والے اور غالباً ان کے ہم جماعت یا بچپن کے دوست تھے، ان کے ساتھ وہ اپنے طالب العلمی کے زمانہ کے واقعات کی یاد تازہ کر رہے تھے، کہ سیالکوٹ مین وہ کس طرح مدرسہ کے اوقات کے بعد مساجد و مکاتب مین مختلف علماء کی خدمت مین حاضر ہو کر فارسی پڑھا کرتے تھے، ایک استاد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کا (اپنا یا شاید ان کا بتایا ہوا) یہ شعر اب تک نہین بھولتا،

دوستان رحمے کہ از بام بلند افتادہ ام — از قدِ رعنائے او من دردمند افتادہ ام[1]

فارسی زبان کے ساتھ انھون نے پنجاب یونیورسٹی کے عربی امتحانات بھی اول درجہ

[1] اقبال نامہ ص ۳۴۲

مین پاس کیے، چنانچہ وہ مہاراجہ سرکشن بہادر وزیراعظم ریاست حیدرآباد دکن کو ایک خط مین لکھتے ہیں کہ

"عربی زبان کے امتحانات مین مین پنجاب مین اول رہا ہون"[1]

ڈاکٹر صاحب نے ایف، اے تک مشرقی اور مغربی انداز کی یہ مخلوط تعلیم سیالکوٹ ہی مین پائی، لیکن چونکہ اس وقت تک سیالکوٹ کا اسکاچ مشن کالج صرف ایف اے تک تھا، اس لیے ڈاکٹر صاحب ایف اے پاس کر لینے کے بعد لاہور چلے آئے، اور بی اے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور مین داخل ہوئے، اس وقت ڈاکٹر صاحب کی خوش قسمتی سے مسٹر آرنلڈ وہان فلسفہ کے پروفیسر تھے، جو اس سے پہلے علی گڈھ کالج مین پروفیسر رہ چکے تھے، اور وہان وہ مولانا شبلی مرحوم سے عربی اور مولانا مرحوم ان سے فرنچ زبان کی تعلیم حاصل کرتے تھے، اس طرح ان کو اسلامی ادبیات سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، علی گڈھ کالج مین دس برس رہنے کے بعد وہ فروری ۱۸۹۸ء مین گورنمنٹ کالج لاہور مین فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہو گئے، ڈاکٹر صاحب نے بی اے اور ایم اے مین فلسفہ کا اختیاری مضمون لیا تھا، اور پروفیسر آرنلڈ کی تعلیم و تربیت نے اس قدرتی جوہر کو اور بھی چمکا دیا اور ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کا امتحان امتیاز خاص کے ساتھ پاس کیا، اور اس کے صلہ مین وظیفہ کے علاوہ دو طلائی تمغے بھی حاصل کیے، اس کے بعد ایم اے مین بھی فرسٹ آئے، اور اس صلہ مین ان کو "نانک بخش مڈل" ملا،

لیکن پروفیسر آرنلڈ ڈاکٹر صاحب مین علمی ذوق پیدا کر کے ۱۹۰۴ء مین انگلستان واپس چلے گئے، اور ڈاکٹر صاحب نے ان کے رخصت ہونے پر "نالۂ فراق" کے عنوان سے ایک الوداعی نظم لکھی جس مین اس علمی ذوق کا خاص طور پر تذکرہ کیا جو ان کے فیض صحبت نے ان مین پیدا کر دیا تھا،

تو کہان ہے اے کلیم ذرۂ سینائے علم	تھی تری موج نفس باد نشاط افزائے علم
اب کہان وہ شوق رہ پیمائی صحرائے علم	تیرے دم سے تھا ہمارے سر مین بھی سودائے علم

[1] مکاتیب شاد و اقبال ص۲۹

شورِ لیلی کو کہ باز آرائش سودا کند — خاکِ مجنون را غبارِ خاطرِ صحرا کند

سفرِ انگلستان مسٹر آرنلڈ کی تعلیم و تربیت اور فیضِ صحبت نے ڈاکٹر صاحب مین جو علمی ذوق پیدا کر دیا تھا، وہ ابھی نا مکمل تھا، اور اس کی تکمیل کے لیے وہ خود انگلستان جانا چاہتے تھے. لیکن ایم. اے ہونے کے بعد وہ پہلے اورنٹیل کالج لاہور مین تاریخ، فلسفہ اور سیاست مدن کے لکچرار مقرر ہو گئے تھے، پھر گورنمنٹ کالج لاہور مین فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوے. اس لیے ملازمت کا یہ تعلق زنجیر پا ہو رہا تھا، اور اس نظم کے ایک مصرع مین

توڑ کر پہونچون گا مین پنجاب کی زنجیر کو

"پنجاب کی زنجیر" سے غالباً ملازمت کے اسی تعلق کی طرف اشارہ ہے. لیکن بالآخر وہ اس زنجیر کو توڑ کر ۱۹۰۵ء مین رخصت لے کر عازمِ انگلستان ہوے. اور خاندانی تصوف کی عقیدت و اثر کی بنا پر سب سے پہلے دلی مین حضرت نظام الدین اولیا، کے مزارِ مبارک پر حاضر ہو کر ایک نظم پڑھی جس مین اظہارِ عقیدت کے بعد اپنے مقصدِ سفر کا اظہار اس طرح کیا،

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہون مثلِ نکہتِ گل — ہوا ہے صبر کا منظور امتحان مجھکو

چلی ہے لیکے وطن کے نگار خانے سے — شرابِ علم کی لذت کشان کشان مجھکو

قیامِ انگلستان کے مصارف زیادہ تر ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے برداشت کیے اور اس سلسلے مین خود ڈاکٹر صاحب کی زبانی یہ لطیفہ سننے کے قابل ہے کہ

"جب مین ولایت گیا تو کچھ اپنا روپیہ میرے پاس موجود تھا، لیکن زیادہ رقم میرے بھائی صاحب نے مجھکو دی تھی، ولایت کے قیام کے دوران مین بھی وقتاً فوقتاً مجھکو روپے بھیجتے رہتے تھے. جب مین نے کیمبرج سے بی. اے کر لیا تو انھون نے لکھا کہ اب بیرسٹری کا کورس ختم کر کے واپس آ جاؤ. لیکن میرا ارادہ پی. ایچ. ڈی کی ڈگری لینے کا تھا، اس لیے مین نے

جواب دیا کہ کچھ رقم اور بھیجیے، تاکہ جرمنی جاکر ڈاکٹری کی سند بھی لے لوں، انھوں نے مجھکو مطلوبہ رقم بھجدی، انہی دنون مین وہ ایک روز سیالکوٹ مین اپنے بے تکلف دوستون کی صحبت مین بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی شخص نے پوچھا "کیون شیخ صاحب سنا ہے اقبال نے ایک اور ڈگری لے لی ہے . بھائی صاحب نے جواب دیا "بھئی کیا بتاؤن ابھی تو وہ ڈگریون پر ڈگریان لیے جا رہا ہے خدا جانے ان ڈگریون کا اجرا کب ہوگا"[1]

بہرحال ڈاکٹر صاحب انگلستان پہنچکر کیمبرج یونیورسٹی مین داخل ہوئے، اور جیسا کہ ڈاکٹر ملک راج انند ایم اے نے نیرنگ خیال اقبال نمبر بابت ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۲ء مین لکھا ہے

خوش قسمتی سے انگلستان مین پہنچتے ہی ان کی ملاقات میک ٹگارٹ جیسے فلسفی سے ہوئی جو ہیگل کا متبع تھا، اور اس زمانے مین فلسفی کی حیثیت سے بیحد شہرت حاصل کر چکا تھا، پھر ادب فارسی کے مشہور مورخ اے۔ جی براؤن اور "اسرار خودی" کے مترجم ڈاکٹر نکلسن سے ملاقات ہوئی، عنفوان زندگی مین ڈاکٹر صاحب کو فلسفہ اور ادب فارسی سے بیحد شغف تھا، لیکن جب ان کا رجحان وطنیت اور قومیت کی طرف ہوا اور وہ ان موضوعون پر نظمین لکھنے لگے تو یہ شوق دبکر رہ گیا، اب یہ شوق پھر پیدا ہوا، اور ان لوگون کے اثر و تربیت نے اسے پختہ کر دیا، میک ٹگارٹ کے لکچرون سے انھون نے فلسفیانہ خیالات کے اظہار کا سائنٹفک انداز سیکھا...... براؤن اور نکلسن کی دوستی سے انھین یہ فائدہ ہوا کہ انھون نے گھر پر فارسی کا جو علم حاصل کیا تھا، اس مین پختگی پیدا ہوگئی،

لیکن کیمبرج یونیورسٹی مین ان کا زیادہ تر تعلق پروفیسر وارڈ سارلے اور پروفیسر براؤن سے رہا، اور اس طرح انھون نے پورے تین سال یورپ مین طالب العلمانہ حیثیت سے

[1] آثار اقبال ص ۳۶

بسر کیے اور اس مدت مین بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا، کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفۂ اخلاق مین اور میونک یونیورسٹی جرمنی سے "میٹا فزکس آف پرشیا" یعنی ایرانی الٰہیات پر ایک مقالہ لکھکر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی، پھر جرمنی سے واپس آکر لندن کے اسکول آف پولٹیکل سائنس مین داخل ہوئے، اور ۶ ماہ تک لندن یونیورسٹی مین پروفیسر آرنلڈ کے قائم مقام کی حیثیت سے عربی کے پروفیسر بھی رہے، اور تقریر وخطابت کا مشغلہ بھی جاری رکھا، چنانچہ انھون نے خود اپنی ایک کامیاب موثر تقریر کا ایک واقعہ بھی بیان کیا ہے، جو آثار اقبال صفحہ ۳۹، ۴۰، ۴۱ مین مذکور ہے، اور اس سلسلے مین عام تقریرون کے علاوہ انھون نے خصوصیت کے ساتھ اسلام پر بھی لکچر دیے،

انگلستان سے واپسی | صرف ۳۲ - ۳۳ سال کی عمر مین اتنے علمی اعزازات اور اسقدر ڈگریان لیکر ڈاکٹر صاحب تین برس کے قیام کے بعد ۱۹۰۸ء مین انگلستان سے واپس ہوئے، اور روانگی انگلستان کے وقت جس طرح انھون نے دلی مین حضرت محبوب الٰہیؒ کے آستانے پر حاضر ہوکر ایک عقیدت مندانہ نظم پڑھی تھی، اسی طرح واپسی پر بھی اس آستانہ پر حاضر ہوکر سر تسلیم خم کیا،

بیرسٹری | انگلستان سے واپس آکر ڈاکٹر صاحب نے بیرسٹری شروع کی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ کچھ دنون تک گورنمنٹ کالج لاہور مین فلسفہ کے پروفیسر بھی رہے، چنانچہ ایک خط مین مہاراجہ سر کشن بہادر کو لکھتے ہین :

انگلستان سے واپس آنے پر لاہور گورنمنٹ کالج مین مجھے فلسفے کا اعلیٰ پروفیسر مقرر کیا گیا تھا، یہ کام مین نے ۱۸ ماہ تک کیا، اور یہان کی اعلیٰ ترین جماعتون کو اس فن کی تعلیم دی، گورنمنٹ نے بعد ازان یہ جگہ مجھے آفر بھی کی مگر مین نے انکار کر دیا، میری ضرورت گورنمنٹ کو کس قدر تھی اس کا اندازہ اس سے ہو جائے گا کہ پروفیسری کے تقرر کی وجہ سے مین صبح کچہری نہ جا سکتا تھا، چنانچہ ہائیکورٹ کو گورنمنٹ کی طرف سے ہدایت کی گئی کہ میرے تمام

مقدمات دن کے پچھلے حصے مین پیش ہوا کرین، چنانچہ ۱۸ ماہ تک اسی پر عمل درآمد ہوتا رہا[1]

لیکن ڈاکٹر صاحب جیسے فلسفی اور شاعر کے لیے بیرسٹری کا پیشہ کچھ موزون نہ تھا، اس لیے ان کے احباب اور بہی خواہ ان کے لیے اس کو پسند نہین کرتے تھے، کیونکہ ان کی بیرسٹری انکی شاعری مین، اور ان کی شاعری ان کی بیرسٹری مین مخل تھی، اسی بنا پر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے ایک بار ان سے کہا کہ

"آپ نے یہ دو متضاد شغل کیون اختیار کر رکھے ہین؛ فرمانے لگے اس تضاد سے بہت فائدہ پہنچتا ہے، وکالت دنیاداری کا نچوڑ ہے، تمام جہان کی کشاکشون اور خباثتون سے انسان اس پیشے مین آشنا ہوجاتا ہے، اور طبیعت مین اس کے خلاف ایک ایسا ردعمل پیدا ہوتا ہے کہ بڑے زور سے انسان کی روح لطیف چیزون کے حصول کے لیے بال و پر پھیلاتی ہے، اس پر انھون نے یورپ کے بعض ایسے لوگون کا ذکر کیا، جو شاعر بھی ہین اور بیرسٹر بھی،"[2]

اس زمانے مین انڈین ایجوکیشنل سروس مین غالباً پنجاب مین کوئی ہندوستانی نہین تھا، اور یہ سروس زیادہ تر انگریزون کے لیے مخصوص تھی، گورنمنٹ نے، جیسا کہ ڈاکٹر صاحب کے خط سے معلوم ہوتا ہے، ان کے سامنے یہ خدمت پیش کی، اور انھون نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا تو ان کے دوستون کو بڑا افسوس ہوا، کہ ایسا نادر موقع ہاتھ سے جانے دیا، جسٹس شاہ دین مرحوم، جو اس زمانہ مین ہائیکورٹ کے جج تھے، اس بارے مین ڈاکٹر صاحب سے بہت ناراض تھے، اور ان سے ہمیشہ کہتے تھے "تم جیسے آدمی کا عدالت مین کوئی کام نہین، تمھین علمی زندگی کو بطور پیشے کے اختیار کرنا چاہیے، لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنی خودداری

---

[1] مکاتیب شاد و اقبال صفحہ ۵۸، [2] آثار اقبال صفحہ ۲۴، ۲۵،

کی وجہ سے بیرسٹری ہی کے آزاد پیشہ کو پسند کیا، اور جب ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم نے ان سے ایک بار دریافت کیا کہ "آیا یہ بہتر نہین تھا کہ آپ پروفیسر ہو جاتے؟" تو فرمانے لگے "مین نے کچھ دنون پروفیسری کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ہندوستانی کالجون کی پروفیسری مین علمی کام تو ہوتا نہین، البتہ ملازمت کی ذلتین ضرور سہنی پڑتی ہین، چنانچہ ایک مرتبہ طالب العلمون کی حاضری کے متعلق گورنمنٹ کالج کے پرنسپل سے کچھ جھگڑا ہو گیا، اور پرنسپل نے مجھ سے کچھ اس طرح گفتگو کی جیسے کوئی کلرک سے باتین کرتا ہے، اس دن سے ملازمت سے طبیعت کچھ ایسی کھٹی ہوئی کہ جی مین ٹھان لی ہے کہ جہان تک ہو سکے گا ملازمت سے گریز کرون گا۔[1]

اگرچہ ان کی ذہانت، محنت اور شہرت کی وجہ سے ان کو کچھ نہ کچھ کام ملتا رہتا تھا، تاہم ان کو اس پیشے مین کوئی نمایان کامیابی حاصل نہین ہوئی اور ان کی بیرسٹری کے بہترین زمانے مین بھی ان کی آمدنی کبھی ایک ہزار روپیہ سے متجاوز نہ ہو سکی[2]

اس زمانے مین ڈاکٹر صاحب کی ملازمت کے لیے ایک اور سلسلہ جنبانی ہوئی اور ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم کے بیان کے مطابق عثمانیہ یونیورسٹی ریاست حیدرآباد کے قیام کے وقت ریاست کے بعض عہدے دارون کو خیال ہوا کہ ان کو بطور پرنسپل کے یہان بلایا جائے، لیکن خود ڈاکٹر صاحب اس کے خواہشمند نہ تھے، اور فرماتے تھے کہ "تنخواہ کے لحاظ سے تو مجھے کوئی فائدہ نہ ہوگا، اور اگر تھوڑی سی رقم زائد مل بھی جائے تو اس کے لیے جلا وطن ہونا کوئی معقول فعل نہین"۔ لیکن خود ڈاکٹر صاحب کے ایک خط سے جس کو انھون نے ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو مہاراجہ سرکشن بہادر کے نام لکھا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر حیدری نے ان کے سامنے قانون کی پروفیسری پیش کی تھی اور یہ دریافت کیا تھا کہ اگر ساتھ ساتھ پرائیوٹ پریکٹس کی بھی اجازت ہو تو وہ کس تنخواہ پر اس کو قبول

[1] آثار اقبال ص ۲۲-۲۳، [2] ایضاً ص ۲۵،

کرین گے، لیکن ڈاکٹر صاحب ریاست حیدرآباد مین ہائیکورٹ کی ججی کے خواہان تھے، چنانچہ اسی خط مین لکھتے ہین :-

"مجھے یہ معلوم نہین کہ میر مجلسی عدالت العالیہ کی جگہ خالی ہے، نہ اس کے متعلق انھون نے (مسٹر حیدری نے) اپنے خط مین کوئی اشارہ کیا ہے، لیکن اگر ایسا ہوجائے تو مین اسے قانون کی پروفیسری اور پرائیوٹ پریکٹس پر ترجیح دون گا، آپ سے حیدری صاحب ملین تو برسبیل تذکرہ ان کی توجہ اس طرف دلائین .... اگر سرکار سے مناسب تصور فرمائیں تو اب یہ وقت کہ انھون نے خود ملازمت کے لیے مجھے لکھا ہے، اس قسم کے تذکرہ کے لیے نہایت موزون معلوم ہوتا ہے"[1]

ان کے ایک اور خط سے بھی جو مہاراجہ کے نام ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس عہدہ کے لیے ان کا نام بھی پیش کیا گیا تھا، چنانچہ لکھتے ہین :-

مخبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حیدرآباد ہائیکورٹ کی ججی کے لئے چند نام حضور نظام خلد اللہ ملکہ کے سامنے پیش کیے گئے ہین، جن مین ایک نام خاکسار کا بھی ہے، اس خیال سے کہ میرا نام اور ناموں کے ساتھ پیش ہوا ہے اور یہ ایک قسم کا مقابلہ ہے، چند امور آپ کے گوش گذار کرنا ضروری ہے، جن کا علم ممکن ہے سرکار کو نہ ہو، اور ممکن ہے حضور نظام ان امور سے متعلق سرکار سے استفسار فرمائیں،

اس کے بعد اپنے تمام علمی اعزازات و امتیازات کی تفصیل کی ہے۔

سرکا خطاب

شاعری مین ڈاکٹر صاحب کی شہرت پہلے ہی سے تھی، اور اب یہ شہرت اور بھی زیادہ ہوگئی تھی، البتہ اس کا دائرہ صرف ہندوستان تک محدود تھا، لیکن یورپ سے واپس آنے

[1] مکاتیب شاد و اقبال ص ۶۱-۶۲ [2] ایضاً ص ۴۴، ۴۵، ۴۶

کے بعد انھون نے اپنی شاعری کا رخ بالکل بدل دیا، پہلے وہ اپنے وطن کی زبان اردو مین عام قومی اور وطنی نظمین لکھا کرتے تھے لیکن اب انھون نے اردو کے بجاے فارسی زبان اختیار کر لی، اور اس سلسلے مین سب سے پہلے ایک فلسفیانہ مثنوی اسرار خودی لکھی، جو ۱۹۱۵ء مین شائع ہوئی، اور اس مثنوی کے لکھنے کے بعد انھون نے ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی لیکن ہندوستان اور یورپ پر اس مثنوی کا اثر مختلف پڑا، اس مثنوی مین ڈاکٹر صاحب نے خودی کی تربیت اور تکمیل کے اصول بتائے تھے، اور جو فلسفہ یا جو تعلیم خودی کو ضعیف کرنے والی تھی، اس کی تردید کی تھی، اور اس سلسلہ مین خواجہ حافظ پر سخت لہجہ مین رد و قدح کی تھی،

ہوشیار از حافظ صہبا گسار　　جامش از زہر اجل سرمایہ دار

نیست غیر از بادہ در بازار او　　از دو جام آشفتہ شد دستار او

مسلم و ایمان او زنار دار　　رخنہ اندر دینش از مژگان یار

گوسفند است و نوا آموخت است　　عشوہ و ناز و ادا آموخت است

دلربائیہاے او زہر است و بس　　چشم او غارتگر شہر است و بس

ضعف را نام توانائی دہد　　سازِ او اقوام را اغوا کند

از نہ یونان زمین زیرک تر است　　پردۂ عودش حجاب اکبر است

بگذر از جامش کہ در مینا ے خویش　　چون مریدانِ حسن دارد حشیش

لیکن خواجہ حافظ جادو بیان شاعر ہونے کے ساتھ چونکہ بعض "خوش عقیدہ" گروہون مین ایک مقدس صوفی بھی تسلیم کیے جاتے ہین اس لیے ان حلقون مین سخت شورش برپا ہوئی، اور ایک صاحب متخلص بہ فضلی پنشنیر ڈپٹی کلکٹر محکمہ انہار پنجاب نے اسرار خودی کے جواب مین پوری ایک مثنوی راز بیخودی کے نام سے تصنیف کر ڈالی، جس مین ڈاکٹر صاحب کو "شغال"

"دشمنِ اسلام" اور "رہزنِ اسلام" کا خطاب دیا،

لیکن ہندوستان کے برعکس انگلستان مین اس مثنوی نے نہایت حسن قبول حاصل کیا، اور ۱۹۱۹ء مین پروفیسر نکلسن نے جو اس سے پہلے دیوان شمس تبریز اور کشف المحجوب کا انگریزی ترجمہ کر چکے تھے، ڈاکٹر صاحب سے اس مثنوی کے ترجمہ کرنے کی اجازت چاہی، اور اجازت کے بعد ۱۹۱۹ء مین جب یہ ترجمہ شائع ہوا تو غالباً پہلی بار مغربی دنیا ڈاکٹر صاحب کے خیالات سے واقف ہوئی اور بہت سے انگریز اہل علم نے ان کی طرف توجہ کی، چنانچہ مشہور نقاد ادب مسٹر ای ایم فارسٹر نے انگلستان کے نامور ادبی رسالہ اتھینیم مین اس پر ایک مفصل تبصرہ کیا، اسی طرح کیمبرج کے پروفیسر ڈکنسن نے رسالہ نیشن ویکلی مین اس مثنوی پر تبصرہ لکھا،

اسی ترجمہ اور اسی ترجمہ کے تبصرون سے ڈاکٹر صاحب کو یورپ مین جو شہرت حاصل ہوئی، انگریزی گورنمنٹ پر بھی اس کا اثر پڑا، اور اس نے جنوری ۱۹۲۳ء مین ان کو سر کا خطاب مرحمت فرمایا، چنانچہ خود ڈاکٹر صاحب ایک خط مین جس کو انھون نے ۲۴ جنوری ۱۹۲۳ء مین مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر کے نام لکھا ہے، لکھتے ہین :-

> سرکار نے میرے خطاب کے متعلق جو کچھ سنا ہے، صحیح ہے، یہ اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ ہونے اور اس پر یورپ اور امریکہ مین متعدد ریویو چھپنے کا نتیجہ ہے۔[۱]

ڈاکٹر صاحب کی اس عزت افزائی پر لاہور کے سکھون، مسلمانون اور ہندوون کی طرف سے ان کو ایک عظیم الشان پارٹی مقبرۂ جہانگیر مین دی گئی جس مین نہ صرف لاہور کے معززین بلکہ پنجاب کے مختلف شہرون کے اکابر اور اہل علم، اکثر انگریز حکام بلکہ خود گورنر پنجاب شریک ہوئے، اس پارٹی مین ڈاکٹر صاحب نے انگریزی زبان مین ایک دلچسپ تقریر کی اور اسی تقریر

[۱] مکاتیب شاد و اقبال ص ۹

سے پہلی مرتبہ لوگون کے کان ان کی مشہور تصنیف پیام مشرق سے آشنا ہوئے، جس کو وہ جرمن شاعر گوئٹے کے جواب مین لکھ رہے تھے۔[۱۵]

لیکن اس سے پہلے تحریک ترک موالات کا زمانہ گذر چکا تھا جس مین بہت سے آزادی پسند اکابر و اعیان گورنمنٹ کے عطاکردہ خطاب کو واپس کر چکے تھے، اس لیے کچھ لوگون نے ایک حریت پسند گوشہ نشین شاعر اور فلسفی کے لیے اس خطاب کو پسند نہین کیا، اور بعض اخبارون کے اڈیٹرون اور شاعرون نے اس پر چوٹین کین، چنانچہ ایک نظم کے تین طنزیہ شعر جو عامیانہ طرز مین ہین، منشی محمد الدین فوق نے نقل کیے ہین:

لو مدرسۂ علم ہوا قصر حکومت   افسوس کہ علامہ سے سر ہوگئے اقبال
پہلے تو سر ملت بیضا کے تھے وہ تاج   اب اور سنو تاج کے سر ہوگئے اقبال
کہتا تھا یہ کل ٹھنڈی سڑک پر کوئی گستاخ   سرکار کی دہلیز پہ سر ہوگئے اقبال

ایک اور شخص نے یہ قطعہ لکھکر اخبار رہبر دکن مین چھپوایا،

کے مرد حق اسیر کمند ہوا شود   گر سر زتن جدا و تن از سر جدا شود
تاریخ نو خطاب سرافراز آمدہ   اقبال را چو قلب کنی لابقا شود

اس کی اطلاع مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر نے ان کو ان الفاظ مین دی:

آپ کے خطاب کے متعلق ایک بدمعاش نے دل کے پھپھولے توڑے۔ ذیل کا قطعہ لکھکر مقامی اخبار رہبر دکن مین چھپوایا .... آپکے دلی محب کو بہت برا معلوم ہوا، فوراً ایک قطعہ لکھکر اسی روز اسی اخبار مین بھجدیا،

اقبال ہر کسے کہ ترقی فزا شود   ادبار حاسدش بجہان لابقا شود
چون بر وجود حاسد و نفی آمدہ   تیغ نفاز بہر بقا حرف لا شود[۱۶]

لیکن بدمعاشوں اور حاسدوں کے علاوہ خود ڈاکٹر صاحب کے مخلص دوستوں کے دلوں میں بھی یہ خطرہ پیدا ہوا کہ اب ان کی آزادی اور حقگوئی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ چنانچہ مولوی غلام بھیک نیرنگ نے اس خطرے کا اظہار کیا تو ڈاکٹر صاحب نے ان کے جواب میں نہایت شد و مد کیساتھ اس خطرے کا ازالہ کیا، اور ان کو لکھا کہ

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ جس کے لیے سراپا سپاس ہوں،

میں آپ کو اس اعزاز کی خود اطلاع دیتا، مگر جس دنیا کے میں اور آپ رہنے والے ہیں اس دنیا میں اس قسم کے واقعات احساس سے فروتر ہیں، سیکڑوں خطوط اور تار آئے اور آرہے ہیں، اور مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ لوگ ان کو کیوں گراں قدر جانتے ہیں، باقی رہا وہ خطرہ جس کا آپکے قلب کو احساس ہوا ہے، سو قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضہ میں میری جان اور آبرو ہے، اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جسکی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں، دنیا کی کوئی قوت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی، انشاء اللہ اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں لیکن اس کا دل مومن ہے۔[1]

اور آیندہ واقعات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعرانہ آزادی اور حق گوئی پر اس خطاب کا کوئی اثر نہیں پڑا بلکہ ان کا لہجہ روز بروز تیز و تند ہوتا گیا،

کونسل کی ممبری | اپنے علم و فضل اور شاعرانہ قابلیت اور شہرت کی بدولت ڈاکٹر صاحب سر تو ہو گئے، لیکن اب تک قوم کی لیڈری کا اعزاز ان کو حاصل نہیں ہوا تھا، اس کے لیے ان کے احباب نے ان کو پبلک لائف میں گھسیٹنا اور سیاسیات کے میدان میں لانا چاہا، لیکن ڈاکٹر صاحب نے ایک مدت تک اپنے آپ کو اس کشمکش سے الگ رکھا، اور اعزاز و شہرت کے لیے

[1] اقبال نامہ ص ۳۰۰-۳۰۲

صرف شاعری ہی کو کافی سمجھا، چنانچہ ایک خط کے جواب مین یہ معذرت نامہ لکھا:-

ہوس بھی ہو تو نہین مجھ مین ہمت تگ و تاز ۔۔۔ حصول جاہ ہے وابستۂ مذاق تلاش

ہزار شکر طبیعت ہے ریزہ کار مری ۔۔۔ ہزار شکر نہین ہے دماغ فتنہ تراش

مرے سخن سے دلون کی ہین کھیتیان سرسبز ۔۔۔ جہان مین ہون مین مثال سحاب دریاپاش

یہ عقدہ ہاے سیاست تجھے مبارک ہون ۔۔۔ کہ فیض عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

ہواے بزم سلاطین دلیل مردہ دلی ۔۔۔ کیا ہے حافظ رنگین نوا نے راز یہ فاش

گرت ہواست کہ با خضر ہمنشین باشی ۔۔۔ نہان ز چشم سکندر چون آب حیوان باش

سب سے بڑھکر یہ کہ بڑے بڑے سیاسی دنگل کونسلون ہی مین ہوا کرتے تھے، اور ڈاکٹر صاحب کونسلون کو سرمایہ دارون کا اکھاڑا کہا کرتے تھے۔ ایک جگہ تو انھون نے کونسل ہال کو سرمایہ دارون کا تکیہ قرار دیا ہے،

سنا ہے مین نے کل یہ گفتگو تھی کارخانے مین ۔۔۔ پرانے جھونپڑون مین ہے ٹھکانا دستکارون کا

مگر سرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا ۔۔۔ کوئی اس شہر مین تکیہ نہ تھا سرمایہ دارون کا

ان اسباب سے وہ ایک مدت تک سیاسیات سے بالکل الگ رہے، لیکن ۱۹۲۶ء مین اس اکھاڑے کی بنجکنی کرنے کے لیے[۱] وہ احباب کے اصرار سے لاہور کے حلقۂ انتخاب سے کونسل کی ممبری کے لیے بطور امیدوار کھڑے ہوئے، اور لاہور کے ہر محلے اور کوچے مین ان کی حمایت مین جلسے کیے گئے، ان کے بعض دوستون نے چوک وزیر خان مین ایک جلسہ منعقد کیا اور ان کے اصرار سے خود ڈاکٹر صاحب بھی اس جلسے مین شریک ہوئے، اور ایک مختصر سی تقریر مین قانون ساز مجالس کی اہمیت ظاہر کی،[۲] کونسلون کے انتخابات کے موقع پر لوگون

---

[۱] آثار اقبال ص ۲۰، [۲] ایضاً ص ۳۴

کو ہزاروں روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں، اور ووٹروں کی خوشامدیں الگ کرنی پڑتی ہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب کو ان میں کچھ کرنا نہیں پڑا، بلکہ دو جلیل القدر امیدواروں نے ان کے مقابلے میں اپنے نام واپس لے لیئے، اور شہر کی تمام مسلمان برادریوں نے ان کی حمایت میں علیحدہ علیحدہ اشتہارات شائع کیے[1] جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے تین ہزار ووٹوں کی مجارٹی سے اپنے حریف کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی،[2]

کونسل کی ممبری کے زمانہ میں ڈاکٹر صاحب نے جو ملکی اور قومی خدمات انجام دیں انکی تفصیل حسب ذیل ہے:-

(۱) ملک خاص کر پنجاب میں ایک ایسا دریدہ دہن طبقہ پیدا ہوگیا تھا جو مذہبی پیشواؤں اور بزرگوں کی ذات پر نہایت کمینے حملے کیا کرتا تھا، اس طبقہ کی بدولت ایک نہایت فحش اور گندہ لٹریچر پیدا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے قتل اور خونریزی کی نوبت آگئی اور عدالتوں میں متعدد مقدمات دائر ہوئے، اس بنا پر ڈاکٹر صاحب نے کونسل میں یہ تحریک پیش کی کہ گورنر جنرل باجلاس کونسل سے سفارش کی جائے کہ بانیان مذاہب پر توہین آمیز، شر انگیز اور کمینہ حملوں کی اشاعت کا سد باب کرنے کے لیے ایک ریگولیشن نافذ کیا جائے، چنانچہ ۱۹۲۷ء میں یہ قانون پاس ہو کر نافذ کیا گیا،

(۲) تلوار کو قانون اسلحہ سے مستثنیٰ کرانے اور انسداد شراب نوشی کی تجویز بھی ڈاکٹر صاحب نے پیش کی،

(۳) گورنمنٹ نے نیلی بار ضلع منٹگمری میں سوا تین لاکھ ایکڑ رقبہ فروخت کیا تھا جس کا زیادہ تر حصہ سرمایہ داروں نے خریدا تھا، اس کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے یہ تحریک کی کہ اس کا نصف حصہ مزارعین یعنی کسانوں کے لیے جو اپنے ہاتھ سے کھیتی باڑی کرتے ہیں، مخصوص کیا جائے،

[1] نیرنگ خیال اقبال نمبر بابت ستمبر و اکتوبر ۳۲ء ص ۵۹، [2] مکاتیب شاد و اقبال ص ۱۷۳

(۴) شہروں میں جب کوئی وبا پھیلتی ہے تو اس کے روکنے کے لیے ہر قسم کے سرکاری اور غیر سرکاری انتظامات شروع ہو جاتے ہیں، اور مریضوں کو ہر قسم کی طبی امداد مل سکتی ہے، لیکن دیہاتوں میں اس کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب نے دیہاتوں کے فائدہ کے لیے یہ تحریک پیش کی کہ سرکاری اور غیر سرکاری ارکان کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے، جو دیہات میں حفظان صحت کے طریقوں کی رپورٹ پر غور کرے۔

(۵) سب سے اہم مسئلہ جس پر ڈاکٹر صاحب نے کونسل میں نہایت پرزور بحث کی، یہ تھا کہ زمینیں گورنمنٹ کی ملکیت ہوتی ہیں یا خود قومیں ان کی مالک ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس نظریہ کی پرزور مخالفت کی کہ ساری زمین حکومت کی ملکیت ہے، اور فرمایا کہ اس ملکیت عامہ کا دعویٰ نہ عہد قدیم میں کسی نے کیا اور نہ سلاطین مغلیہ کے زمانے میں ایسا مطالبہ پیش کیا گیا، اور اگر کسی وقت کسی ملک کے اندر یہ نظریہ رائج بھی تھا، تو اس بیسویں صدی میں اسے جائز نہیں مانا جا سکتا۔ اس نظریہ پر سب سے پہلے جس یورپین مصنف نے تبصرہ کیا وہ بیرن تھا۔ ۱۸۰۰ء میں اس نے پوری تحقیق و تفتیش کے بعد اس نظریہ کو بالکل مسترد کر دیا۔ ۱۸۳۰ء میں برگیز نے ہندوستان کے اندر ملکیت کے قانون و رواج کی پوری تحقیقات کی۔ یہ مصنف اپنی کتاب میں منوجی کے قوانین، اسلامی شریعت اور ہندوستان کے مختلف حصص بنگال، مالوہ، پنجاب وغیرہ کے متعلق رواجی پابندیوں کا تفصیل سے ذکر کرتا ہے، اور اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ تاریخ ہند کے کسی دور میں بھی سلطنت زمین کی ملکیت کی مدعی نہیں ہوئی۔

اس نظریہ کی مخالفت کرنے سے ڈاکٹر صاحب کا مقصد یہ تھا کہ زمین کا لگان معاف یا کم از کم کم کر دیا جائے، اور اس کے لیے بالکل انکم ٹکس کے اصول پر عمل کیا جائے، کیونکہ انکم ٹکس کے معاملے میں صلاحیت و استطاعت کے اصول یا مدارج کے اصول پر عمل کیا جاتا ہے، یعنی

ایک تدریجی پیمانہ قائم ہے، بعض لوگوں سے قطعاً کوئی انکم ٹیکس نہیں لیا جاتا، اسی اصول کے مطابق جس شخص کے پاس پانچ بگھہ سے زیادہ زمین نہیں، بشرطیکہ زمین ایسے رقبہ مین نہ ہو، جہان آبپاشی نہین کی جا سکتی اور اس کی پیداوار کی تعداد بھی معین ہو اس کا لگان معاف کر دینا چاہیے،

اس سلسلے مین سیاسی خدمات کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کو مسلمانون کی تعلیمی خدمت کے بعض موقع بھی ملے، چنانچہ ۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۷ء مین جب مسٹر منوہر لال پنجاب کے وزیر تعلیم تھے، مسلمانون مین اپنی حق تلفی کا بہت چرچا ہوا، اور اس غرض سے سر جارج انڈرسن کی خدمت مین جو اس وقت پنجاب مین ڈائرکٹر محکمۂ تعلیمات تھے، مسلمان ممبران کونسل کا ایک مختصر سا وفد گیا، جس مین ڈاکٹر صاحب بھی بحیثیت ممبر کونسل کے شریک ہوئے، رسمی باتون کے بعد ڈائرکٹر صاحب نے وعدہ فرمایا کہ مین اس معاملے پر غور کرون گا، اور جہان جہان حق تلفی یا بے قاعدگی ہوئی ہے، اس کی تلافی کی پوری کوشش کرون گا[1]

مدراس مین اسلام پر لکچر | چند سال سے مدراس مین ایک امریکن عیسائی کی فیاضی سے مدراس یونیورسٹی کے طلبہ کے سامنے کوئی نہ کوئی ممتاز عیسائی فاضل حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات و سوانح اور عیسائی مذہب کے متعلق چند عالمانہ لکچر دیتا تھا، اس کو دیکھکر مدراس کے چند مخلص مسلمانون کے دلون مین بھی جوش پیدا ہوا، اور انھون نے یہ کوشش کی کہ مدراس مین انگریزی مدارس کے مسلمان طلبہ کے لیے بھی اس قسم کا انتظام کیا جائے، اور سال بسال کسی مسلمان فاضل سے طلبہ انگریزی کے ذوق اور موجودہ رنگ کے مطابق اسلام اور پیغمبر اسلام پر لکچر دلوائے جائین، چنانچہ اس غرض کے لیے "مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سدرن انڈیا" کے نام سے ایک تعلیمی انجمن قائم ہوئی، اور سیٹھ ایم۔ جمال محمد صاحب نے اس کے مالی مصارف کی ذمہ داری اپنے سر لی اور

[1] آثار اقبال ص ۶۹

لکچر دینے کے لیے سب سے پہلے مولانا سید سلیمان ندوی کا انتخاب ہوا، جنھون نے اکتوبر و نومبر ۱۹۲۵ء

مین سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤن پر مدراس کے انگریزی مدرسون کے طالب العلمون اور عام

مسلمانون کے سامنے لالی ہال مدراس مین آٹھ لکچر دیے، جو خطبات مدراس کے نام سے شائع ہوچکے

ہین، اس کے بعد اس مقصد کے لیے ڈاکٹر صاحب کا انتخاب ہوا، اور انھون نے ۱۹۲۸ء مین انگریزی

زبان مین اسلام پر ۶ فلسفیانہ لکچر دیے جو ریکنسٹرکشن آف ریلجس تھاٹ ان اسلام کے نام سے ۱۹۳۰ء

مین شائع ہوئے،

مدراس کے دوران قیام مین اہل مدراس نے مختلف طریقون سے ڈاکٹر صاحب کی

پذیرائی کی، چنانچہ مختلف اکابر اور انجمنون نے ایڈرس اور دعوتین دین، اخبارات نے انکے فوٹو

شائع کیے، اخبارات کے نمایندون اور مذہب و فلسفہ کے بڑے بڑے عالمون نے ان

سے مذہب، فلسفہ اور سیاست پر گفتگو کی، مدراس کی انجمن ترقی اردو کے علاوہ ہندی

پرچار سبھا اور جنوبی ہند کے برہمن عالمون نے بھی ان کی خدمت مین سپاسنامے پیش کیے،

مدراس سے واپسی مین جنوری ۱۹۲۹ء کو جب وہ بنگلور کے اسٹیشن پر پہنچے تو شمالی ہند

کے ہزارون آدمی ان کی زیارت کے لیے اسٹیشن پر موجود تھے، یہان ان کو ایڈریس دینے

کے لیے مسلم لائبریری کی طرف سے ایک جلسہ ہوا، جس کے صدر امین الملک دیوان مرزا اسمٰعیل

چیف منسٹر میسور تھے، ان کے خیالات سے مستفید ہونے کے لیے طالب العلمون اور تعلیم یافتہ

لوگون نے ایک الگ جلسہ کا انتظام کیا، جس کے صدر ڈاکٹر سبرائن ڈائرکٹر محکمۂ تعلیمات

میسور تھے، بنگلور مین مہاراجہ میسور نے ان کی خدمت مین دعوت نامہ روانہ کیا، اور وہ

۱۰ جنوری ۱۹۲۹ء کو میسور پہنچکر سرکاری مہمان خانہ مین فروکش ہوے اور خاص شہر میسور مین میسور یونیورسٹی

نے ان کے لکچر کا انتظام کیا، دوسرے دن ٹاؤن ہال مین مسلمانان میسور نے اپنا ایڈریس پیش کیا،

میسور، بنگلور، سرنگاپٹم اور مدراس کے دوسرے مقامات کے دیکھنے کے بعد وہ ۱۴ر جنوری ۱۹۲۹ء کو حیدر آباد پہنچے، جہاں اسٹیشن پر مسلمان بچے ایک قطار مین کھڑے ہوکر "چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا" کا ترانہ خوش الحانی کے ساتھ گارہے تھے، اسٹیشن پر عوام کے علاوہ عثمانیہ یونیورسٹی کے تمام ارکان موجود تھے، یہین ان کو اطلاع دی گئی کہ وہ نظام گورنمنٹ کے مہمان ہین، چنانچہ وہ اسٹیشن سے روانہ ہوکر ریاست کے سرکاری مہمان خانہ مین فروکش ہوئے[1]، اور یہان پہونچکر انھون نے ٹاؤن ہال مین دو تقریرین کین، اور مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر نے ان کے اعزاز مین ایک بزم سخن منعقد کی[2]، ۱۸ر جنوری ۱۹۲۹ء کو اعلیٰ حضرت حضور نظام کا شرف باریابی حاصل ہوا، ڈاکٹر صاحب کو قیمتی پتھرون، بالخصوص ہیرون سے بہت دلچسپی تھی، اور چونکہ ان کو حکیم اجمل خان مرحوم سے یہ معلوم ہوا تھا کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام کے پاس ایک بیش بہا ہیرا ہے جو نہایت چمکیلا ہے، اس لیے اعلیٰ حضرت کا شرف باریابی حاصل ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے اس ہیرے کے دیکھنے کی خواہش کی، اور اعلیٰ حضرت نے فوراً اس ہیرے کو منگوایا اور ڈاکٹر صاحب اس کو دیکھکر نہایت متاثر ہوئے، اور ایک موقع پر اس کی چمک دمک، وزن اور حسن و جمال کا تذکرہ نہایت جوش و خروش کے ساتھ کیا ہے[3]

مسلم لیگ کی صدارت ڈاکٹر صاحب ۱۹۲۶ء مین سیاسیات کے میدان مین آئے، لیکن تین چار سال کے اندر ہی انھون نے اپنی محنت، قابلیت اور شہرت کی وجہ سے اس قدر سیاسی وقار حاصل کر لیا کہ دسمبر ۱۹۳۰ء مین مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد کے صدر منتخب ہوئے، اور اپنے خطبۂ صدارت مین پاکستان کا نظریہ پیش کیا، جس پر قومی اور سیاسی حیثیت سے بہت

[1] نیرنگ خیال اقبال نمبر بابت ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۲ء صفحہ ۳۸-۳۹ [2] اوراق پریشان اقبال نمبر
[3] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۹۳۶

سے اعتراضات ہوئے، اور اس وقت یہ نظریہ محض شاعرانہ تخیل خیال کیا گیا، لیکن بہت سے مراحل طے کرنے کے بعد یہ مسلمانون کا متفقہ نظریہ قرار پایا، اور ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور مین مسلم لیگ کا جو اجلاس بصدارت مسٹر جناح ہوا، اس مین سر شاہ نواز خان، نواب ممدوٹ صدر مجلس استقبالیہ اور مسٹر جناح صدر لیگ کی پر زور اور مدلل تقریرون کے بعد دوسرے دن کے اجلاس مین مولوی فضل الحق وزیر اعظم بنگال نے اس نظریہ کو ایک مستقل رزولیوشن کی صورت مین پیش کیا، جس پر تقریباً تمام صوبون کے نمایندون نے تقریرین کین، اور وہ باتفاق پاس کیا گیا، اس کے بعد مسٹر جناح نے ہدایت کی کہ ۱۹ اپریل ۱۹۴۰ء کو ہر جگہ مسلمانان ہند اس ریزولیوشن کی تائید کرین، چنانچہ ۱۹ اپریل کو ہندوستان کے طول وعرض مین تمام مسلمانون نے اس ریزولیوشن کی پر زور طریقہ سے تائید کی، اور اس طرح ڈاکٹر صاحب نے جو خواب ۱۹۳۰ء مین دیکھا تھا، اس کی تعبیر دس برس کے بعد نکلی، اور اس کے بعد مسلمانون مین جو سیاسی جوش پیدا ہوا وہ اسی دلفریب خواب کا نتیجہ تھا، لیکن اب یہ خواب واقعہ بن چکا ہے اور پاکستان قائم ہو گیا ہے جو مسلمانون کا منتہائے آمال ہے،

دوسری گول میز کانفرنس کی شرکت مسلم لیگ کی صدارت کے چند ہی روز بعد ڈاکٹر صاحب کو دوسرا سیاسی اعزاز یہ حاصل ہوا کہ ۱۹۳۱ء مین دوسری گول میز کانفرنس کی شرکت کے لیے ممبر منتخب کیے گئے، پہلی گول میز کانفرنس مین جس کا افتتاح ملک معظم نے ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو کیا گورنمنٹ نے سولہ مسلمان ممبرون کا انتخاب خود کیا تھا، اس کے بعد دوسری گول میز کانفرنس مین برطانوی نمایندون کی تعداد مین اضافہ کیا گیا، اور مسلمانون مین سر علی امام، مولانا شوکت علی، مولانا شفیع داؤدی اور ڈاکٹر صاحب اور بعض دیگر اصحاب کو بھی منتخب کیا گیا،

یہ کانفرنس ۷ ستمبر ۱۹۳۱ء سے شروع ہو کر یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو ختم ہوئی،[۱] اور اس مین

---

[۱] ملخص از سیاسیات ملیہ مولوی محمد امین زبیری باب ہفتم

نہایت اہم سیاسی مسائل پیش ہوئے، اگرچہ ہم کو معلوم نہین ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ان سیاسی گتھیون کے سلجھانے مین کیا حصہ لیا، تاہم بعض دوسری علمی اور تاریخی حیثیتون سے ڈاکٹر صاحب کا یہ سفر یورپ نہایت اہمیت رکھتا ہے، مثلاً

اس کانفرنس کی شرکت کے سلسلے مین ڈاکٹر صاحب کو بہت سے اکابر فضلاء سے تبادلۂ خیالات و ملاقات کا موقع ملا، چنانچہ اس کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد واپسی مین ڈاکٹر صاحب فرانس کے مشہور فلسفی پروفیسر برگسان سے ملے جس کے نظریۂ "ذاتیت زمان" کو وہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے بہت زیادہ قریب سمجھتے تھے، دوران ملاقات مین اس نظریہ پر بحث ہوئی اور ڈاکٹر صاحب نے برگسان کو یہ حدیث سنائی کہ "زمانہ کو برا مت کہو کہ زمانہ خود خدا ہے"، اس حدیث کو سنکر برگسان کرسی سے اچھل کر آگے بڑھا اور ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کیا یہ سچ ہے؟

اس سے زیادہ اہم موسولینی کی ملاقات ہے جو روما مین ہوئی، اور ڈاکٹر صاحب موسولینی کے حسن اخلاق، اس کی ظاہری شان و شوکت، کشادہ سینہ اور مضبوط جسم کو دیکھکر بہت متاثر ہوئے، موسولینی بھی مثنوی اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ پڑھ چکا تھا، اور وہ ڈاکٹر صاحب کے خیالات سے بہت متاثر تھا، چنانچہ اس نے ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی کہ وہ اس کو اٹلی کے نوجوانون کے لیے کچھ نصیحت کرین۔ ڈاکٹر صاحب اگرچہ مادی قوت کے نہایت معترف و مداح ہین، لیکن اسی کے ساتھ ان کے نزدیک مادی قوت مین روحانی قوت کی آمیزش بھی ضروری ہے، اور یہ دوسری قوت ان کو یورپ مین نظر نہین آئی، اس لیے جب موسولینی نے ان سے نوجوانان اٹلی کے لیے نصیحت کی درخواست کی تو انھون نے فرمایا کہ "اطالیہ ابھی ایک نوجوان قوم ہے، اور اگر وہ صحیح راہ اختیار کرنا چاہتی ہے تو اسے مغرب کی زوال آمدہ

تہذیب سے منہ موڑ کر مشرق کی روحانی و زندگی بخش تہذیب کی طرف توجہ کرنی چاہیے،[1]

اس ملاقات میں سب سے اہم گفتگو مذہب اور قومیت پر ہوئی، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اٹلی کی موجودہ حالت (اور اس کی حل طلب مشکل) بہت حد تک ایسی ہے جیسے کہ قبل از اسلام ایران کی تھی، ایران کی تہذیب فرسودہ تھی، اور قوم کے قویٰ شل ہو چکے تھے، ان کو تازہ خون کی ضرورت تھی، ایران کی خوش قسمتی سے اس کے جوار میں عرب کی جری اور بادیہ پیما قوم تھی، جس نے ایران کو اپنا تازہ اور خالص خون دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایران میں حیات کی ایک نئی لہر دوڑ گئی، اور یہ قوم ایک پرشکوہ تہذیب کی حامل اور علم بردار ہوئی، عربی خون کی بدولت ان میں بہترین اہل فن، اہل سیاست اور اہل سیف پیدا ہوئے، اسی طرح روما کے زوال کے بعد گاتھ اور جرمن قوموں نے اٹلی کو اپنا خون دیا، اور اسے قرون وسطیٰ میں نشاۃ الثانیہ نصیب ہوئی، اب پھر ایران اور اطالیہ دونوں کو تازہ خون کی ضرورت ہے، ایران اب بھی اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ اس کے شمال میں جری اور نیم مہذب ترکمان موجود ہیں، اور مغرب میں اندرون عرب کے جری قبائل، یہ قومیں اپنا خون دے کر ایران کو پھر زندہ اور قوی کر دیں گی، لیکن موجودہ اطالیہ کے گرد اسی کی جیسی مہذب قومیں آباد ہیں، جن میں صحرائی وحشت اور تازگی نام کو موجود نہیں، اطالیہ تازہ خون کہاں سے لائے گی، ڈاکٹر صاحب کے بیان کے مطابق موسولینی اس اچھوتے خیال سے بہت متاثر ہوا،[2] موسولینی کی شخصیت کے علاوہ ڈاکٹر صاحب پر روما کی قدیم عظمت کا بھی خاص اثر پڑا، چنانچہ فرماتے ہیں :-

سواد رومۃ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے ‏ ‏ ‏ ‏ وہی عزت، وہی عظمت، وہی شان دلآویزی

---

[1] رسالہ اردو اقبال نمبر ۱۹۳۸ء [2] آثار اقبال ص ۴۷، ۴۸

بالخصوص وہ زندگی کی اُس انقلابی روح سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، جس کو موسولینی نے اٹلی کے ہر برنا و پیر کے قالب میں پیدا کر دیا تھا، چنانچہ انھوں نے ایک مستقل نظم میں جس کا عنوان "موسولینی" ہے، اس تاثر کا خاص طور پر اظہار کیا ہے،

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب

ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب

رومۃ الکبریٰ! دگرگون ہو گیا تیرا ضمیر
اینکہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب

چشمِ پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ
نوجوان تیرے ہیں سوزِ آرزو سے سینہ تاب

یہ محبت کی حرارت! یہ تمنا! یہ نمود!
فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب

نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے
زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رباب

فیض یہ کس کی نظر کا ہے؟ کرامت کس کی ہے؟
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب

روما میں ڈاکٹر صاحب پر تو موسولینی کی شخصیت، روما کی قدیم عظمت اور اہل اٹلی کی انقلابی روح، غرض مختلف چیزوں نے اثر ڈالا تھا، لیکن ان سب کے مقابل میں ڈاکٹر صاحب کے پاس صرف ایک موثر چیز تھی یعنی ان کی تعلیم اور ان کا کلام، اور اس چیز نے موسولینی کی طرح اٹلی کی علمی جماعت کو بھی متاثر کیا، اور اٹلی کے سب سے بڑے علمی ادارہ روم کی اکاڈمی نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے یہاں تقریر کرنے کی دعوت دی، اور ان کے بعض کلام کا اٹالین زبان میں ترجمہ کروایا گیا۔[1]

ڈاکٹر صاحب کو قدیم عربی تہذیب سے نہایت دلچسپی بلکہ عشق تھا، اور اسپین قدیم زمانے میں عربی تہذیب کا مرکز تھا، اور اس زمانے میں اس کا مدفن ہے، اس لیے اس سلسلے میں

[1] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۱۶۹

انھون نے اسپین کا بھی سفر کیا، اور اس کی ہر چیز سے متاثر ہوئے، اسپین کی آب و ہوا کی خوبی و لطافت کے وہ خاص طور پر مداح تھے، اور فرماتے تھے کہ اس ملک مین دو تین مقامات ایسے ہین، اور ان کی فضا اسقدر پاک اور شستہ ہے کہ آج کا پکا ہوا سالن کئی مہینون تک نہ بگڑیگا،[1]

اسپین مین پہنچکر ڈاکٹر صاحب نے جب ہوٹل مین قیام کیا اس کے منیجر سے سب سے پہلے یہ دریافت کیا کہ کیا اس علاقہ مین قدیم مراکشی نسل کے لوگ آباد ہین؟ اس نے جواب دیا کہ بڑی تعداد مین، ڈاکٹر صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ مجھے ان مین سے کسی ایک سے ضرور ملایا جائے، منیجر مسکرا کر بولا "اس کے لیے ہوٹل سے باہر جانے کی ضرورت نہین، مین خود مراکشی اصل سے ہون"

حسن اتفاق سے ڈاکٹر صاحب کو پرانی عمارتون کے دکھانے کے لیے جو راہبر مقرر کیا گیا وہ بھی مراکشی نسل سے تھا، ڈاکٹر صاحب کو اس علاقہ مین عربی مراکشی اثر چہرون کی ساخت مین بہت زیادہ نمایان نظر آیا، چنانچہ مسجد قرطبہ پر جو نظم لکھی اس مین اس کی طرف اشارہ کیا ہے،

آج بھی اس دیس مین عام ہے چشم غزال	اور نگاہون کے تیر آج بھی ہین دلنشین
بوے یمن آج بھی اس کی ہواؤن مین ہے	رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤن مین ہے

ڈاکٹر صاحب نے خالص مذہبی اور تاریخی جذبات کے اثر سے اسپین کا سفر کیا تھا، اور اسی حیثیت سے انھون نے وہان کی ہر چیز پر نظر ڈالی، دورِ اسلام کی سب سے بڑی قدیم روحانی یادگار مسجد قرطبہ ہے، (جو تعمیری جمالیات کے لحاظ سے دنیا کی نادر ترین عمارات مین سے ہے) لیکن اسپین سے مسلمانون کے اخراج کے بعد جب یہ مسجد عیسائی راہبون کے قبضہ مین آئی تو انھون نے اُن آیات قرآنی پر جو سنہری حروف مین مسجد کی دیوارون اور محرابون پر لکھی ہوئی تھین، پلستر کرادیا،

---

[1] آثار اقبال ص ۸۰

لیکن ڈاکٹر صاحب نے جس زمانہ مین اسپین کا سفر کیا، اس وقت اسپین مین قومیت اور وطنیت کی ایک نئی لہر دوڑ رہی تھی اور ملک مین ایسے نوجوان اور فضلا نکل آئے تھے جو ہفت صد سالہ اسلامی حکومت اسپین کے کارنامون کو فخریہ بیان کرتے تھے۔ اور اس دور کو اندلس کا بہترین زمانہ کہکر یاد کرتے تھے، اسی تحریک کا نتیجہ تھا کہ مسجد قرطبہ کو کیتھولک چرچ کے مختلف فرقون سے چھین لیا گیا، حالانکہ کئی سو سال سے ان فرقون نے مسجد کے مختلف حصون مین اپنی عبادتگاہین بنالی تھین، لیکن چونکہ وطنیت کی اس تحریک کا مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا، اس لیے مسجد کو محکمۂ آثار قدیمہ کے حوالہ کردیا گیا، اور پانچ چھ سو سال کے بعد جب وہ پلستر محکمۂ آثار قدیمہ کے حکم سے اکھاڑا گیا تو وہی نقوش اپنی پرانی شان مین دنیا کے سامنے آگئے۔ اس مین ڈاکٹر صاحب کو حکمت الٰہی کی ایک دلپذیر مثال نظر آئی، کیونکہ اگر پلستر نہ ہوتا تو یہ نقوش غالباً اس وقت تک بالکل مٹ گئے ہوتے۔ ڈاکٹر صاحب نے مسجد اور اس کے نقوش کو دیکھکر جو لذت قرآن اور اسلام کے مفہوم کے متعلق محسوس کی وہ بیسیون تفسیرون کے مطالعہ سے بھی حاصل نہین ہو سکتی تھی،

لیکن اس مسجد کے سوا ڈاکٹر صاحب کو اسپین مین پرانی مسجدون کی تعداد بہت کم نظر آئی، اور ڈاکٹر صاحب کے خیال مین اس کی دو وجہین ہو سکتی تھین، ایک تو یہ کہ اسپین سے مسلمانون کے اخراج کے بعد تعصب کی وجہ سے عیسائیون نے ان تمام مساجد کو سخت بیدردی سے گرادیا ہوگا، یا یہ کہ خود مراکشی اندلسی مسلمانون کو بلاضرورت مساجد تعمیر کرنے کا وہ شوق نہ رہا ہوگا جو ہندوستانی مسلمانون کو ہے،

اسپین کے سفر مین ڈاکٹر صاحب کو پروفیسر آسین سے بھی ملاقات کا موقع ملا، جنھون نے اپنی ایک معرکۃ الآرا تصنیف مین یہ ثابت کیا تھا کہ اطالوی شاعر دانتے پر عربی بالخصوص ان حدیثون اور روایتون کا اثر جو معراج نبوی صلعم اور "عذاب دوزخ" سے متعلق ہین کسقدر غالب تھا،

وانتے کی شہرۂ آفاق تصنیف ڈیوینا کا موڈیا میں یہ اثر صفحہ صفحہ پر نمایاں ہے، ڈاکٹر صاحب سے پروفیسر آسین نے یہ خواہش کی کہ مسلمان طالب العلم بالخصوص ہندوستان کے طالب العلم اسپین میں آئیں اور ملک کی زبان سیکھ کر ان قیمتی اور بیشمار مخطوطوں کا مطالعہ کریں، جو اسپین کے بعض کتب خانوں مثلاً اسکوریال میں بند پڑے ہیں[1]

ڈاکٹر صاحب اسپین کے تمام قابل دید مقامات کی سیر کرنے کے بعد ۱۹۳۲ء میں واپس ہوئے اور واپسی میں موتمر اسلامیہ کی شرکت کے لیے بیت المقدس بھی تشریف لے گئے[2]،

سفر افغانستان | اعلیٰ حضرت نادر شاہ افغانستان بعض مذہبی اور تعلیمی امور کے متعلق ہندوستان کے علما، فضلا، اور ماہرین تعلیم کا مشورہ حاصل کرنا چاہتے تھے، اور اس غرض کے لیے انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر صاحب اور سر راس مسعود مرحوم کا انتخاب کیا، اور ڈاکٹر صاحب نے ۱۰ر ستمبر ۱۹۳۳ء کو اس کی اطلاع مولانا سید سلیمان ندوی کو دی اور ان کی رضامندی دریافت کی[3]، مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی رضامندی کا خط لکھا، تو ڈاکٹر صاحب نے اس کو قونصل جنرل افغانستان کی خدمت میں بھیج دیا[4]، اس کے بعد قونصل صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں باضابطہ دعوت نامہ بھیجا جس کو ڈاکٹر صاحب نے ۹ر اکتوبر ۱۹۳۳ء کے پہلے ہی مولانا سید سلیمان ندوی کی خدمت میں بھیجدیا[5]، جنرل قونصل صاحب کی اصل تحریک تو یہ تھی کہ یہ تینوں بزرگ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۳۳ء کے جشن استقلال کے موقع پر کابل پہنچ جائیں، مگر اس قدر جلد پاسپورٹ کا ملنا ممکن نہ تھا، اور جب تک پاسپورٹ نہ مل جائے روانگی کی تاریخ کا تعین نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ جب ۱۷ر اکتوبر ۱۹۳۳ء کو ڈاکٹر صاحب اور سر راس مسعود کو پاسپورٹ

---

[1] آثار اقبال ص ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۸۰، مع تغیر و اضافہ [2] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۱۰۵۶ [3] اقبال نامہ ص ۱۶۷ [4] اقبال نامہ ص ۱۶۸ [5] ایضاً ص ۱۷۲،

مل گیا تو ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو لاہور سے اور ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو پشاور سے روانگی کا پروگرام بن گیا اور ڈاکٹر صاحب اور سر راس مسعود اسی پروگرام کے مطابق پشاور سے روانہ ہوگئے، لیکن مولانا سید سلیمان ندوی کے پاسپورٹ ملنے مین دیر ہوئی اس لیے وہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو پشاور سے روانہ ہوئے، اوران دونون صاحبون کے بعد پہنچے، قیام کا انتظام کابل کے نئے شہر دارالامان کے شاہی مہمان خانہ مین کیا گیا تھا۔

اس سفر مین بہت سی شاندار دعوتین، پارٹیان اور معزز لوگون سے ملاقاتین ہوئین لیکن ان ملاقاتون مین سب سے اہم ملاقات اعلیٰ حضرت شاہ نادر افغانستان کی تھی جس کا ذکر ڈاکٹر صاحب نے اپنی مثنوی "مسافر" مین نہایت پراثر طریقہ پر کیا ہے،

قصر سلطانی کہ نامش دلکشاست ... زائران را گرد راہش کیمیاست
شاہ را دیدم دران کاخ بلند ... پیش سلطانے فقیر دردمند
خلق او اقلیم دلہا را کشود ... رسم و آئین ملوک آنجا نبود
من حضور آن شہ والا گہر ... بینوا مردے بدربار عمر
جانم از سوز کلامش در گداز ... دست او بوسیدم از راہ نیاز
پادشاہے خوش کلام و سادہ پوش ... سخت کوش و نرم خوے و گرم جوش
صدق و اخلاص از نگاہش آشکار ... دین و دولت از وجودش استوار
خاکی و از نوریان پاکیزہ تر ... از مقام فقر و شاہی باخبر
در نگاہش روزگار شرق و غرب ... حکمت او راز دار شرق و غرب
شہر یارے چون حکیمان نکتہ دان ... راز دار مد و جزر امتان
پردہ ہا از طلعت معنی کشود ... نکتہ ہاے ملک و دین را وانمود

گفت از آن آتش که داری در بدن	من ترا دانم عزیز خویشتن
ہر کہ او را از محبت رنگ و بوست	در نگاہم ہاشم و محمود اوست
در حضور آن مسلمانِ کریم	ہدیہ آوردم ز قرآن عظیم
گفتم این سرمایۂ اہل حق است	در ضمیر او حیات مطلق است
اندرو ہر ابتدا را انتہا است	حیدر از نیروے او خیبر کشا است
نشۂ حرفم بخونِ او دوید	دانہ دانہ اشک از چشمش چکید
گفت نادر در جہان بیچارہ بود	از غم دین و وطن آوارہ بود
کوہ و دشت از اضطرابم بیخبر	از غمان بے حسابم بیخبر
نالہ با بانگ ہزار آمیختم	اشک با جوے بہار آمیختم
غیر قرآن غمگسار من نبود	قوتش ہر باب را بر من کشود
گفتگوے خسرو والا نژاد	باز با من جذبۂ سرشار داد
وقت عصر آمد صداے الصلوٰۃ	آنکہ مومن را کند پاک از جہات
انتہاے عاشقان سوز و گداز	کردم اندر اقتداے او نماز

راز ہاے آن قیام و آن سجود
جز بہ بزم محرمان نتوان کشود

دعوتون مین سب سے اہم دعوت وہ تھی جو کابل کی انجمن ادبی نے تینون صاحبون کے اعزاز مین شب کو کی تھی، اور تمام مہمانون کے آنے کے بعد پہلے انجمن کے صدر نشین نے کھڑے ہو کر فارسی زبان مین خیر مقدم کا ایڈریس پڑھ کر سنایا، اس کے بعد افغانستان کے مشہور شاعر جناب قاری عبداللہ خان نے خیر مقدم کے عنوان سے ایک نظم پڑھی، جس مین ان تمام صاحبون

کے محامد و اوصاف بیان کیے، اور اس کی ابتدا ڈاکٹر صاحب کے محامد و اوصاف سے کی،

عزیزان ز ہندوستان آمدند ... در افغانستان میہمان آمدند
در آنان یکے دکتر اقبال ہند ... سخن پرور و واقفِ حال ہند
ادیب سخن گستر نکتہ سنج ... کہ ہر نکتہ اش بہتر آمد ز گنج
چمن گردۂ طرز رنگین اوست ... شکر پارۂ حرفِ شیرین اوست
کلامش چو اوج بلندی گرفت ... سخن رتبۂ ارجمندی گرفت
زند طعنہ آہنگ او برق را ... کہ خواہان بود نہضت شرق را
نوین شیوۂ را بہ سبک کہن ... در آمیخت از قدرتِ علم و فن
چو اندر سخن جادۂ نو گزید ... پیامش ز مشرق بہ مغرب رسید
سخن را در آمیخت چون با علوم ... ازو زندہ شد طرز مولائے روم
چو فکرش پئے فیلسوفی گرفت ... طراز سخن طرز صوفی گرفت
نوائیش ہم آہنگ با نفخ صور ... کہ افسردگان را در آرد بشور
چو بلبل بآہنگ کہسار ما ... ز ہند آمد این طوطی خوشنوا

اس نظم کے بعد مہمانون کی طرف سے پروفیسر ہادی حسن، سر راس مسعود، اور علامہ سید سلیمان ندوی نے تقریرین کین، سب کے آخر مین ڈاکٹر صاحب کھڑے ہوئے اور اپنے فلسفیانہ انداز مین ایک تقریر کی جو اس موقع پر بہت پر اثر ثابت ہوئی،

انجمن ادبی کابل کی دعوت کے بعد کابل سے واپسی کی تیاریان ہونے لگین اور چونکہ ڈاکٹر صاحب کو غزنین دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس لیے واپسی کے لیے پشاور کے بجائے غزنین و قندھار کا راستہ اختیار کیا گیا، اور ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو کابل سے آٹھ بجے دن کو روانگی

ہوئی، اور ایک بجے دن کے قریب غزنین کا سواد نظر آیا، سب سے پہلے مہمانون نے بازار کی سیر کی، اور بازار کی سیر سے واپس آکر کھانا کھایا، اور کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے آرام کیا، اس کے بعد غزنین کے مزارات اور بقیہ عمارات کے دیکھنے کے لیے ۴ بجے کے قریب نکلے، یہان غزنین کے کونون، گوشون، ڈھیرون اور قبرون کے واقف کار ایک بہت معمر بزرگ ملا قربان تھے، اور وہی ان مقامات کی رہنمائی کے لیے مہمانون کے ساتھ کیے گئے اور اسی خضر راہ کی رہنمائی مین سب لوگ پرانی غزنین کی سیر کو روانہ ہوئے، ڈاکٹر صاحب کو حکیم سنائی کے مزار کے دیکھنے کا سب سے زیادہ اشتیاق تھا اس لیے جب وہ ان کے مزار کے پاس پہنچے تو ان کے سرہانے کھڑے ہو کر بے اختیار ہو گئے اور دیر تک زور زور سے روتے رہے، ڈاکٹر صاحب نے صرف ان کے مزار ہی کی زیارت پر قناعت نہین کی بلکہ ان کے مطب کو بھی دیکھا، جو ایک تیرہ و تنگ گلی مین تھا، اس کے بعد سلطان محمود کے مزار کی زیارت بھی کی، ان مزارات کی زیارت سے لوٹنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کو لاہور کی مناسبت سے حضرت داتا گنج بخش لاہوری (جن کا مزار لاہور مین ہے) کے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کی تلاش ہوئی، ملا قربان نے کہا مین وہ مزار جانتا ہون، چنانچہ ان کی رہنمائی مین ڈاکٹر صاحب وغیرہ کچھ دور پیادہ پا گئے اور زیارت کر کے واپس چلے آئے،

۳۱ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو غزنین سے روانگی ہوئی، اور یکم نومبر ۱۹۳۳ء کو تمام مہمان قندھار مین پہنچے، اور یہان خرقہ شریف کی زیارت کی، ڈاکٹر صاحب نے مسافرین خرقہ کا ذکر اس شعر مین کیا ہے :-

خرقۂ آن برزخ لا یبغیان " دیدمش در نکتۂ " لی خرقتان "

دوسرے مصرعے مین اس حدیث کی طرف اشارہ ہے

لی خرقتان الفقر والجہاد — میرے دو خرقے ہین ایک فقر اور دوسرا جہاد،

قندھار کی سیر و سیاحت کے بعد ۲ر نومبر ۱۹۳۳ء کو ناشتہ سے فارغ ہو کر آٹھ بجے صبح کو روانگی ہوئی، اور افغانستانی سرحد کو ختم کر کے چمن مین داخلہ ہوا، تو شہر کے دروازہ پر مسلمانون نے استقبال کیا، اور ایک رسٹورن مین لاکر بٹھا دیا، جس مین مختلف خیال کے مسلمان جمع ہو گئے تھے، جو سیاسیات کی مختلف راہون سے آشنا تھے، اور مولانا سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر صاحب سے طرح طرح کے سوالات کرتے تھے، ڈاکٹر صاحب کے اسکول کے زمانہ کے ایک ہندو کلاس فیلو جو یہان ڈاکٹر تھے، ملنے آئے اور ڈاکٹر صاحب سے اپنا تعارف کرایا،[1]

---

[1] یہ تمام معلومات مولانا سید سلیمان ندوی کے مضمون سفر افغانستان سے ماخوذ ہین، جو معارف کے متعدد نمبرون مین چھپا تھا اور اب "سیاحت افغانستان" کے نام سے ایک مستقل رسالے مین شائع ہوا ہے،

— ❀ —

علالت اور وفات

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

افغانستان سے واپس آنے کے دو ہی مہینے بعد ڈاکٹر صاحب کا طویل سلسلہ علالت شروع ہوا، جس کے بعد وہ دوبارہ نہ سنبھل سکے، اس علالت کے اجمالی حالات تو ان خطوط سے معلوم ہو سکتے ہیں جو اقبال نامہ میں درج ہیں، لیکن مفصل حالات سید نذیر نیازی نے رسالہ اردو اقبال نمبر میں ایک مستقل مضمون میں لکھے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۰ ار جنوری ۱۹۳۴ء کو عید کا دن تھا، اور سوءِ اتفاق سے اس دن سردی نہایت سخت تھی اور صبح ہی سے تیز اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، ڈاکٹر صاحب نماز عید ادا کرنے کیلیے شاہی مسجد کو روانہ ہوئے، تو ان کو موٹر میں آتے جاتے یہ سرد ہوا لگی، اس پر طرہ یہ کہ جاڑے کی شدت سے زمین یخ بستہ ہو رہی تھی، اور چونکہ شاہی مسجد کے دروازے سے محراب تک بہت زیادہ فاصلہ ہے، اور ڈاکٹر صاحب کو آتے جاتے دو بار صحن مسجد سے گذرنا پڑا، اسلیے دونوں بار ان کے پاؤں نے سردی محسوس کی، نماز عید پڑھ کر واپس آئے تو دہی کے ساتھ سوئیاں کھائیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے روز ان کو نزلے کی شکایت ہو گئی، سخت کھانسی آنے لگی اور گلا بیٹھ گیا جس کے لیے غرغرے تجویز کیے گئے، دوائیں لگائی گئیں مگر بے سود، بالآخر ایکسرے کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ قلب کے اوپر ایک رسولی بن رہی ہے، چونکہ یہ علامت نہایت خطرناک تھی، اس لیے کچھ دنوں کے بعد پھر یہ عمل کیا گیا، اور اب صاف صاف معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی خطرے میں ہے، اس کے بعد حکیم نابینا صاحب کا علاج شروع ہوا، اور اس سے معتدبہ فائدہ بھی ہوا، لیکن آواز کا مسئلہ جوں کا توں رہا، اگرچہ اب گلے کی حالت بہتر

تھی، اور آواز بھی نسبتہً بڑھ گئی تھی، لیکن آواز کا دھیما پن بدستور قائم رہا،

جنوری ۱۹۳۵ء مین ڈاکٹر صاحب بھوپال تشریف لے گئے، اور وہان ما ورا نفشی شعاعون کا عمل شروع ہوا، اور اس دوران مین حکیم نابینا صاحب کی دوائین بند کردی گئین، اس کا اثر یہ ہوا کہ چار دفعہ بجلی کے علاج کے بعد آواز مین خفیف سا فرق پیدا ہوا، لیکن بجلی کے علاج اور حکیم نابینا صاحب کی دواؤن کے باوجود مرض کا استیصال نہین ہوا، بالخصوص ۱۹۳۶ء کی گرمیون مین ان کی صحت بتدریج گرنے لگی، اور رفتہ رفتہ یہ کیفیت ہوگئی کہ چارپائی سے اٹھکر دو قدم چلے اور ہانپنے لگے، ۱۹۳۸ء کے آغاز مین حالت اور بھی خراب ہوگئی، اور ضیق النفس کے خفیف سے دورے ہونے لگے، اور ۳ مارچ ۳۸ء کو آخر شب مین ان پر ضعف قلب کے باعث غشی طاری ہوگئی، گویا یہ ڈاکٹر صاحب کے مرض الموت کا آغاز تھا، اگرچہ اس کی اطلاع حکیم نابینا صاحب کو کردی گئی، مگر اب قرشی صاحب کا علاج شروع ہوا، اور چند ہی دنون مین ڈاکٹر صاحب کو لحظہ بلحظہ افاقہ ہونے لگا، لیکن اس دوران مین مرض الموت کی رفتار کچھ عجیب سی رہی، اول استسقا کا حملہ ہوا، جس سے چہرے اور پاؤن پر ورم آگیا، اب پیٹ کے درد سے بھی خاصی تکلیف رہتی تھی، مگر رفتہ رفتہ ان علامات مین تخفیف ہونا شروع ہوگئی لیکن اگلے ہی روز بیماری نے کچھ ایسا زور پکڑا کہ ڈاکٹر صاحب کے بائین جانب تمام جسم پر ورم پھیل گیا، اس حالت مین ڈاکٹر جمعیت سنگھ کو بلوایا گیا، اور انھون نے معائنہ کے بعد قطعاً مایوسی کا اظہار کیا، ڈاکٹر جمعیت سنگھ گئے تو ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب نے تسکین کے دو چار کلمے کہنے چاہے، لیکن ڈاکٹر صاحب الٹے ان کی تسکین خاطر فرماتے ہوئے کہنے لگے "مین مسلمان ہون موت سے نہین ڈرتا" اس کے بعد اپنا یہ شعر پڑھا:

نشان مرد مومن با تو گویم　　　　چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

دوسرے دن ڈاکٹر جمعیت سنگھ پھر تشریف لائے، ڈاکٹر یار محمد خان صاحب بھی ساتھ تھے، شام کو کپتان الٰہی بخش صاحب بھی آگئے، اور باہمی مشورے سے دواؤن اور انجکشنون کی تجویز ہونے لگی، دوسرے دن قریشی صاحب بھی پہنچ گئے، اب ہر قسم کی تدابیر ہو رہی تھین، قدیم او جدید سب، بالآخر وہ وقت آ پہنچا جس کا کھٹکا مدت سے لگا ہوا تھا، شام کے وقت جب ان کے معالجین ایک ایک کرکے جمع ہوئے، تو انھین بتلایا گیا کہ ڈاکٹر صاحب کو کل شام سے بلغم مین خون آرہا ہے، یہ علامت نہایت یاس انگیز تھی، اس لیے کہ خون دل سے آیا تھا، اس حالت مین کسی نے یہ بھی کہدیا کہ شاید وہ آج کی رات جانبر نہ ہوسکین، مگر انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے، تدبیر کا دامن آخر وقت تک نہین چھوڑتا، قریشی صاحب نے بعض دوائین تلاش کرنے کا ارادہ ظاہر کیا، تو موٹر کی ضرورت محسوس ہوئی، اور راجہ حسن اختر صاحب موٹر کی تلاش مین نکلے، ادھر ڈاکٹرون کی رائے ہوئی کہ کرنل امیر چند صاحب کو بھی مشورہ مین شامل کرلیا جائے، کرنل صاحب تشریف لائے، تو ان کی حالت کسی قدر سنبھل گئی تھی، یعنی ان کے حواس ظاہری کی یہ کیفیت تھی کہ ایک دفعہ پھر امید بندھ گئی، اس لیے طے ہوا کہ کچھ تدابیر اس وقت اختیار کی جائین، اور کچھ صبح، تھوڑی دیر مین ڈاکٹر صاحبان چلے گئے، اور ڈاکٹر عبد القیوم صاحب کو رات کے لیے ضروری ہدایات دیتے گئے، اب دھوا مین ذرا سی خنکی آچلی تھی، اس لیے ڈاکٹر صاحب بڑے کمرے مین اٹھ آئے، اور حسب معمول باتین کرنے لگے، ۱۱ بجے شب کو دوا آگئی، اور ڈاکٹر صاحب کو پلائی گئی، مگر اس کے پیتے ہی ان کا جی متلانے لگا اور انھون نے خفا ہوکر کہا "یہ دوائین غیر انسانی ہین" انکی گھبراہٹ کو دیکھ کر قریشی صاحب نے خمیرۂ گاؤزبان عنبری کی ایک خوراک کھلائی جس سے فوراً سکون ہوگیا، اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے صاف صاف کہدیا کہ وہ ایلوپیتھک دوا استعمال نہین کرینگے، اس طرح گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گذر گیا، اور ڈاکٹر صاحب کو نیند آنے لگی، اس حالت کو

دیکھکر تمام تیمار دار ساڑھے بارہ بجے شب کو رخصت ہو گئے، لیکن کسی کو یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ یہ جاوید منزل کی آخری صحبت ہے،

تیمارداروں کے اٹھ آنے کے بعد راجہ حسن اختر صاحب تشریف لائے، اور آخر شب تک وہین حاضر رہے، شروع شروع مین تو ڈاکٹر صاحب کو سکون رہا، اور وہ کچھ وقت سو بھی لیے، لیکن پچھلے پہر کے وقت بےچینی شروع ہو گئی، ۳ بجے کے وقت ڈاکٹر صاحب نے راجہ صاحب کو طلب فرمایا، اور جب وہ حاضر ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے اپنے ملازم دیوان علی سے کہا کہ تم سو جاؤ، البتہ علی بخش جاگتا رہے، کیونکہ اب اس کے سونے کا وقت نہین، اس کے بعد راجہ صاحب سے فرمایا کہ پیٹھ کی طرف کیون بیٹھے ہو؟ سامنے آجاؤ، وہ ان کے متصل ہو بیٹھے تو کہنے لگے قرآن مجید کا کوئی حصہ پڑھ کر سناؤ، کوئی حدیث یاد ہے؟ اس کے بعد ان پر غنودگی سی طاری ہو گئی، اور راجہ صاحب چراغ گل کر کے باہر تخت پر آبیٹھے، راجہ صاحب کے چلے آنے کے بعد ایک دفعہ پھر کوشش کی گئی کہ ڈاکٹر صاحب رات کی دوا استعمال کرین، مگر انھون نے سختی سے انکار کر دیا، ایک مرتبہ فرمایا "جب ہم حیات کی ماہیت ہی سے بےخبر ہین تو اس کا علم کیونکر ممکن ہے؟ تھوڑی دیر کے بعد راجہ صاحب کو پھر بلوایا گیا، اور ڈاکٹر صاحب نے ان سے کہا آپ یہین کیون نہین آرام کرتے اور پھر ان سے قریشی صاحب کے لانے کے لیے کہا، لیکن انھون نے عرض کیا کہ حکیم صاحب رات دیر سے گئے ہین، شاید ان کا بیدار کرنا مناسب نہ ہو"، اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "کاش ان کو معلوم ہوتا کہ مجھ پر کیا گذر رہی ہے۔" پھر اپنی یہ رباعی پڑھی،

سرودے رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید

سر آمد روزگارے این فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

راجہ صاحب نے ان اشعار کو سنتے ہی کہا کہ مین ابھی حکیم صاحب کو لاتا ہون، یہ واقعہ

۵ - ۵ کا ہے، راجہ صاحب گئے تو ڈاکٹر صاحب خوابگاہ مین تشریف لائے، ڈاکٹر عبدالقیوم نے حسب ہدایات فروٹ سالٹ تیار کیا، لیکن ڈاکٹر صاحب بھرے ہوئے گلاس کو دیکھ کر کہنے لگے "اتنا بڑا گلاس کس طرح پیون گا"؟ اور پھر چپ چاپ سارا گلاس پی گئے، علی بخش نے چوکی پلنگ کے ساتھ لگا دی، اب اس کے سوا کمرے مین کوئی نہ تھا، ڈاکٹر صاحب نے اول اسے شانون کے دبانے کے لیے کہا، پھر دفعتہ لیٹے لیٹے اپنے پاؤن پھیلائے، اور دل پر ہاتھ رکھکر کہا "یا اللہ!" پھر فرمایا "میرے یہان درد ہے"، اس کے ساتھ ہی سر پیچھے کی طرف گرنے لگا، علی بخش نے آگے بڑھکر سہارا دیا، تو انھون نے قبلہ رو ہو کر آنکھین بند کر لین، اور اس طرح ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو وہ آواز جس نے گذشتہ ربع صدی سے چاردانگ عالم مین غلغلہ ڈال رکھا تھا، ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ[۱]؛

یہ دل شگاف خبر نہایت سرعت کے ساتھ تمام شہر مین پھیل گئی، اور تمام اسلامی حلقون مین ماتم کے طور پر دوکانین بند ہو گئین، لوگ جوق جوق مرحوم کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوئے، قبر کے لیے جگہ کے تعین کا مسئلہ بہت اہم ہو گیا تھا، بالآخر قرار پایا کہ شاہی مسجد کے بڑے دروازے کے باہر سیڑھیون کے بائین جانب کا قطعہ اس کے لیے موزون ہے، اس غرض سے چند حضرات کا وفد ہز اکسلنسی گورنر کی خدمت مین پہنچا، اور ہز اکسلنسی سر ہنری کریگ نے فوراً اجازت دیدی، اور محکمۂ آثار قدیمہ کی منظوری کا اہتمام بھی کر دیا، پانچ بجے گورنر پنجاب کے نمایندہ کی حیثیت سے ان کے ایڈیکانگ، اور چیف سکریٹری اور کمشنر صاحب کوٹھی پر آئے، اس کے بعد ہی جنازہ اٹھایا گیا، چارپائی مین لمبے لمبے بانس باندھ دیے گئے تھے، تاکہ بیک وقت بہت سے لوگ کندھا دے سکین، جنازہ ابھی راستہ ہی مین تھا کہ اخبارون کے ضمیمے، قطعات اور مرثیے تقسیم

---

[۱] ملخص از رسالہ اردو اقبال نمبر

ہونے لگے، جنازہ پہلے اسلامیہ کالج لایا گیا، پھر قرار پایا کہ نماز جنازہ شاہی مسجد مین ہو، جہان مسلمان زیادہ شریک ہو سکین، چنانچہ سات بجے جنازہ شاہی مسجد پہنچا اور ساٹھ ستر ہزار آدمیون نے نماز جنازہ مین شرکت کی، اور آٹھ بجے کے قریب حضوری باغ کے کونے پر مسجد عالمگیر کے مینار کے سائے مین میت سپرد خاک کر دی گئی۔[1]

یہ تو لاہور کا حال تھا، عام طور پر ہندوستان مین یہ دردناک خبر پہنچی، تو تمام ملک نے بلا تمیز دین و ملت ڈاکٹر صاحب کا ماتم کیا، بہت سے شعراء نے قطعات تاریخی لکھے، مشاہیر ملک وملت نے اپنے بیانات شائع کیے، جن مین ڈاکٹر ٹیگور، پنڈت جواہر لال نہرو، سر سلطان احمد، مسٹر محمد یونس سابق وزیر اعظم بہار، نواب بہادر یار جنگ، مسٹر سوبھاش چندر بوس صدر کانگرس، مسٹر محمد علی جناح صدر مسلم لیگ، اور ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کے بیانات سب رس اقبال نمبر (صفحہ ۶۶-۶۷) مین بلفظہ نقل کیے گئے ہین،

جابجا ماتمی جلسے ہوئے، پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی جانب سے جو جلسہ ہوا اسکی صدارت میان عبد الحئی صاحب وزیر تعلیم حکومت پنجاب نے کی، حیدر آباد کا سب سے بڑا تعزیتی جلسہ زیر صدارت مسز سروجنی نائیڈو ہوا، اور اس مین ہز ہائینس ولیعہد بہادر، شہزادہ برار والاشان نواب معظم جاہ بہادر، رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری، سر مرزا اسمٰعیل دیوان میسور، سر سکندر حیات خان وزیر اعظم پنجاب، سر غلام حسین ہدایت اللہ، راجہ صاحب محمود آباد، ڈاکٹر سید محمود، مسٹر محمد علی جناح، مرزا یار جنگ بہادر، سر امین جنگ بہادر، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے بیانات پڑھے گئے، اور نواب مہدی یار جنگ بہادر، راجہ پرتاب گیرجی، ڈاکٹر یوسف حسین خان، ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم اور نواب کیقباد جنگ بہادر نے تقریرین کین، ان مین

[1] سب رس اقبال نمبر صفحہ ۶۶

راجہ پرتاب گیرجی نے ہندوون کی نمایندگی مین اور نواب کیقباد جنگ بہادر نے پارسیون کی نمایندگی مین تقریرین کی تھین، اس جلسے کے علاوہ انجمن خواتین دکن، جمعیت مسلم نونہالان سکندرآباد اور مدرسہ فوقانیہ دارالشفا کی طرف سے بھی ماتمی جلسے ہوئے۔

ہندوستان سے باہر کیمبرج یونیورسٹی مسلم سوسائٹی کی جانب سے ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء کو نماز جمعہ کے بعد ایک ماتمی جلسہ ہوا اور نماز کے بعد نماز جنازہ پڑھی گئی۔

یہ تمام بیانات و پیامات اور جلسہ ہاے تعزیت کی رودادین سب رس اقبال نمبر (صفحہ ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲) مین شائع ہوئی ہین، اور سب کے آخر مین لکھا ہے کہ "علامہ اقبال کی وفات کے متعلق جو تفصیلات اور بیانات شائع ہوئے ان کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے، خصوصاً حیدرآباد مین جو تعزیتی جلسے ہوئے ان کی روداد و تقاریر کے اقتباسات اور نظمون کو بھی گذشتہ صفحات مین شائع کیا گیا ہے، تاکہ آیندہ جو لوگ علامۂ مرحوم کے متعلق کام کرنا چاہین ان کو زیادہ سے زیادہ مواد ایک جگہ مل سکے، یہ نظمین جن مین قطعات تاریخی بھی شامل ہین سب رس کے صفحہ ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴) مین درج ہین، ان کے علاوہ بعض تاریخی قطعے، رسالہ اردو اقبال نمبر، جوہر اقبال اور علی گڈھ میگزین اقبال نمبر مین بھی درج ہین، اور ہم ان مین سے بعض مادہاے تاریخ کو اس موقع پر درج کرتے ہین:

چل دیئے عرش معلی پہ ٹہلنے کے لیے (جمیل)
۱۳۵۷ھ افضلی

عزت قوم ہے مردہ اگر اقبال نہین (بشیر النسا بیگم بشیر)
۱۳۵۷ھ

ہے زوال علم و حکمت مرگ سر اقبال کی (مولانا احسن مارہروی)
۱۳۵۷ھ

جگر مین قوم کے ناسور غم رہیگا یہ سال (سید ہاشمی فریدآبادی)
۱۳۵۷ھ

باد رحمت ہاے حق بر تربتش آمد "المغفور" سال رحلتش
۱۳۵۷ھ
(حامد حسن قادری)

ہم زروے داد در وحی کریم گفت ہاتف "عندہ اجر عظیم" ۱۳۵۷ھ "

سال دیگر ہم ز قرآن مبین گفت حامد "لذۃ للشاربین" ۱۳۵۸ھ "

ملت اسلام میں اقبال کا ماتم ہے آج (ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب)

حیات اقبال میں لکھا ہے کہ آج تک کسی شخص کی وفات پہ اتنی تاریخیں نہیں کہی گئیں، مثلاً جناب حفیظ ہوشیارپوری نے کئی کئی تاریخیں نکالی ہیں، جن میں "ڈاکٹر سر محمد اقبال برد" اور "آہ مفکر اعظم" سے ان کی وفات کی ہجری تاریخ ۱۳۵۷ھ نکلتی ہے، اور "پیغمبر دین خودی" کے عدد ۱۹۳۸ء ہیں حفیظ صاحب نے علامہ اقبال کے ایک مصرع

"صدق واخلاص ووفا باقی نماند"

سے بھی ہجری تاریخ نکالی ہے، راحل ہوشیارپوری نے "خضر رہ اسلام" سے عیسوی تاریخ نکالی، خواجہ دل محمد نے بھی عیسوی اور ہجری تاریخیں بڑی خوبی سے نکالی ہیں، اور انھیں یوں نظم کیا ہے،

"شمع خاموش" سال ہجری ہے ۱۳۵۷ھ عیسوی "شمع شاعری خاموش" ۱۹۳۸ء [1]

ڈاکٹر صاحب نے خود اپنی لوح مزار پر لکھنے کے لیے یہ رباعی لکھی تھی:

نہ پیوستم درین بستان سرا دل ز بند این و آن آزادہ رفتم

چو باد صبح گردیدم دمِ چند گلان را رنگ و آبے دادہ رفتم

لیکن جب سر راس مسعود مرحوم کا انتقال ہوا تو خود ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا کہ اس رباعی کا مضمون ان سے زیادہ سر راس مسعود کی زندگی اور موت پر صادق آتا ہے۔ اس لیے اس رباعی کا انھوں نے ان کی لوح مزار کے لیے انتخاب کیا۔[2]

---

[1] حیات اقبال صفحہ ۱۴۶، ۱۴۷، [2] اقبال نامہ صفحہ ۳۲۹، ۳۳۰

آل و اولاد

ڈاکٹر صاحب نے تین شادیان کی تھین، اور تینون بیبیان ایک ساتھ ان کے حبالۂ نکاح مین رہین، پہلی شادی والدۂ آفتاب اقبال سے کی تھی، جو گجرات کی رہنے والی تھین، اور وہ ڈاکٹر صاحب کے بعد زندہ رہین اور [illegible] مارچ ۱۹۴۶ء مین ان کا انتقال ہوا ہے، اس کے بعد والدۂ جاوید سے جو لاہور کی رہنے والی تھین، نکاح کیا، پھر ان دونون بیبیون کی زندگی ہی مین لودھیانہ کی ایک خاتون سے تیسری شادی کی، لیکن انھون نے والدۂ جاوید سے پہلے ہی ۱۹۲۴ء مین ڈاکٹر صاحب کو داغ مفارقت دیا، یہی تیسری بی بی ہین جن کے انتقال کی خبر ڈاکٹر صاحب نے مہاراجہ سرکشن بہادر کو ان الفاظ مین دی ہے :-

> اس عرصہ مین بہت سے آلام و مصائب کا شکار رہا، بیوی کا انتقال ہوگیا جس سے اب تک قلب پریشان ہے،[1]

اس بی بی سے غالباً کوئی اولاد نہین پیدا ہوئی، یا ہوئی تو وہ اس دنیا مین موجود نہین ہے، لیکن دوسری بی بی سے اسی سال ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام جاوید رکھا گیا، اور ڈاکٹر صاحب نے اسی خط مین جاوید کی ولادت کی خبر بھی مہاراجہ بہادر کو دی، اور انھون نے اس کے جواب مین لکھا کہ

> ۱۹۲۴ء ہم سے رخصت ہوتا ہے، مگر چلتے چلاتے غم کی خبر دے رہا ہے کہ سر اقبال

[1] مکاتیب شاد و اقبال ص ۱۶۲،

کی بیوی کا انتقال ہو گیا، افسوس، اور دوسری خبر مسرت و شادمانی کی دیتا ہے کہ اقبال کی دوسری بیوی سے فرزند نرینہ پیدا ہوا، مبارک[1]

والدۂ جاوید کے بطن سے ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی جس کا نام منیرہ ہے، لیکن وہ بھی دس سال سے جگر و طحال کے عارضہ مین مبتلا تھین، اور ڈاکٹر صاحب کے عین زمانہ علالت مین بخار کی وجہ سے اور بھی زیادہ کمزور ہو گئی تھین، چنانچہ خود ڈاکٹر صاحب نے ۲۶ اپریل ۱۹۳۵ء کے ایک خط مین سر راس مسعود مرحوم کو اس کی اطلاع دی ہے[2]۔ اس کے بعد ان کا آپریشن ہوا جس سے بظاہر ان کی زندگی بچ گئی، چنانچہ ڈاکٹر صاحب ۲ مئی ۱۹۳۵ء کے ایک خط مین سر راس مسعود مرحوم کو لکھتے ہین:-

میری بیوی کو ایک آپریشن کرانا پڑا، اگرچہ یہ بڑا ہی ہولناک اور ناقابل برداشت منظر تھا، لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زندگی بچ گئی[3]۔

لیکن ڈاکٹر صاحب کی یہ توقع پوری نہین ہوئی، بلکہ ان کی حالت روز بروز خطرناک ہوتی گئی، چنانچہ ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کے ایک خط مین سر راس مسعود مرحوم کو لکھتے ہین:-

"میری بیوی خطرناک طور پر بیمار ہے، شاید یہ اس کے آخری لمحات ہین"

پھر اسی خط کے اخیر مین لکھا ہے کہ "ساڑھے پانچ بجے میری بیوی کا انتقال ہو گیا"[4]

اس وقت جاوید کی عمر ۱۱ سال اور منیرہ کی عمر ۵ سال کی تھی، اور بیوی کے انتقال کے بعد ڈاکٹر صاحب کو ان کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک استانی کی ضرورت محسوس ہوئی، جس مین مندرجۂ ذیل اوصاف ضروری تھے،

(۱) بیوہ اور بے اولاد ہو،

---

[1] مکاتیب شاد و اقبال ص ۱۶۵ [2] اقبال نامہ ص ۳۵۸ [3] ایضاً ص ۳۵۹ [4] ایضاً ص ۳۶۰

(۲) عمر مین کسی قدر مسن ہو تو بہتر ہے،

(۳) کسی شریف گھر کی ہو جو گردش زمانہ سے اس قسم کا کام کرنے پر مجبور ہو گئی ہو،

(۴) دینی اور اخلاقی تعلیم دے سکتی ہو یعنی قرآن اور اردو پڑھا سکتی ہو، عربی اور فارسی بھی جانے تو اور بھی بہتر ہے،

(۵) سینا پرونا وغیرہ بھی جانتی ہو،

(۶) کھانا پکانا بھی جانتی ہو لیکن اس کا یہ مطلب نہین کہ اس سے باورچی کا کام لیا جائیگا،

اس کے فرائض یہ ہون گے:-

(۱) بچون کی اخلاقی اور دینی تربیت و نگہداشت،

(۲) گھر کا انتظام اور نگہداشت، یعنی گھر کا سب چارج اسی کو دیا جائے گا، اور زنانخانے کے تمام اخراجات اسی کے ہاتھ سے ہون گے،

اس کے لیے ڈاکٹر صاحب نے تہذیب نسوان مین اشتہار دیا، اور اس کے جواب مین علی گڈھ سے خط آیا، چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے ان امور کو ملحوظ رکھکر مسٹر غلام السیدین پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی سے ۲۰ راکتوبر ۱۹۳۵ء کو ایک خط کے ذریعہ سے اس خاتون کے حالات دریافت کیے، اور لکھا کہ آپ خود ماہر تعلیم ہین، اور میرے موجودہ حالات سے بھی باخبر، مندرجۂ بالا امور کو ملحوظ رکھ کر حالات دریافت کیجیے[۱]

لیکن اپریل ۱۹۳۶ء تک استانی کا انتظام نہ ہو سکا، چنانچہ ۱۰ راپریل ۱۹۳۶ء کے ایک خط مین مسٹر غلام السیدین کو لکھتے ہین:

استانی کا اب تک کوئی انتظام نہ ہو سکا[۲]

---

[۱] اقبال نامہ ص ۳۱۳ - ۳۱۴ [۲] ایضاً ص ۳۱۷

غرض کسی مسلمان استانی کا انتظام تو نہ ہو سکا۔ البتہ ۱۹۳۷ء مین ایک جرمن لیڈی جو علی گڈھ کے ایک پروفیسر کی بیوی کی بہن تھی، اور اس تعلق سے ایک مدت تک علی گڈھ مین مقیم رہ چکی تھی۔ مل گئی اور ڈاکٹر صاحب نے اس کو آزمایشی طور پر مقرر کر لیا۔[1]

اخلاقی اور دینی تعلیم و تربیت کے علاوہ سب سے مقدم ضرورت یہ تھی کہ مالی حیثیت سے ان دونون بچون کی پرورش کا معقول انتظام کر دیا جائے، اور ڈاکٹر صاحب نے اس غرض سے اپنی علالت کے ابتدائی زمانے ہی مین ایک وصیت نامہ لکھکر سب رجسٹرار لاہور کے دفتر مین محفوظ کرا دیا تھا۔ سید نذیر نیازی نے ڈاکٹر صاحب کی علالت کے ابتدائی زمانے کے حالات مین اجمالاً اس وصیت نامہ کا ذکر ان الفاظ مین کیا ہے:

> وصیت کا مسئلہ اس سے پہلے طے ہو چکا تھا اور بعض ضروری ہدایات وہ اپنے معتمد رفیق چودھری محمد حسین صاحب کو دے چکے تھے، ان کے نام ایک خط بھی تھا، جو شروع جون مین ڈاکٹرون کی تشخیص کے زیر اثر لکھا گیا، اس مین جاوید سلمہ کی تعلیم اور بچون کی دیکھ بھال کے علاوہ انھون نے علی بخش کو چند ضروری ہدایات دی ہین اور پھر مسلمانون سے دعائے خیر کی درخواست کی ہے۔[2]

اس وصیت نامہ کے متعلق خود ڈاکٹر صاحب نے ۱۰ جون ۱۹۳۷ء کو ایک مفصل خط سر راس مسعود مرحوم کو لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیا، کے انتخاب مین ڈاکٹر صاحب کی نگاہ انھیں اشخاص پر پڑی ہے، جن کے خلوص، دیانت، اور شفقت پر ان کو کامل اعتماد تھا، ان اولیا مین شیخ طاہر الدین جو ۲۰ سال سے ڈاکٹر صاحب کے کلرک تھے، اور ڈاکٹر صاحب کو ان کے خلوص پر کامل اعتماد تھا، چودھری محمد حسین ایم۔اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سکرٹریٹ لاہور، ڈاکٹر صاحب

---

[1] اقبال نامہ ص ۳۸۴، ۳۸۵، [2] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۱۰۴۰

کے قدیم دوست اور مخلص مسلمان تھے، شیخ اعجاز احمد بی، اے، ایل، ایل، بی سب جج دہلی نہایت صالح آدمی اور ڈاکٹر صاحب کے بھتیجے تھے، اور خواجہ عبدالغنی خود بچون کے ماموں تھے، ان مین خواجہ عبدالغنی کا انتقال ہوگیا تو ڈاکٹر صاحب نے ان کی جگہ خانصاحب میان امیرالدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا، اور شیخ اعجاز احمد چونکہ خود بہت عیالدار شخص تھے، اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتے تھے، اس لیے ان کی جگہ سر راس مسعود مرحوم کو مقرر کرنا چاہا، اور راس کے متعلق ان سے استصواب کیا، لیکن یہی آخری نقص خود سر راس مسعود مرحوم مین بھی تھا، اس لیے انھون نے ڈاکٹر صاحب کے جواب مین لکھا کہ

جو تھے گارڈین کی بابت میری رائے یہ ہے کہ چونکہ مین نہ لاہور مین رہتا ہون اور نہ کوئی امید لاہور کے قریب رہنے کی ہے، تو مجھے مقرر نہ کرو بلکہ کسی ایسے دوست کو جو کم سے کم پنجاب ہی مین مقیم ہون، البتہ اپنی وصیت مین یہ ضرور لکھو کہ اگر گارڈین کو کسی معاملہ مین جہانتک کہ منیرہ سلمہا اور جاوید سلمہ کی تعلیم کا تعلق ہے کوئی مالی دقت پیش آئے تو پہلے مین مطلع کیا جاؤن کیونکہ جب تک کہ ان دونون کی انشاء اللہ بائیس برس کی عمر نہ ہوجائے مین ہر ممکن طریقہ سے مدد دینے کے لیے تیار ہون بشرطیکہ مین خود زندہ رہا، یہ خود ایک بہت بڑی ذمہ داری مین اپنے اوپر اس عشق کے ثبوت مین لے رہا ہون جو مجھے تم سے ہے، یہ ضرور کرنا کہ میرے متعلق اس سلسلہ مین جو الفاظ اپنے وصیت نامہ مین درج کرو جو کہ رجسٹرار کے پاس محفوظ کر رہے ہو ان کی ایک نقل میرے پاس ضرور بھجدینا، اگر خدا نخواستہ ضرورت پیش آئی تو یقین رکھو کہ تمھارے ان دونون بچون کے لیے ان کی تعلیم کے مسئلہ مین مین وہی کرون گا جو اپنی اولاد کے لیے، یہ ضرور صلاح دیتا ہون کہ جہانتک کہ جائداد وغیرہ کا تعلق ہے اس کا انتظام اپنے سامنے ہی کردو کہ کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہے۔[۱]

ان واقعات سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو جاوید سلمہ سے کس قدر محبت تھی، اور ان کو ان کی تعلیم و تربیت کا کس قدر خیال تھا، لیکن وہ ان کو جس قسم کی تعلیم و تربیت دینا چاہتے تھے، اسکا اندازہ ان اشعار سے ہوسکتا ہے جو انھون نے جاوید کے متعلق لکھے ہین، چنانچہ ضرب کلیم مین تعلیم و تربیت کا جو عنوان قائم کیا ہے اس کے تحت مین ایک مستقل نظم لکھی ہے، اور اس مین جاوید سلمہ کو اس طرح خطاب کیا ہے:

غارت گر دین ہے یہ زمانہ — ہے اس کی نہاد کافرانہ

دربار شہنشہی سے خوشتر — مردان خدا کا آستانہ

خالی ان سے ہوا دبستان — تھی جن کی نگاہ تازیانہ

جس گھر کا مگر چراغ ہے تو — ہے اس کا مذاق عارفانہ

جوہر مین ہو لا الہ تو کیا خوف — تعلیم ہو گو فرنگیانہ

شاخ گل پر چہک ولیکن — کر اپنی خودی مین آشیانہ

ایک بار جاوید کو نماز فجر پڑھتے ہوئے دیکھا تو اس کو وسیلہ قرار دیکر خدا سے دعا کی،

چہ میخواہی ازین مرد تن آسانے — بہر بادے کہ آمد رفت از جائے

سحر جاوید را در سجدہ دیدم — بہ صبحش چہرۂ شامم بیارائے

جاوید کے متعلق خدا سے یہ دعا کرتے ہین:

ز شوق آموختم آن ہاے و ہوئے — کہ از سنگے گشاید آبجوئے

ہمین یک آرزو دارم کہ جاوید — ز عشق تو بگیرد رنگ و بوئے

یکے بنگر فرنگی کجکلاہان — تو گوئی آفتابانند و ماہان

جوان سادۂ من گرم خون است — نگہدارش ازین کافر نگاہان

جاویدنامہ مین "خطاب بہ جاوید" کے عنوان سے سیکڑون نصیحت آمیز اشعار لکھے ہین، اور جاوید کو اپنی پوری شاعرانہ تعلیمات کا خلاصہ سمجھایا ہے،

لیکن یہ تمام واقعات جن کی تفصیل اوپر گذر چکی اقتصادی، مذہبی، تعلیمی اور اخلاقی حیثیت رکھتے ہین، خالص جذبات محبت سے بظاہر ان کو کوئی ایسا گہرا تعلق نہین ہے، لیکن افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے خطوط سے اس قسم کی جذباتی محبت کا حال معلوم نہین ہوتا، البتہ خود جاوید سلمہ نے ایک مستقل مضمون جو دلچسپی کی وجہ سے متعدد رسالون (ماہ نو و نور جہان) مین چھپ چکا ہے لکھا ہے جس کی سرخی "اقبال باپ کی حیثیت سے" ہے، اور اس مضمون سے اس جذباتی محبت کا پتہ چلتا ہے جو ایک شریف باپ کو اپنے لاڈلے بیٹے سے ہوتی ہے، جو لوگ ایک سنجیدہ فلسفی کی سب سے زیادہ شریفانہ محبت کے جذبات کا تلاطم دیکھنا چاہین ان کو اس مضمون کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے،

ذاتی حالات

مذہب ڈاکٹر صاحب اگرچہ اخیر مین ٹھیٹ مذہبی آدمی ہو گئے تھے، لیکن اس منزل تک وہ بتدریج پہنچے تھے، اپنی ابتدائی زندگی مین وہ متشکک تھے، چنانچہ خود مثنوی رموز بیخودی مین فرماتے ہین:

عقل آذر پیشہ ام زنار بست　　　نقش او در کشور جانم نشست

سالہا بودم گرفتار شکے　　　از دماغ خشک من لاینفکے

حرفے از علم الیقین ناخواندہ　　　در گمان آباد حکمت ماندہ

فلسفہ کے علاوہ اتحاد قومی نے بھی جس کے وہ اپنی شاعری کے ابتدائی دور مین پرجوش مبلغ تھے، ان کو دین وملت کی قید سے بیزار کر دیا تھا، اور وہ کافر و مسلم دونون کو ایک ہی سمجھنے لگے تھے، چنانچہ ایک مولوی کی زبانی خود فرماتے ہین:

سنتا ہون کہ کافر نہین ہندو کو سمجھتا　　　ہے ایسا عقیدہ اثر فلسفہ دانی

یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی شاعری کے ابتدائی دور مین جابجا آئین وملت کے امتیاز سے بیزاری ظاہر کرتے ہین، چنانچہ اپنی نظم تصویر درد مین فرماتے ہین:

اجاڑا ہے تمیز ملت و آئین نے قومون کو　　　مرے اہل وطن کے دل مین کچھ فکر وطن بھی ہے

وہ نہایت حسرت کے ساتھ خفتگان خاک سے استفسار کرتے ہین

وان بھی انسان اپنی اصلیت سے بیگانے ہین کیا؟　　　امتیاز ملت و آئین کے دیوانے ہین کیا؟

یہی وہ دور ہے جس مین خاک وطن کا ہر ذرہ ان کا خدا تھا، اور نوع انسان کی محبت انکا ایمان،

اس لیئے بصد حسرت خفتگان خاک سے پوچھتے ہین:

آہ وہ کشور بھی تاریکی سی کیا معمور ہے؟ یا محبت کی تجلی سے سراپا نور ہے؟

فلسفہ اور اتحاد قومی کے علاوہ وحدت الوجود کے صوفیانہ عقیدے نے بھی جس کے وہ آخر مین سخت مخالف ہوگئے تھے، ان کو دین وملت کی زنجیرون سے آزاد کردیا تھا کیونکہ جب دنیا کی تمام چیزین ایک ہی آفتاب کا پرتو ہین تو ان مین اختلاف کے کیا معنی؟ چنانچہ وہ اپنی نظم "جگنو" مین اس خیال کو اس طرح ظاہر کرتے ہین:

حسن ازل کی پیدا ہر چیز مین جھلک ہے
انسان مین وہ سخن ہے، غنچے مین وہ چٹک ہے

یہ چاند آسمان کا شاعر کا دل ہے گویا
وان چاندنی ہے جو کچھ یان درد کی کسک ہے

انداز گفتگو نے دھوکے دیئے ہین ورنہ
نغمہ ہے بوے بلبل بو پھول کی چہک ہے

کثرت مین ہوگیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو مین جو چمک ہے وہ پھول مین مہک ہے

یہ اختلاف پھر کیون ہنگامون کا محل ہو
ہر شے مین جبکہ پنہان خاموشیٔ ازل ہو

غرض اس دور مین وہ ایک ایسا مذہب چاہتے تھے جس کی بنیاد صرف باہمی محبت پر ہو، چنانچہ اپنی نظم "نیا شوالہ" مین انھون نے اسی خیال کو اس طرح ظاہر کیا ہے:

سچ کہہ دون اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدے کے بت ہوگئے پرانے

اپنون سے بیر رکھنا تو نے بتون سے سیکھا
جنگ وجدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آکے مین نے آخر دیر وحرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتون مین سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھادین
بچھڑون کو پھر ملادین نقش دوئی مٹادین

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس مین بنادین

دنیا کے تیرتھون سے اونچا ہو اپنا تیرتھ	دامانِ آسمان سے اس کا کلس ملا دین
ہر صبح اُٹھ کے گائین منتر وہ میٹھے میٹھے	سارے پجاریون کو مے پیت کی پلا دین
شکتی بھی شانتی بھی بھگتون کے گیت مین ہے	دھرتی کے باسیون کی مکتی پریت مین ہے

لیکن جب یورپ مین ان کو وطنیت کے خطرناک نتائج نظر آئے اور ان کو معلوم ہوا کہ وطنیت بجائے خود ایک بہت بڑا بت ہے اور اس کو صرف روحانی طاقت سے توڑا جا سکتا ہے تو وہ مذہب کے پرجوش مبلغ ہو گئے، اور یورپ سے پلٹنے کے بعد وہ برابر مذہب کی تبلیغ کرتے رہے، لیکن یورپ سے پلٹنے کے بعد انھون نے جس مذہب کی تبلیغ کی وہ فرقہ آرائی سے بلند تھا، وہ اس اسلام کے داعی تھے جس کی دعوت خود قرآن مجید نے دی تھی یعنی وہ اہل قرآن تھے، لیکن اپنے آپ کو اہل قرآن کہنا بھی ایک قسم کی فرقہ بندی تھی، اس لیے انھون نے کبھی اپنے آپ کو اہل قرآن کی طرف منسوب نہین کیا، تاہم ان کے اشارات بلکہ تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب کے متعلق ان کا عروۃ الوثقی صرف قرآن تھا، مثنوی رموز بیخودی مین فرماتے ہین:

گر تو می خواہی مسلمان زیستن	نیست ممکن جز بقرآن زیستن
صوفی پشمینہ پوش حال مست	از شراب نغمۂ قوال مست
آتش از شعر عراقی در دلش	در نمے سازد بقرآن محفلش
واعظ دستان زن افسانہ بند	معنی او پست و حرف او بلند
از خطیب و دیلمی گفتار او	با ضعیف و شاذ و مرسل کار او
از تلاوت بر تو حق دارد کتاب	تو از و کامے کہ میخواہی بیاب

اس باب مین ان کی گفتگوئین اور زیادہ واضح ہین، عرشی صاحب البیان دسمبر ۱۹۳۹ء صفحہ ۱۹ مین لکھتے ہین کہ "ایک بار ان سے مین نے پوچھا، اسلام بتمامہ قرآن مین محصور ہے یا نہین؟

فرمایا "مفصل کہو" مین نے کہا خارج از قرآن ذخیرۂ احادیث و روایات اور کتب فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب مین کفایت کرتا ہے؟ انھون نے فرمایا "یہ چیزین تاریخ و معاملات پر مشتمل ہین، ان کی بھی ضرورت ہے اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ کن ضروریات کے ماتحت وضع کی گیئن، لیکن نفس اسلام قرآن مجید مین بکمال و تمام آچکا ہے، خداوند تعالی کا منشا دریافت کرنے کے لیے ہمین قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہین"

ایک اور گفتگو مین جو انھون نے ایک غالی اہل حدیث سے کی فرمایا کہ "مین اعتقادی امور مین صرف قرآن پر انحصار رکھتا ہون، اور حدیث کے متعلق مجھے اور آپ کو خوب معلوم ہے کہ کن ذریعون سے ہم تک پہنچی ہے" اس پر ایک صاحب ذرا گرم ہو کر کہنے لگے "اگر اس طرح حدیث سے بے پروائی کی جائے گی تو مسلمانی ختم ہو جائے گی، ہمارا کوئی عمل و عبادت حدیث کے بغیر مکمل نہین ہوسکتا، قرآن تو نماز ایسی روزمرہ کی چیز کیلئے بھی ہمین کوئی تفصیل نہین بتاتا، یہی وجہ ہے کہ فرقہ اہل قرآن نے اپنے لیے عجیب قسم کی نمازین تراش لی ہین جن کا جمہور اہل اسلام سے کوئی واسطہ نہین، ان کی نمازون کے اوقات، اذکار اور رکعات وغیرہ سب عالم اسلامی سے مختلف ہین، کیا ایسی حالت مین آپ ان کو کافر نہ کہین گے؟" ڈاکٹر صاحب نے اس تیز کلامی کے جواب مین نہایت نرمی سے فرمایا "کافر نہ کہو، کوئی اور نام رکھ لو، یہ شدت ہے، تم لوگ نمازون کی رکعات و اذکار پر لڑتے ہو، مجھے تو سرے سے نماز کا وجود ہی کہین نظر نہین آتا" [1] یعنی مسلمان نماز ہی نہین پڑھتے

لیکن بایں ہمہ وہ حدیثون کے سرے سے منکر نہ تھے، بلکہ بہت سی حدیثون پر شدت سے اعتقاد رکھتے تھے، ان کو جو کچھ شک و شبہہ تھا وہ احادیث کی شریعت کے متعلق تھا چنانچہ ایک خط مین مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہین :-

[1] البیان دسمبر ۱۹۳۹ء ص ۴۲،

شریعت احادیث کے متعلق جو کھٹک میرے دل میں ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ احادیث سرے سے بیکار ہیں، ان میں ایسے بیش بہا اصول ہیں کہ سوسائٹی باوجود اپنی ترقی و تعالی کے ابتک ان کی بلندیوں تک نہیں پہنچی، مثلاً ملکیت شاملات وہ کے متعلق "المرعی للّٰہ ورسولہ" (بخاری)، اس حدیث کا ذکر میں نے اجتہاد میں بھی کیا ہے،[1]

ڈاکٹر صاحب کے مذہبی خیالات کے سلسلے میں یہ مسئلہ خاص طور پر اہم ہے کہ تصوف کے متعلق ان کا کیا خیال ہے؟ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ وہ ایک صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے والد بزرگوار ایک صوفی منش آدمی تھے، خود ڈاکٹر صاحب سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے[2] اسلیے وہ تصوف سے نہ بالکل بیگانہ رہ سکتے تھے اور نہ عام طور پر تصوف کی مخالفت کر سکتے تھے، انکو، جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، جو کچھ اختلاف تھا تصوف کے بعض مسائل سے تھا، چنانچہ ایک بار مولوی ظفر علی خان نے اپنے اخبار میں تصوف کی مخالفت میں ایک سلسلۂ مضامین لکھنا شروع کیا جس کی نسبت یہ بدگمانی کی گئی کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی تحریک سے لکھا جا رہا ہے، اور اسی بدگمانی کی بنا پر مہاراجہ سرکشن پرشاد نے جو صوفیوں سے خاص عقیدت رکھتے تھے انکو ایک خط میں لکھا کہ

عام طور پر یہ سمجھا جا رہا ہے کہ جو مثنوی آپ نے لکھی ہے اس کی تائید میں آپ محرک ہیں ان تحریرات کے، اس لیے مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ لوگ خواہ مخواہ آپ کو بدنام کریں،[3]

اس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے ان کو ایک مفصل خط لکھا جس میں ان کو یہ یقین دلایا کہ ان مضامین سے ان کا کوئی تعلق نہیں، بلکہ اکثر امور سے اختلاف ہے، البتہ انھوں نے اس سے پیشتر تصوف کے بعض مسائل سے کسی قدر اختلاف کیا تھا، لیکن وہ اختلاف ایک عرصے سے صوفیائے اسلام میں چلا آتا ہے، کوئی نئی بات نہ تھی مگر افسوس ہے کہ بعض ناواقف لوگوں نے ان مضامین کو تصوف کی دشمنی پر محمول کیا،[4]

[1] اقبال نامہ ص ۱۵۱، [2] ایضاً ص ۹، [3] مکاتیب شاد و اقبال ص ۸، [4] اقبال نامہ ص ۸۷، ۹۰

اور ان کو تصوف کے جن مسائل سے اختلاف تھا اور جن کو وہ مسلمانوں کی ترقی بلکہ خود اسلام کا مخالف سمجھتے تھے، ان کی تصریح خود انھوں نے ایک خط میں جس کو انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی کے نام لکھا ہے، کر دی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

آپ کو خیر القرون قرنی والی حدیث یاد ہوگی، اس میں نبی کریم فرماتے ہیں کہ میری امت میں تین قرنوں کے بعد سمن (یظہر فیہم السمن) کا ظہور ہوگا، میں نے اس پر دو تین مضامین اخبار وکیل امرتسر میں شائع کیے تھے جس کا مقصود یہ ثابت کرنا تھا کہ "سمن" سے مراد رہبانیت ہے، جو وسط ایشیا کی اقوام میں مسلمانوں سے پہلے عام تھی، میرا تو عقیدہ ہے کہ غلو فی الزہد اور مسئلہ وحدۃ الوجود مسلمانوں میں زیادہ تر بدھ (سمنیت) مذہب کے اثرات کا نتیجہ ہیں، خواجہ نقشبند اور مجدد سرہند کی میرے دل میں بہت بڑی عزت ہے، مگر افسوس کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے، یہی حال سلسلہ قادریہ کا ہے جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں، حالانکہ حضرت محی الدین کا مقصود اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا تھا[1]

اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ اسلامی تصوف کے مخالف نہ تھے، بلکہ عجمی تصوف کے مخالف تھے، اور عجمی تصوف کے مسائل میں سے انھوں نے خاص طور پر ان کو لیا تھا جن سے اسلام کی عملی اور مجاہدانہ طاقت کو صدمہ پہنچتا تھا، شعرائے ایران نے ان مسائل کو اور بھی زیادہ دلکش پیرائے میں بیان کیا تھا جس نے ڈاکٹر صاحب کے نزدیک مسلمانوں کی عملی طاقت کو بہت نقصان پہنچایا تھا، اور وہ اپنی تبلیغی شاعری سے اسی نقصان کی تلافی کرنی چاہتے تھے، اس لیے ان کو نفس تصوف سے نہیں بلکہ صوفیانہ شاعری سے پرخاش تھی، چنانچہ سراج الدین پال کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفے کی طرف

[1] اقبال نامہ ص ۴۸، ۴۹

مائل تھے، اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم مین یہ میلان طبیعت موجود تھا، اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشو و نما ہونے دیا، تاہم وقت پاکر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا، یا بالفاظ دیگر مسلمانون مین ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدۃ الوجود پر تھی، ان شعرا نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقون سے شعائر اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے، اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے، اگر اسلام افلاس کو برا کہتا ہے تو حکیم سنائی افلاس کو اعلیٰ درجہ کی سعادت قرار دیتا ہے، اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لیے ضروری تصور کرتا ہے تو شعرائے عجم اس شعار اسلام مین کوئی اور معنی تلاش کرتے ہین، مثلاً

غازی ز پئے شہادت اندر تگ و پوست ۔۔۔ غافل کہ شہید عشق فاضل تر ازوست

در روز قیامت این بدو کے ماند ۔۔۔ این کشتۂ دشمن است وآن کشتۂ دوست

یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے نہایت عمدہ ہے اور قابل تعریف، مگر انصاف سے دیکھیے تو جہاد اسلامیہ کی تردید مین اس سے زیادہ دلفریب اور خوبصورت طریق اختیار نہین کیا جا سکتا، شاعر نے کمال یہ کیا ہے کہ جس کو اس نے زہر دیا ہے اس کو احساس بھی اس امر کا نہین ہو سکتا کہ مجھے کسی نے زہر دیا ہے، بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ مجھے آب حیات پلایا گیا ہے، آہ مسلمان کئی صدیون سے یہی سمجھ رہے ہین،[۱]

عام طور پر ایرانی شاعری کا مطالعہ ادبی حیثیت سے کیا جاتا تھا، لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس کا مطالعہ تاریخی، سیاسی اور فلسفیانہ حیثیت سے کیا، اور اس حیثیت سے ان کو معلوم ہوا کہ ایران کی صوفیانہ شاعری مسلمانون کے دور تنزل کی یادگار ہے، چنانچہ سراج الدین پال کو ایک دوسرے

[۱] اقبال نامہ صفحہ ۳۲، ۳۶، ۳۷

خط مین لکھتے ہین:

یہ حیرت کی بات ہے کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانون کے پولیٹکل انحطاط کے زمانے مین پیدا ہوئی، اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا، جس قوم مین طاقت و توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانون مین مفقود ہو گئی، تو پھر اس قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جاتا ہے، ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے، اور ترک دنیا موجب تسکین، اس ترک دنیا کے پردے مین قومین اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو جو ان کو تنازع للبقا مین ہو چھپایا کرتی ہین، خود ہندوستان کے مسلمانون کو دیکھیے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔[1]

ڈاکٹر صاحب نے تصوف کی جو مخالفت کی اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کی تعلیمات کو تاویلات فاسدہ سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے، چنانچہ بال جبریل مین فرماتے ہین:۔

احکام ترے حق ہین مگر اپنے مفسر تاویل سے قرآن کو بنا سکتے ہین پاژند

اور اس قسم کی تاویلون سے صوفیون کی تفسیرین لبریز ہین، چنانچہ ڈاکٹر صاحب ایک خط مین لکھتے ہین:

مسلمانون کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے، اور قرآن کی تفسیر مین محاورۂ عرب سے بالکل کام نہین لیتے، یہی وجہ ہے کہ اس ملک مین قناعت و توکل کے وہ معنی لیے جاتے ہین جو عربی زبان مین ہرگز نہین ہین، کل مین ایک صوفی مفسر قرآن کی ایک کتاب دیکھ رہا تھا، لکھتے ہین کہ خلق الارض والسمٰوٰت فی ستۃ ایام مین ایام سے مراد تنزلات یعنی ستہ تنزلات ہین، کمبخت کو یہ معلوم نہین کہ عربی زبان مین "یوم" کا یہ مفہوم قطعاً نہین، اور نہ ہو سکتا ہے، کہ تخلیق بالتنزلات کا مفہوم ہی عربون کے مذاق

[1] اقبال نامہ ص ۴۴ - ۴۵

اور فطرت کے مخالف ہے، اس طرح ان لوگون نے نہایت بید ردی سے قرآن اور اسلام
مین ہندی اور یونانی تخیلات داخل کر دیے ہین[1]

ان وجوہ سے انھون نے تصوف کے بعض مسائل سے اختلاف کیا، لیکن اس کو نفس تصوف
کی مخالفت پر محمول نہین کیا جا سکتا،

عقائد | اور لوگ تو یورپ جاکر اسلام اور اسلامی عقائد سے برگشتہ ہو جاتے ہین، لیکن یہ عجیب بات
ہے کہ ڈاکٹر صاحب یورپ مین جا کر ٹھیٹھ مسلمان ہو گئے، مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے کس قدر سچ
لکھا ہے کہ

مغربی تعلیم و تہذیب کے سمندر مین قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا، اس کے منجدھار
مین پہنچکر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا، اس کی گہرائیون مین جتنا اترتا گیا اتنا ہی زیادہ مسلمان
ہوتا گیا، یہان تک کہ اس کی تہ مین جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن مین گم ہو چکا ہے او
قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی نہین رہا، وہ جو کچھ سوچتا تھا قرآن کے دماغ
سے سوچتا تھا، جو کچھ دیکھتا تھا قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا،[2]

اس بنا پر انھون نے اپنے عقائد کی بنیاد تمامتر قرآن مجید پر رکھی، چنانچہ انھون نے ایک موقع
پر خود فرمایا کہ

"مین اعتقادی امور مین صرف قرآن پر انحصار رکھتا ہون"[3]

توحید | عقائد مین سب سے اہم توحید کا عقیدہ ہے، اور ڈاکٹر صاحب کے نزدیک قرآن مجید نے توحید
کا جو بلند معیار قائم کیا وہ کسی دوسری آسمانی کتاب مین نظر نہین آتا، چنانچہ انھون نے خود ایک صحبت
مین بیان کیا کہ

---

[1] اقبال نامہ ص ۱۱۱، [2] جوہر اقبال ص ۳۷، [3] البیان اقبال نمبر دسمبر ۱۹۳۹ء ص ۲۴

قرآن سے پہلے کسی ارضی یا سماوی کتاب نے انسان کو اس بلند مقام پر نہیں پہنچایا جس کی قرآن نے اطلاع دی، یہ لفظ تم قرآن کے سوا کہین نہ دیکھو گے "سخر لکم ما فی السموٰت والارض" آج تک تم جن ارضی و سماوی مہیب یا مفید ہستیون کو اپنا معبود سمجھتے رہے ہو وہ سب اور تمام دیگر کائنات تمھاری خدمت کے لیے خلق کی گئی ہے، توحید کا یہ مرتبہ اعلیٰ ماسوا سے بے پروا کر دینے والا، یہ انسانی خودی کا حقیقی عرفان قرآن سے پہلے کہین نظر نہین آتا،[1] اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ وہ شرک و بدعت اور قبر پرستی وغیرہ سے سخت بیزار ہین:

رمیدی از خداوندانِ افرنگ | ولے بر گور و گنبد سجدہ پاشی
بہ لالائی (غلامی) چنان عادت گرفتی | ز سنگ راہ مولاے تراشی

اپنے وطن کشمیر سے وہ بے انتہا محبت رکھتے ہین، لیکن کشمیریون کی جن باتون پر ان کو ترس آتا ہے ان مین ایک یہ ہے:

کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ | بتے مے تراشد ز سنگ مزارے

ڈاکٹر صاحب نے ایک نہایت دلنشین فلسفیانہ طریقہ سے توحید کی حقیقت یہ بتائی ہے کہ وجود عدم سے پیدا ہوتا ہے، مثلاً جو دانہ زمین مین بویا جاتا ہے جب وہ فنا ہو جاتا ہے تب اس مین روئیدگی اور نشو و نما کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، بعینہٖ یہی حال توحید کا ہے، کہ جب دنیا کی ہر چیز کی نفی کر دی جاتی ہے تو اس سے خدا کے وجود، خدا کی عظمت اور خدا کی وحدانیت کا عقیدہ پیدا ہوتا ہے

فضاے نور مین کرتا نہ شاخ و برگ و بر پیدا | سفر خاکی شبستان سے نہ کر سکتا اگر دانہ
نہاد زندگی مین ابتدا لا انتہا الا | پیام موت ہے جب لا ہوا الا سے بیگانہ
وہ ملت روح جس کی لا سے آگے بڑھ نہین سکتی | یقین جانو ہوا لبریز اس ملت کا پیمانہ

[1] البیان اقبال نمبر دسمبر ۱۹۳۹ء ص ۲۳

لیکن بایںہمہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اگرچہ توحید کی حقیقت فلسفیانہ ہے جو صرف دل و دماغ سے تعلق رکھتی ہے، تاہم اسلامی توحید صرف فلسفیانہ چیز نہین، بلکہ وہ ایک متفقہ عملی نظام ہے، اور عہد رسالت اور عہد صحابہ مین ایمان وعمل دونون کے مجموعے کا نام توحید تھا، چنانچہ ضرب کلیم مین فرماتے ہین،

زندہ قوت تھی جہان مین یہی توحید کبھی　　آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلہ علم کلام

روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو　　خود مسلمان سے ہے پوشیدہ مسلمان کا مقام

مین نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے　　قل ہو اللہ کی شمشیر سے خالی ہے نیام

آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملا نہ فقیہ　　وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام

قوم کیا چیز ہے قومون کی امامت کیا ہے　　اس کو کیا سمجھین یہ بیچارے دو رکعت کے امام

اس بنا پر ڈاکٹر صاحب کا مسلک محدثین کے مسلک سے ملتا جلتا ہوا ہے، جو اعمال کو جزو ایمان سمجھتے ہین؛

نبوت و رسالت ڈاکٹر صاحب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر اعتقاد ہی نہ تھا، بلکہ آپ کے ساتھ انتہا درجہ کا عشق تھا، یہی وجہ ہے کہ جب حضور کا نام مبارک یا ذکر مبارک کسی کی زبان پر آجاتا تو ان کی آنکھین بے اختیار اشک آلود ہو جاتین، ان کی زندگی کے آخری ایام کا ذکر ہے کہ "یوم اقبال" کے موقع پر مولانا اسلم صاحب جیراجپوری نیاز حاصل کرنے کے لیے گئے اور دیر تک سلسلہ گفتگو جاری رہا، اس سال وہ حج کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن بیماری اور کمزوری کی حالت یہ تھی کہ کوٹھی سے باہر نکلنا بھی مشکل تھا، کہنے لگے کہ مین دو سال سے ارادۂ سفر حج مین ہون، بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لیے ہین جو سفر سے متعلق ہین، ان مین سے کہین کہین سے کچھ سنایا بھی، مکہ سے مدینہ کی طرف روانگی کے وقت ایک غزل لکھی ہے جس مین اللہ کو مخاطب کر کے کہتے ہین:

تو باش اینجا و با خاصان بیامیز　　کہ من دارم ہوائے منزل دوست

یہ شعر سناتے ہی گریہ ایسا گلو گیر ہوگیا کہ آواز بند ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے،[۱]

ایک بار پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورہ کے لیے ڈاکٹر صاحب، سر فضل حسین مرحوم اور ایک دو اور مشہور قانون دان اصحاب کو اپنے یہاں بلایا، اور اپنی شاندار کوٹھی مین ان کے قیام کا انتظام کیا، رات کو جس وقت ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے مین آرام کرنے کے لیے گئے تو ہر طرف عیش و تنعم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پاکر معًا ان کے دل مین خیال آیا کہ جس رسول پاک کی جوتیون کے صدقے مین آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہین، اس نے بوریے پر سو سو کر زندگی گذاری تھی، یہ خیال آنا تھا کہ آنسو کی جھڑی بندھ گئی، اس بستر پر لیٹنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا، اٹھے اور برابر کے غسل خانے مین جا کر ایک کرسی پہ بیٹھ گئے، اور مسلسل رونا شروع کر دیا، جب دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا، اور ایک چارپائی اس غسل خانے مین بچھوائی، اور جب تک وہان مقیم رہے، غسل خانے ہی مین سوتے رہے، یہ وفات سے کئی برس پہلے کا واقعہ ہے،[۲]

ڈاکٹر صاحب نے ارمغان حجاز مین ایک مستقل عنوان "حضور رسالت" کا قائم کیا ہے، اور اس مین جو قطعات لکھے ہین ان سے ان کی اس عقیدت و محبت کا اندازہ ہو سکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کو تھی،

معجزات پر اعتقاد ڈاکٹر صاحب ایک حکیم اور فلسفی تھے، اس لیے شاید حدیثون کے متعلق بھی انکے دل مین کچھ شکوک و شبہات رہے ہون، لیکن نبوت پر ان کو اذعان و اعتقاد تھا اس کی وجہ سے وہ ان حدیثون کو بلا تامل قبول کر لیتے تھے جن مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی معجزہ کا ذکر ہوتا، چنانچہ سید نذیر نیازی صاحب لکھتے ہین کہ "ایک دن مجھسے حدیث رسول صلعم پہ گفتگو فرما رہے تھ

[۱] آثار اقبال ص ۹۰، ۱۹۴۶ء و ۱۹۵، [۲] جوہر اقبال ص ۳۹، ۴۰

جب حضرت ابو سعید خدریؓ کی اس روایت کا ذکر آیا کہ حضور رسالت مآب صلعم اپنے اصحابؓ کے ساتھ احد پر تشریف لے گئے اور احد کانپ اٹھا، تو حضرت علامہ کہنے لگے "یہ محض استعارہ نہین"۔ اور پھر درد کی تکلیف کے باوجود سیدھے ہوکر بیٹھ گئے، اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے رہے "یاد رکھو یہ محض استعارہ نہین"[1]

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے اس واقعہ کو نہایت موثر طریقہ پر لکھا ہے، وہ لکھتے ہین کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت کا حال اکثر لوگون کو معلوم ہے، مگر یہ شاید کسی کو نہین معلوم کہ انھون نے اپنے سارے تفلسف اور اپنی تمام عقلیت کو رسول عربی کے قدمون مین ایک متاع حقیر کی طرح نذر کرکے رکھدیا تھا، حدیث کی جن باتون پر نئے تعلیم یافتہ نہین، پرانے مولوی تک کان کھڑے کرتے ہین اور پہلو بدل بدل کر تاویلین کرنے لگتے ہین، یہ ڈاکٹر آف فلاسفی ان کے ٹھیٹھ لفظی مفہوم پر ایمان رکھتا تھا، اور ایسی کوئی حدیث سنکر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے دل مین شک کا گذر نہ ہوتا تھا، ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان کے سامنے بڑے اچنبھے کے انداز مین اس حدیث کا ذکر کیا جس مین بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب ثلاثہ کے ساتھ احد پر تشریف رکھتے تھے، اتنے مین احد لرزنے لگا اور حضور نے فرمایا کہ ٹھہر جا، تیرے اوپر ایک نبی، ایک صدیق، اور دو شہیدون کے سوا کوئی نہین ہے، اس پر پہاڑ ساکن ہوگیا"، اقبال نے حدیث سنتے ہی کہا کہ اس مین اچنبھے کی کونسی بات ہے؟ مین اس کو استعارہ و مجاز نہین، بالکل ایک مادی حقیقت سمجھتا ہون، اور میرے نزدیک اس کے لیے کسی تاویل کی حاجت نہین، اگر تم حقائق سے آگاہ ہوتے تو تمھین معلوم ہوتا کہ ایک نبی کے نیچے مادے کے بڑے سے بڑے تودے بھی لرز اٹھتے ہین، مجازی طور پر

[1] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۱۰۶۳، ۱۰۶۴

نہین، واقعی لرزاٹھتے ہین، [۱]

حیات بعد الممات | اسلام کے بنیادی عقائد مین یہ ایک اہم عقیدہ ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد ایک دوسری زندگی پیدا ہوگی جس مین اس کو اپنے اچھے اور برے اعمال کی جزا و سزا ملے گی، محدثین اور اشاعرہ اس کو جسمانی زندگی قرار دیتے ہین، اور اس جزا و سزا کو مادی سمجھتے ہین، لیکن حکماے اسلام نے اس کو روحانی زندگی قرار دیا ہے، لیکن چونکہ اس روحانی زندگی کا تخیل عام لوگون کی فہم سے بالاتر ہے اس لیے اس کو مادی طریقون سے بیان کیا گیا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان دونون کے درمیان ایک ایسی بہترین تطبیق دی ہے جس کے مطابق آخرت کی یہ دوسری زندگی جسمانی بھی ہوگی اور روحانی بھی، محدثین، اشاعرہ اور حکما مین جو اختلاف ہے اس کی بنیاد یہ ہے کہ روح اور جسم دو مختلف چیزین ہین، اس لیے ایک اس زندگی کو جسمانی اور دوسرا روحانی قرار دیتا ہے لیکن تعلیمات قرآنی کے رو سے روح وجسم کی یہ تقسیم ہی سرے سے غلط ہے، اس لیے ڈاکٹر صاحب نے اپنے فلسفیانہ مضامین مین اس نظریہ پر بہت زور دیا ہے کہ روح اور جسم کی تقسیم قرآنی تعلیم کے بالکل خلاف ہے، اور یہ پرانے مذاہب اور فلاسفہ کی غلط تعلیم کا نتیجہ ہے، قرآن کے مطابق انسان ایک فرد ہے جس مین روحانی اور جسمانی خاصیتین موجود ہین، لیکن روح اور جسم دو الگ الگ چیزین موجود نہین جن سے وہ بنا ہو، روح اور جسم کی یہی غلط تقسیم ہے جس کی وجہ سے بیسیون ناقابل حل مسئلے فلسفہ مذہب مین پیدا ہو چکے ہین، اسلام انسان کو ایک زندہ شخصیت تصور کرتا ہے، اور یہ تصور قرآن مین نہ صرف اسی ارضی زندگی کے لیے استعمال ہوتا ہے بلکہ حشر حیات بعد الممات کے لیے بھی قائم رہتا ہے، چنانچہ حیات بعد موت مین انسان کے لیے جو جزا و سزا مقرر ہے، جس کا ذکر قرآن مجید مین بار بار آتا ہے، روحانی بھی ہے جسمانی بھی، [۲]

---

[۱] جوہر اقبال ص ۱۰۰، ۱۰۳، [۲] آثار اقبال ص ۷۲، ۷۳

عقیدۂ تقدیر یا مسئلۂ جبر و اختیار

اس مسئلہ کے متعلق اسلامی فرقون مین سخت اختلاف ہے، ایک گروہ کے نزدیک انسان بالکل مجبور ہے، دنیا مین جو کچھ کرتا ہے، خدا کرتا ہے، دوسرا گروہ انسان کو فاعل مختار مانتا ہے، اور اس کو اپنے تمام افعال کا خالق قرار دیتا ہے، اشاعرہ نے درمیانی مسلک اختیار کیا ہے، یعنی انسان بذات خود فاعل مختار اور اپنے افعال کا خالق تو نہیں ہے، البتہ کاسب ہے

ڈاکٹر صاحب کا فلسفہ بالکل عملی ہے، وہ دنیا کو عمل کی دعوت دیتے ہین اور ان کے نزدیک زندگی ایک دائمی جد و جہد اور مسلسل حرکت کا نام ہے، اس لیے دوسرے گروہ یعنی معتزلہ کا مسلک ان کے عملی فلسفہ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، اور بظاہر ان کا یہی مسلک معلوم ہوتا ہے، چنانچہ وہ خود اپنے فلسفہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہین:

فعل تخلیق ہنوز جاری ہے اور جس حد تک انسان اس کائنات کے کسی غیر مربوط حصہ مین ربط و ترتیب پیدا کر سکتا ہے، اس حد تک اس کو بھی فعل تخلیق مین معاون قرار دیا جا سکتا ہے، خود قرآن مجید مین خدائے تعالیٰ کے علاوہ دوسرے خالقون کے امکان کیطرف اشارہ موجود ہے، "فتبارک اللہ احسن الخالقین"[1]

ایک سلسلہ گفتگو مین انھون نے مساعی علمائے اسلام کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ

موجودہ دنیا اپنے تمام علم و تہذیب، اور صنائع بدائع سمیت مسلمانون کی مخلوق ہے"

اس پر اظہار تعجب کیا گیا تو فرمایا

حقیقی خالق بے شک اللہ تعالیٰ ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی خالق ہو سکتے ہین جیسا کہ آیت "احسن الخالقین" سے ظاہر ہے، خدائے پاک تمام دوسرے خالقون سے احسن ہے"[2]

معتزلہ جن آیتون سے انسان کے فاعل مختار ہونے پر استدلال کرتے ہین، ان مین ایک

---

[1] نیرنگ خیال اقبال نمبر ص ۲۶۵، [2] البیان دسمبر ۱۹۳۹ء ص ۲۲

آیت یہ بھی ہے، البتہ وہ خدا کے سوا کسی اور ہستی پر خالق کے لفظ کا اطلاق نہین کرتے، اور اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے حسن ادب کا لحاظ نہین رکھا، لیکن بہرحال ڈاکٹر صاحب نے اس مسئلہ مین معتزلہ کی روش اختیار کی ہے اور اپنے اشعار مین جابجا اسی مسلک پر زور دیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ان کے نزدیک دل کی پوری کائنات یعنی علم، ارادہ اور تمنا وآرزو سب خدا کی پیدا کی ہوئی ہین، اور انہی چیزون کے ذریعہ سے انسان عمل کرتا ہے اس لیے درحقیقت انسان مجبور ہے، تاہم اس سے اختیار کو بالکل سلب نہین کر لیا گیا ہے، وہ خاک تو ہے، لیکن بالکل جماد نہین ہے، بلکہ زندہ خاک ہے، اس لیے نہ وہ مجبور محض ہے نہ مختار کل،

سراپا معنئ سربستہ ام من نگاہ حرف بافان برنتابم
نہ مختارم توان گفتن نہ مجبور کہ خاک زندہ ام در انقلابم

حدیث شریف مین ہے کہ انسان کا دل خدا کی دو انگلیون کے درمیان ہے جس کو وہ الٹتا پلٹتا رہتا ہے، غالباً ڈاکٹر صاحب کا یہ قطعہ اسی کی تشریح ہے،

اعمال وعبادات اعمال وعبادات کے لحاظ سے ڈاکٹر صاحب ایک عجیب معجون مرکب بلکہ مجموعۂ اضداد ہین، مولانا ابو الاعلیٰ مودودی جوہر اقبال مین لکھتے ہین:

اقبال کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ فقط اعتقادی مسلمان تھے عمل سے ان کو کچھ سروکار نہ تھا، اس بدگمانی کے پیدا کرنے مین خود ان کی افتاد طبیعت کا بھی بہت کچھ دخل ہے، ان مین کچھ فرقہ ملامتیہ کے سے میلانات تھے، جن کی بنا پر اپنی رندی کے اشتہار دینے مین انھین کچھ مزا آتا تھا، ورنہ درحقیقت وہ اتنے بے عمل نہ تھے، قرآن مجید کی تلاوت سے انکو خاص شغف تھا، نماز بھی بڑے خشوع وخضوع سے پڑھتے تھے، مگر چھپ کر، ظاہر مین یہی اعلان تھا کہ نرا گفتار کا غازی ہون،[۱]

اسکی ایک وجہ نو ان کی بے ریائی تھی جس کی وجہ سے نہ وہ خود مغالطہ مین رہنا چاہتے تھے اور نہ دوسرون کو مغالطہ مین ڈالنا چاہتے تھے، چنانچہ انھون نے ایک بار خود خلیفہ عبدالحکیم سے فرمایا کہ

دیکھو میرے متعلق مشکل یہ ہے کہ مجھکو ریاکاری کا فن نہین آتا، اور کبھی اگر مین نے کوشش بھی کی ہے تو کامیابی نہین ہوئی، اس لیے مین نے ریا کو بالکل چھوڑ دیا ہے،

یہی وجہ ہے کہ وہ چھوٹ موٹ کے زہد و تقوی کا رنگ اختیار نہین کرتے تھے، بعض اوقات بے تکلف رندانہ گفتگو کرتے تھے،

دوسری وجہ ان کا عالم شباب تھا، چنانچہ ایام شباب مین ان کا جو انداز تھا اس کا صحیح نقشہ انھون نے نہایت بے ریائی کے ساتھ ایک مولوی صاحب کی زبانی جو ان کے پڑوس مین رہتے تھے اس طرح کھینچا ہے،

حضرت نے مری ایک شناسا سے یہ پوچھا	اقبال کہ ہے قمری شمشاد معانی
پابندی احکام شریعت مین ہے کیسا	گو شعر مین ہے رشک کلیم ہمدانی
سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات مین داخل	مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی
کچھ عار اسے حسن فروشون سے نہین ہے	عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی
گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت	اس رمز کے ابتک نہ کھلے ہم پہ معانی
لیکن یہ سنا اپنے مریدون سے ہے مین نے	بے داغ ہے مانند سحر اس کی جوانی
مجموعہ اضداد ہے اقبال نہین ہے	دل دفتر حکمت ہے طبیعت خفقانی
رندی سے بھی آگاہ شریعت سے بھی واقف	پوچھو جو تصوف کی تو منصور کا ثانی
اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہین کھلتی	ہوگا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی

اس وعظ کو سنکر ڈاکٹر صاحب نے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ اعتراف کیا کہ

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

ایک دوسری نظم میں فرماتے ہیں:

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو رونقِ ہنگامۂ محفل بھی ہے تنہا بھی ہے

عینِ شغلِ مے میں پیشانی ہے تیری سجدہ ریز کچھ ترے مسلک میں رنگِ مشربِ مینا بھی ہے

حسنِ نسوانی ہے بجلی تیری فطرت کیلیے پھر عجب یہ ہے کہ تیرا عشق بے پروا بھی ہے

تیری ہستی کا ہے آئینِ تفنن پر مدار تو کبھی اک آستانے پر جبیں فرسا بھی ہے

ہے حسینوں میں وفا ناآشنا تیرا خطاب اے تلون کیش تو مشہور بھی رسوا بھی ہے

لیکن ان اشعار و واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایامِ شباب میں رنگینی کے ساتھ ان میں مذہبی رنگ بھی پایا جاتا تھا۔ اور یہی مذہبی رنگ ہے جو زندگی کے آخر میں ان پر غالب آگیا، چنانچہ خلیفہ عبدالحکیم صاحب لکھتے ہیں:

اقبال پر مذہبیت کا رنگ کچھ نہ کچھ شروع سے موجود تھا، جو آخر میں غالب ہو گیا لیکن یہ مذہبیت ایک خاص رنگ کی تھی وہ ملا نہیں تھے، اقبال نے ہمیشہ ملائیت سے گریز کیا ہے، وہ رند بھی تھا، فلسفی بھی تھا، صوفی بھی تھا، قلندر بھی تھا، مگر مسلمہ مفہوم کے لحاظ سے ان میں کسی صفت کا اطلاق ان پر پوری طرح نہیں ہو سکتا،

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں[1]

ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی زندگی کا یہی مذہبی اثر تھا کہ انھوں نے اسلام کے بعض پاکیزہ اصول پر ایسے ماحول میں عمل کیا، جہاں ان پر عمل کرنا موجودہ تہذیب و شائستگی کے خلاف سمجھا جاتا تھا،

[1] سب رس اقبال نمبر ص ۱۲۱، ۱۲۲

اسلامی آداب طہارت

مثلاً جب وہ پہلی مرتبہ بحیثیت ایک طالب العلم کے انگلستان گئے، تو ایک لیڈی کے مکان مین قیام کیا، ڈاکٹر صاحب کا لوٹا ساتھ تھا، اور جب وہ رفع حاجت کے لیے غسلخانہ مین جاتے تو یہ لوٹا ان کے ساتھ ہوتا، چند روز اسی طرح گذرے تو ان کی میزبان یعنی مالکۂ مکان نے پوچھا کہ یہ چیز تم غسل خانہ مین کیون لے جاتے ہو؟ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ اسلامی طہارت کا ایک قاعدہ یہ ہے، کہ قضائے حاجت کے بعد صرف کاغذ یا مٹی کے ڈھیلے کا استعمال کافی نہین ہے، بلکہ پانی سے استنجا کرنا بھی ضروری ہے، اس سلسلے مین ڈاکٹر صاحب نے ان کے سامنے طہارت اور غسل کے اسلامی اصول بیان کیے اور لیڈی صاحبہ کو ان پر عمل کرنے کی ترغیب دی، یہ باتین سنکر وہ بہت خوش ہوئین، اور فرمانے لگین کہ ضرور ایسا کرون گی مسلمانون کے یہ قواعد نہایت پاکیزہ ہین،

ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ سائنس دان اور اہل طب کو اسلامی قواعد طہارت کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیے، اور اس سلسلہ مین جو کام اہل فقہ نے کیا ہے اسے بغور پڑھنا چاہیے،

غیر ذبیحہ جانور کے گوشت سے اجتناب

یورپ مین تقریباً اس سے اجتناب ناممکن ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب نے انگلستان مین اس کے متعلق خاص احتیاط کی اور آرنلڈ صاحب سے یہ خواہش کی کہ ان کے قیام کا انتظام ایسے گھر مین کرا دیا جائے جہان ذبیحہ کا خاص انتظام ہو، یورپ مین صرف یہود اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہین، کہ صرف اپنا ذبیحہ کھائین، اس بنا پر ایک اچھے یہودی کے گھر مین انکی رہایش کا انتظام کر دیا گیا، یہ لوگ اپنی نماز بھی باقاعدہ پڑھتے تھے، اور جب ڈاکٹر صاحب گھر مین ہوتے تھے تو وہ بھی شریک نماز ہو جاتے تھے، اور ان سے کہتے تھے کہ مسلمان ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام میرے لیے بھی پیغمبر ہین اور مین ان کی روش پر چل سکتا ہون[۱]

یورپ سے واپس آنے کے بعد یہ مذہبی رنگ اور بھی پختہ ہوتا گیا، یہانتک کہ وہ ؟

[۱] آثار اقبال ص ۵۷، ۵۸

نماز، روزہ اور تہجد | تک کے پابند ہوگئے، چنانچہ ایک خط مین جو ۱۳ر اکتوبر ۱۹۱۶ء مین لکھا گیا ہے، مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کو لکھتے ہین:

صبح چار بجے، کبھی تین بجے اٹھتا ہون، پھر اس کے بعد نہین سوتا، سوائے اس کے کہ مصلی پر کبھی اونگھ جاؤن۔[1]

ایک دوسرے خط مین جو ۱۱ر جون ۱۹۱۸ء کو لکھا گیا ہے، مہاراجہ بہادر کو لکھتے ہین:

انشاء اللہ کل صبح کی نماز کے بعد دعا کرون گا، کل رمضان کا چاند یہان دکھائی دیا، آج رمضان المبارک کی پہلی ہے، بندہ روسیاہ کبھی کبھی تہجد کے لیے اٹھتا ہے، سو خدا کے فضل و کرم سے تہجد سے پہلے بھی اور بعد مین بھی دعا کرون گا، اس وقت عبادت الٰہی مین بہت لذت حاصل ہوتی ہے، کیا عجب کہ دعا قبول ہو جائے۔[2]

بعض لوگ سمجھتے ہین کہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا اکثر حصہ لاابالی پن مین گذرا، اور وفات سے صرف پانچ سات سال قبل ہی فرائض مذہبی کی تعمیل کا جوش پیدا ہوا تھا، لیکن ان خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ وفات سے بیس بائیس سال قبل ہی سے صوم و صلوٰۃ اور تہجد کے پابند تھے۔[3]

حج | فریضۂ حج کے ادا کرنے کا شوق ڈاکٹر صاحب کے دل مین اخیر عمر مین پیدا ہوا، اور روز بروز بڑھتا گیا، چنانچہ ۱۹۳۲ء مین انگلستان سے واپس آتے ہوئے جب وہ موتمر اسلامیہ مین شرکت کیلیے بیت المقدس تشریف لے گئے تو اس وقت سفر حجاز کا سامان تقریباً مکمل ہو چکا تھا، لیکن ان کے دل نے یہ گوارا نہین کیا کہ دربار رسول مین ضمناً حاضری دی جائے، اس لیے اس وقت یہ شوق پورا نہ ہو سکا، اس کے بعد ان کی علالت کا سلسلہ شروع ہوا، اور مرض کے مختلف مدوجزر کے بعد ۱۹۳۷ء

---

[1] مکاتیب شاد و اقبال ص ۱۹۱، [2] ،، ص ۸۵، حیات اقبال ص ۳۲ مین ہے کہ ایک دفعہ پورے ۲ مہینہ رات کو اٹھکر تہجد پڑھتے تھے، اور ان دنون کھانا پینا بھی چھوٹ گیا تھا، صرف شام کو تھوڑا سا دودھ پی لیا کرتے تھے، [3] مکاتیب شاد و اقبال ص ۲۰

ہین وہ اس قابل ہوجائین گے، کہ فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد مدینہ منورہ کی زیارت سے فیضیاب ہوسکین[1]
ایک خط مین جسکو انھون نے مخدوم الملک سید غلام میران شاہ کے نام ۱۱ اگست ۱۹۳۷ء کو لکھا ہے
لکھتے ہین کہ "حج بیت اللہ کی آرزو تو گذشتہ دو تین سال سے میرے دل مین بھی ہے، خدا تعالیٰ ہر پہلو
سے استطاعت عطا فرمائے تو یہ آرزو پوری ہو، اور اگر آپ رفیق راہ ہون تو مزید برکت کا باعث ہو،
عراق کی راہ جائین تو بہت سے مقدس مقامات کی زیارت ہو جاتی ہے، لیکن بغداد سے مدینہ تک
چھ سو میل کا طویل سفر ہے، جو لاری پر کرنا پڑتا ہے، صحرائی سفر بہت دشوار گذار ہے، وہان کی گورنمنٹ
کی طرف سے اطلاع اخبارون مین شائع ہوئی تھی کہ جن لوگون کی صحت اچھی نہین، وہ یہ راستہ اختیار
نہ کرین، مولوی محبوب عالم مرحوم ایڈیٹر پیسہ اخبار کی صاحبزادی فاطمہ بیگم اڈیٹر خاتون جو حال ہی
مین واپس آئی ہین وہ بھی اس راستہ کی دشواری کی تصدیق کرتی ہین، آپ ایسے باہمت جوان کے
لیے تو یہ سفر قطعاً مشکل نہین، ہمت تو میری بھی بلند ہے، لیکن بدن عاجز و ناتوان ہے، کیا عجب کہ
خداوند تعالیٰ توفیق عطا فرمائے، اور آپ کی معیت اس سفر مین نصیب کرے"

چند روز ہوئے سر اکبر حیدری وزیر اعظم حیدر آباد کا خط مجھکو ولایت سے آیا تھا جس مین وہ
لکھتے ہین کہ حج بیت اللہ اگر تمھاری معیت مین نصیب ہو تو بڑی خوشی کی بات ہے، لیکن درویشون
کے قافلہ مین جو لذت و راحت ہے وہ امیرون کی معیت مین کیونکر نصیب ہوسکتی ہے، میرے دوست
غلام بھیک نیرنگ نے بھی خطوط اپنے احباب کو بغداد مین میرے کہنے پر لکھے ہین کہ مذکورہ بالا راستہ
کے کوائف سے مفصل آگاہی ہو، ان کا جواب آنے پر آپ کو بھی اطلاع دونگا"[2]

لیکن اس سال وہ ان کی معیت مین فریضۂ حج ادا نہ کرسکے، جس پر انھون نے ایک دوسرے
خط مین جو دسمبر ۱۹۳۷ء مین لکھا گیا ہے، اظہار افسوس کیا ہے[3]، اس کے بعد انھون نے ۱۹۳۸ء مین

---

[1] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۱۰۵۵، ۱۰۵۶۔ [2] اقبال نامہ ص ۲۲۵، ۲۲۶۔ [3] ایضاً ص ۲۲۸

اس مبارک سفر کی تیاری شروع کی اور اطالوی کونسل جنرل نے انگو اطالوی کمپنی لائڈ ٹریسٹینو کے کسی جہاز مین سفر کرنے کی دعوت دی، ڈاکٹر صاحب صحت کی موجودہ حالت مین سفر کی زحمت برداشت نہین کر سکتے تھے، اس لیے وہ ہر قسم کی سہولت چاہتے تھے، اور اسی غرض سے اس کمپنی سے خط و کتابت کر رہے تھے، لیکن بااینہمہ جذ و جہد ان کو اس سال بھی یہ حالت نصیب نہین ہوئی، چنانچہ پروفیسر خواجہ عبدالحمید لکھتے ہین:

اس ملاقات سے پہلے بھی ایک دو بار مجھ سے ڈاکٹر صاحب نے سفر حجاز کے متعلق اس تجویز کا ذکر کیا تھا، انھین حج کی اسقدر لو لگی تھی کہ غالباً انتقال کے وقت انھین اسی ایک آرزو کے پورا نہ ہونے کا رنج رہا ہوگا۔[1]

ڈاکٹر صاحب اگرچہ عملی طور پر سفر حج کی برکتین حاصل نہ کر سکے تاہم انھون نے عالم خیال مین اس سفر کی تمام منزلین طے کر لین اور اس عالم مین نہایت ذوق و شوق کے ساتھ ان مین قدم رکھا

باین پیری رہِ یثرب گرفتم	نوا خوان از سرورِ عاشقانہ
سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو	کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است
قدم مستانہ زد چندانکہ گوئی	بپایش ریگ این صحرا حریر است
مہار اے ساربان او را نشاند	کہ جان او چو جان ما بصیر است
من از موج خرامش می شناسم	چو من اندر طلسم دل اسیر است
بہ خوش صحرا کہ شامش صبح خند است	شبش کوتاہ و روزِ او بلند است
قدم اے راہرو آہستہ تر نہ	چو ما ہر ذرۂ او درد مند است
غم پنہان کہ بے گفتن عیان است	چو آید بر زبان یک داستان است

[1] آثار اقبال ص ۱۰۳

مے بے پیچ و راہی خستہ و زار | چراغش مردہ و شب درمیان است

بیا اے ہمنفس باہم بنالیم | من و تو کشتۂ شانِ جمالیم

دو حرفے بر مرادِ دل بگوئیم | بپائے خواجہ چشمان را بمالیم

ارمغان حجاز مین "حضور رسالت" کے عنوان سے انھون نے جو قطعات لکھے ہین ان مین اکثر یہی جذبہ کارفرما ہے،

اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیے کہ مذہب کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے اپنی تصنیفات مین جو خیالات ظاہر کیے ہین، وہ اگرچہ فلسفیانہ ہین، لیکن عملی حیثیت سے وہ مسلمانون کے لیے صرف عقیدۂ توحید و رسالت اور نماز، روزہ اور حج اور زکوٰۃ کو کافی سمجھتے تھے، جس کے معنی یہ ہین کہ ایک مسلمان کو مسلمان بننے کے لیے فلسفہ کی ضرورت نہین، بلکہ عمل کی ضرورت ہے، چنانچہ ایک ملاقات مین حکیم محسن علی صاحب عرشی نے ان سے کہا کہ "آپ کے مدراس والے لکچر بیحد مشکل ہین، اگر اسلام یا قرآن کا منشا وہی ہے جو آپ نے ان لکچرون مین بیان فرمایا ہے، اور جس کو اس ترقی یافتہ زمانہ کے بڑے بڑے اہل علم سمجھنے سے قاصر ہین تو قرن اول کے عرب صحرا نشینون نے اسے کیا سمجھا ہوگا؟ اس کے جواب مین ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "بنی الاسلام علی الخمس کسی قوم کی تشکیل و تعمیر کے لیے اسلام کے پانچ ارکان مشہورہ کا اجرا، وانضباط کافی ہے، چنانچہ اس کی محسوس عملی صورت عہد سعادت سے بہتر کہین نظر نہین آسکتی اور تاریخ کا حافظہ اس حقیقت کو کبھی فراموش نہین کرسکتا،[1]

تلاوت قرآن | ڈاکٹر صاحب کی مذہبی زندگی کے اعمال و اشغال مین ایک نہایت موثر چیز تلاوت قرآن ہے، اوپر گذر چکا ہے کہ وہ بچپن ہی سے صبح کے وقت روزانہ قرآن مجید کی تلاوت نہایت

---

[1] البیان دسمبر ۱۹۳۹ء ص ۱۴۱

پابندی سے کرتے تھے، اور ان کے اسی ذوق و شوق کو دیکھ کر ان کے والد نے ان کو یہ نصیحت کی تھی کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن تم ہی پر اترا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہمکلام ہے، اور ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے واقعات بتاتے ہیں کہ انھوں نے اس نصیحت پر نہایت شدت سے عمل کیا، چنانچہ مولوی ابو محمد مصلح لکھتے ہیں کہ

شاعر اعظم قرآن مجید کی تلاوت کے وقت وجد میں آجاتا تھا، اقبال اپنی نظموں کو ترنم کے ساتھ پڑھا کرتے تھے، پھر یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ خدا کے کلام کو سنوار کر نہ پڑھتے، قرآن مجید کی تلاوت باواز بلند کرتے تھے جس سے ان کے قلبی جوش کا اظہار ہوتا تھا، یہ وہ وقت ہوتا تھا کہ قال حال بن جاتا تھا اور شاعر پر ایک خاص عالم طاری ہو جاتا تھا، اقبال راتوں میں جاگتے تھے، اور سحر خیزی ان کی جیتی جیز تھی، پھر قرآن کو تو ان اوقات کے ساتھ خاص لگاؤ ہے، لہذا شغف قرآن، قرآن کے نورانی صفحات ان کے سامنے کر دیتا تھا، اور یہ بلبل ہزار داستان بڑی خوش الحانی کے ساتھ تلاوت قرآن میں مصروف نظر آتا تھا، کہا جا سکتا ہے کہ اقبال حلیم شمیم تھے، مگر رقیق القلب ایسے تھے کہ دوران تلاوت میں روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں[1]

محمد اقبال سلمانی نے ڈاکٹر صاحب کی تلاوت قرآن کے متعلق ایک نہایت موثر واقعہ بیان کیا ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کی کتابیں اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری کو دیدی گئیں، ان ہی کتابوں میں ڈاکٹر صاحب کی تلاوت کا خاص قرآن از روئے وصیت ان کے لخت جگر جاوید کو ملا، اور اس مصحف کے متعلق ڈاکٹر صاحب کے خاص خاص احباب کا بیان ہے کہ وہ بلا ناغہ صبح کے وقت اسکی

---

[1] اقبال اور قرآن ص ۲۵، ۲۶

تلاوت ایسے ذوق وشوق، ایسے دردو محبت اور ایسے سوز و گداز کے ساتھ کیا کرتے تھے کہ آنسوؤن کا تار بندھ جاتا تھا، روتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے، یہان تک کہ کتاب عزیز کے ورق بھیگ جاتے، جب تلاوت ختم ہو جاتی تو اسے اٹھا کر دھوپ مین رکھدیتے تاکہ صفحے خشک ہو جائین، مدت العمر تک ان کا یہی دستور رہا، حتی کہ زندگی کے آخری دنون مین جب بیماری کا تسلط بڑھ گیا، اور گلا خراب ہو جانے کی وجہ سے آواز مین پتی لگ گئی، تو ڈاکٹرون کے روکنے پر آپ کا یہ طریق تلاوت بھی چھوٹ گیا،[1] جس کا ان کو نہایت رنج تھا، چنانچہ سید نذیر نیازی صاحب لکھتے ہین کہ "انھین غم تھا تو صرف احتباس صوت کا، بچپن ہی سے ان کی عادت تھی کہ قرآن مجید کی تلاوت بلند آواز سے کرتے، ظاہر ہے کہ اب یہ فریضہ اس رنگ مین ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا تھا، اس کا انھین بیحد قلق تھا،[2]

---

[1] البیان دسمبر ۱۹۳۹ء ص ۷۵، ۷۶، [2] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۱۰۴،

اخلاق وعادات

ڈاکٹر صاحب کے اخلاق وعادات بالکل حکیمانہ، درویشانہ اور قلندرانہ تھے، وہ اگرچہ انگریزی وضع میں رہتے تھے، لیکن ان کی طرز معاشرت میں درویشانہ اور حکیمانہ سادگی نظر آتی تھی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا ہے کہ "ان کی سادہ زندگی اور فقیرانہ طبیعت کے حالات ان کی وفات ہی کے بعد لوگوں میں شائع ہوئے، ورنہ عام خیال یہی تھا کہ جیسے اور سر صاحبان ہوتے ہیں ویسے ہی وہ بھی ہوں گے، اور اسی بنا پر بہت سے لوگوں نے یہاں تک بلاتحقیق لکھ ڈالا تھا کہ ان کی بارگاہ عالی تک رسائی کہاں ہوتی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ شخص حقیقت میں اس سے بھی زیادہ فقیر منش تھا، جتنا اس کی وفات کے بعد لوگوں نے اخبارات میں بیان کیا ہے، باہر کی دنیا ان کو سوٹ بوٹ میں دیکھا کرتی تھی، کسی کو خبر نہ تھی کہ اس سوٹ کے اندر جو شخص چھپا ہوا ہے اس کی اصلی شخصیت کیا ہے؟ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو سیاسی اغراض کے لیے سادگی و فقر کا اشتہار دیتے ہیں، اور سوشلسٹ بنکر غریبوں کی ہمدردی کا دم بھرتے ہیں، مگر پبلک کی نگاہوں سے ہٹ کر انکی تمام زندگی رئیسانہ اور عیش پسندانہ ہوتی ہے[1]"

حضرت ادیب، اے آبادی لکھتے ہیں کہ "علامہ اقبال کی شاعری، اور فلاسفی اور زندگی کا سب سے بڑا لطیفہ یہ ہے کہ جہاں ان کی شاعری اور ان کی فلاسفی سراسر مجاہدانہ اور غیر صوفیانہ ہے وہاں ان کی زندگی، سراپا صوفیانہ ہے، قوم کو خودی کی تعلیم دیتے ہیں لیکن خود بیخود طرح کے

[1] جوہر اقبال ص ۳۹، ۴۰

انسان ہین۔[۱]

مسٹر ایس۔ ایل پراشر اڈیٹر رسالہ سارنگ نے ایک بار ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی تھی، اور اس ملاقات کا جو حال انھون نے دسمبر ۱۹۳۰ء مین بزبان پنجابی اس رسالے مین شائع کیا تھا اس کا جو ترجمہ حامد علی خان نے اردو مین کیا ہے اس کے اقتباسات سے ڈاکٹر صاحب کی حکیمانہ اور درویشانہ طرز معاشرت کا اندازہ ہو سکتا ہے، وہ لکھتے ہین کہ "اسے کسی دوسری بات کی سدھ بدھ نہین، کوٹھی کا احاطہ ویرانہ سا ہو رہا ہے، کلر اور خاک دھول کی کثرت سے جگہ اجڑی اجڑی لگتی ہے، دروازے مین داخل ہوتے ہی بیریون کی ایک قطار کسی خانقاہ کے مجاور کے حجرے کی راہ دکھاتی ہے۔ صفائیون کا کس کو دھیان ہے؟ کون یہان بیٹھا گھاس پھول اگایا کرے؟ باہر کے حال کی کسی کو خبر بھی ہو۔"[۲]

ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم صاحب لکھتے ہین کہ "ان کی بے نیازی کا یہ حال تھا کہ کھانے کی فکر نہ کپڑے کی، خانہ اور اہل خانہ دونون کی طرف سے بے نیاز معلوم ہوتے تھے، ان کا زیادہ وقت مطالعہ مین گذرتا تھا، ان کے کلام مین قلندری کا جو ذکر ہے وہ شاعرانہ نہین، بلکہ حقیقت ہے جو لوگ ان کے پاس رہے ہون، وہ اچھی طرح جانتے ہین کہ کھانا ۲۴ گھنٹون مین ایک دفعہ کھاتے تھے، بہت کم سوتے تھے، سحر خیز تھے"[۳] وہ خود فرماتے ہین

زمستانی ہوا مین گرچہ تھی شمشیر کی تیزی ۔۔۔ نہ چھوٹے مجھ سے لندن مین بھی آداب سحر خیزی

سید نذیر نیازی صاحب لکھتے ہین کہ "ان کا برسون سے معمول تھا کہ رات کو صرف دودھ یا دہی پر اکتفا کرتے اور جی چاہتا تو کشمیری چائے بھی استعمال کرتے، ان کا کھانا نہایت سادہ ہوتا تھا یعنی گوشت مین پکی ہوئی سبزی، ناشتہ صرف لسی یا ایک آدھ بسکٹ اور چائے کا ہوتا،

۱؎ نیرنگ خیال اقبال نمبر ص ۲۲۵، ۲۴۶، ۲۴۷ ۔ ۲؎ آثار اقبال ص ۷۴ ۳؎ سب رس اقبال نمبر ص ۱۲۲، ۱۲۳،

اور وہ بھی روزمرہ نہین، خوراک کی مقدار بھی کم تھی، اور اس کا اہتمام اس سے بھی کم، آخری دنوں مین جب بچون کی حیرہ مین اتالیق آگئی تو ان کی تربیت کے خیال سے میز کرسی کا انتظام کیا گیا، یہ چیزین موجود تو تھین، مگر اتفاقی ضروریات کے لیے' اور حضرت علامہ بھی ان کے ساتھ کھانے مین شریک ہونے لگے، مگر پھر دو ہی تین دن مین اپنی عادت سے مجبور ہو جاتے، فرماتے "علی بخش میرا کھانا الگ لے آؤ" علی بخش پانی اور چلمچی لیے کمرے مین داخل ہوا حضرت علامہ لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھے اور وہین پلنگ پر نشست جمالی، تولیہ یا رومال زانوں پر ڈال لیا، علی بخش نے کھانے کی کشتی سامنے رکھ دی، احباب مین سے اگر کوئی صاحب بیٹھے ہین تو انھون نے "آپ بھی آئیے" کہکر کھانا شروع کر دیا، ہاں اگر کھانے کے بعد پھل آگئے تو وہ باصرار ہر شخص کو ان مین شریک کر لیتے۔

لیکن وہ ایک درویش، قلندر اور حکیم ہی تھے، راہب نہ تھے، اس لیے ان کے کھانے پینے مین گو تکلف یا اہتمام کو کوئی دخل نہ تھا، مگر ان کی رائے تھی کہ جو چیز بھی کھائی جائے خوش مذاقی سے کھائی جائے، اس کا ذائقہ عمدہ ہو، رنگ اور بو خوشگوار ہو، ترشی اور سرخ مرچ انھین بہت پسند تھی، پھلوں مین آم کے تو وہ گویا عاشق تھے، غذاؤن مین کباب اور بریانی خاص طور سے مرغوب تھی، فرمایا کرتے تھے "یہ اسلامی غذا ہے"[1]

وضع ولباس

ابتدا مین وہ شلوار اور کرتہ پہنتے تھے، سر پر سفید پگڑی ہوتی تھی یا لنگی، ولایت جاکر انھین انگریزی لباس بھی پہننا پڑا، لیکن ولایت سے آنے کے بعد وہ عام طور پر شلوار، قمیص اور فراک کوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی پہنتے تھے، کبھی کبھی کوٹ پتلون پہن لیتے تھے تو اس کے ساتھ بھی ہیٹ کی جگہ ترکی ٹوپی ہوتی تھی، ان کی باتون سے معلوم ہوتا تھا کہ انھین انگریزی لباس پسند نہین، چنانچہ مرنے سے کچھ عرصہ پہلے ایک دن اپنے صاحبزادہ جاوید اقبال سے لباس کے متعلق گفتگو کی اور فرمایا کہ

---

[1] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۱۰۲۷، ۱۰۲۸

"مجھے شلوار پتلون سے زیادہ پسند ہے" [1]

استغنا، و خودداری

اسی درویشانہ، حکیمانہ اور قلندرانہ زندگی نے ان کو نہایت مستغنی، بے نیاز اور خوددار بنا دیا تھا، چنانچہ ایک بار پنجاب مین یہ تحریک شروع ہوئی کہ دو لاکھ کی رقم جمع کرکے انکی خدمت مین پیش کی جائے، تاکہ وہ فکرِ معاش سے آزاد ہو کر کلیتہً شعر و سخن کی طرف متوجہ ہو سکین، اخبارون مین بھی اس کا چرچا ہونے لگا، لیکن انھون نے اس تحریک کی سخت مخالفت کی، اور فرمایا "اول تو میری خودداری مجھے ہرگز اس بات کی اجازت نہین دیتی کہ غریب قوم کی جیب پر ایسی رقم کا بوجھ ڈالون، دوسرے یہ کہ ہر شاعر، ادیب اور آرٹسٹ کا فن اُس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک وہ زندگی کی تگ و دو مین شریک ہے، جو لوگ دنیا کے ہنگامے سے کٹ کر گوشۂ عافیت اختیار کر لیتے یا بغیر مشقت کے آرام و راحت کی زندگی بسر کرنا شروع کر دیتے ہین وہ اُس الہام سے محروم ہو جاتے ہین جو صرف زندگی کے اتار چڑھاؤ مین براہ راست شریک ہونے سے حاصل ہو سکتا ہے، ایک آرٹسٹ کا نقطۂ نگاہ اور نصب العین عوام کے نقطۂ نگاہ اور نصب العین سے مختلف ہوتا ہے، اس ندرت و ذوقِ نظر کے باعث فرد اور سوسائٹی مین تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے، اور بعض اوقات اس تصادم سے ایسی چنگاریان پھوٹتی ہین جن سے آرٹسٹ کا فن حیاتِ تازہ حاصل کر لیتا ہے، یہ صحیح ہے کہ میرے اوقات کا بیشتر حصہ فکرِ معاش اور دنیوی مکروہات مین ضائع ہو جاتا ہے، لیکن یہ بھی درست ہے کہ اگر مین زندگی کی کشمکش سے علیحدہ ہو جاؤن تو میری شاعری بھی اس تڑپ سے محروم ہو جائے گی جس کا سب سے بڑا منبع خود زندگی ہے" [2]

ڈاکٹر صاحب کی خودداری کے امتحان و آزمایش کا سب سے زیادہ سخت وقت ان کی اخیر زندگی مین پیش آیا، جس مین طویل علالت کی وجہ سے ان کو اپنا معمولی پیشہ وکالت چھوڑ دینا پڑا،

---

[1] حیات اقبال ص ۱۲۷ [2] رسالہ ادبی دنیا اگست ۱۹۴۷ء ص ۱۲

اس زمانے کے متعلق سید نذیر نیازی نے لکھا ہے کہ "یہ زمانہ حضرت علامہ کے لیے بڑی پریشانی کا تھا، وکالت کا سلسلہ بند ہوئے تین چار سال گذر چکے تھے، ان کی زندگی مین کسبِ مال اور حصول منصب کی ہزارون شکلین پیدا ہوئین، لیکن ان کی استغنا پسند اور فقیرانہ طبیعت نے غیرت و خودداری مین آنکھ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہ دیکھا، وہ کسی قسم کے احسان اور منت پذیری یا غرض جوئی کو تصور مین بھی برداشت نہین کر سکتے تھے، حقیقت مین یہ ملت کی بڑی خوش قسمتی تھی کہ اس نازک موقع پر اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے محض اپنے تعلق خاطر اور خدمت اسلامی کے جذبہ مین خود اپنی جیب سے حضرت علامہ کا ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا، تاکہ وہ حسب خواہش قرآن مجید کے حقائق و معارف پر قلم اٹھا سکین، اس کے بعد اگرچہ متعدد ذرائع سے کوششین ہوئین کہ حضرت علامہ مزید وظائف قبول کرین، مگر انھون نے ہمیشہ انکار کر دیا، اور یہی کہا کہ 'مین ایک فقیر آدمی ہون، مجھے جو کچھ اعلیٰ حضرت دیتے ہین میری ضروریات کے لیے کافی ہے'۔"[1]

وہ خود ایک خط مین سر راس مسعود مرحوم کو لکھتے ہین کہ

اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کی پنشن قبول کرنے کے بعد کسی اور طرف نگاہ کرنا آئین جوانمردی نہین ہے۔[2]

ان کو ایک دوسرے خط مین لکھتے ہین:

اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لیے مقرر فرمائی ہے وہ میرے لیے کافی ہے، اور اگر کافی نہ بھی ہو تو مین کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہین، بہترین مسلمانون نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے، ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپیہ کا لالچ ہے، جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایان شان نہین ہے۔[3]

---

[1] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۱۰،۱۱ [2] اقبال نامہ ص ۳۶۸ [3] ایضاً ص ۳،۴

یہ وہ موقع ہے جب ہز ہائینس سر آغا خان نے ان کا وظیفہ مقرر کرنا چاہا ہے اور ان کو اس وظیفہ کے قبول کرنے میں تذبذب و تامل ہوا ہے،

اسی علالت کے زمانہ میں حیدر آباد میں یوم اقبال منایا گیا، اور اس سیسلے میں ان کی خدمت میں ایک چک بھیجا گیا، لیکن انھوں نے یہ کہکر واپس کر دیا کہ شاید آپ لوگون نے مجھے نہین سمجھا،[1] یہ چک ایک ہزار کا تھا، اور توشہ خانہ حضور نظام کی طرف سے جو صدر اعظم بہادر کے ماتحت ہے بطور تواضع بھیجا گیا تھا، اس کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے چند اشعار کی ایک نظم بھی لکھی جو ارمغان حجاز مین درج ہے:

تھا یہ اللہ کا فرمان کہ شکوہ پرویز	دو قلندر کو کہ ہین اس مین ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر	حسن تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
مین تو اس بار امانت کو اٹھاتا سردوش	کام درویش مین ہر تلخ ہے مانند نبات
غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول	جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

فیاضی تمام لوگ امرا، و سلاطین سے مال و دولت کی توقع رکھتے ہین، لیکن ڈاکٹر صاحب خود اپنا ذاتی سرمایہ امرا، و سلاطین کی نذر کرنا چاہتے تھے، چنانچہ مرحوم نادر شاہ جب لاہور کے راستہ سے افغانستان کو جا رہے تھے تو ڈاکٹر صاحب اسٹیشن پر ان کی ملاقات کو گئے، اور ان کو علحدہ لے جا کر کہا کہ "آپ جس مہم کو جا رہے ہین، اس کے لیے آپ کو روپیہ کی تو ضرورت نہین" چونکہ نادر شاہ کو معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحب خود کوئی دولت مند آدمی نہین ہین، اس سوال سے متعجب ہوئے، اور جواب دیا کہ "تم خود ایک غریب آدمی ہو اور مین تم سے روپیہ لینا نہین چاہتا،" ڈاکٹر صاحب نے کہا "مین بے شبہہ غریب ہون لیکن مجھے یقین ہے کہ میرے پاس آپ سے زیادہ روپیہ ہے، آپ مجھے بتا سکتے ہین کہ آپ کے پاس کسقدر روپیہ ہے"؟ نادر شاہ نے اقرار

[1] سب رس اقبال نمبر ص ۴۴

کیا کہ درحقیقت ان کے پاس بہت تھوڑے سے روپے ہین، اس پر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ "میرے پاس پانچ ہزار روپے ہین، اگر آپ چاہین تو اس کو لے سکتے ہین"[1]

ڈاکٹر صاحب کو مطالعہ کا بیحد شوق تھا، اور اس غرض سے فارسی، عربی اور یورپین زبانون کی بکثرت کتابین جن کی تعداد پانچسو سے زائد ہوگی جمع کی تھین، لیکن وفات کے وقت یہ وصیت کر گئے کہ یہ تمام کتابین اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری کو دیدی جائین، چنانچہ جون ۱۹۳۹ء کو اس وصیت کے مطابق پانچسو سے زائد کتابین کالج کی لائبریری مین منتقل کردی گئین،[2]

وطن کی محبت وطن کی محبت کا ایک تو سیاسی تخیل ہے، جو دوسرے ملکون اور دوسری قومون سے بغض و نفرت اور رشک و رقابت کا جذبہ پیدا کرتا ہے، اور ڈاکٹر صاحب اس قسم کی وطنیت کے سخت مخالف تھے، لیکن اس کے ساتھ ہر شخص کا ایک خاص مولد و منشا ہوتا ہے جو ایک محدود رقبۂ زمین سے تعلق رکھتا ہے، اور اس سے اس کو فطری لگاؤ ہوتا ہے، اور اسی فطری لگاؤ کا نام وطن کی محبت ہے، جو ایک نہایت شریفانہ اخلاقی بلکہ فطری جذبہ ہے، جس سے کسی شریف آدمی کا دل خالی نہین ہوسکتا، حضرت بلالؓ مکہ مین اس قدر ستائے گئے تھے تاہم ان کو جب مکہ یاد آتا تھا تو روتے تھے اور پکار کر یہ اشعار پڑھتے تھے:

الا لیت شعری ہل ابیتن لیلۃ   بواد وحولی اذخر وجلیل

آہ کیا کبھی پھر وہ دن آسکتا ہے کہ مین مکہ کی وادی مین ایک رات بسر کرون اور میری گرد اذخر و جلیل ہون، (مکہ کی دو گھاسون کے نام)

وہل اردن یوماً میاہ مجنۃ   وہل یبدون لی شامۃ و طفیل

اور کیا وہ دن بھی ہوگا کہ مین مجنہ کے چشمے پر اترون، اور شامہ و طفیل (مکہ کے دو پہاڑ) مجھکو دکھائی دین،

ڈاکٹر صاحب کا آبائی وطن کشمیر تھا، اور وہ کشمیر کی محبت کا ایسا پاک جذبہ اپنے دل مین رکھتے

---

[1] اقبال ہز آرٹ اینڈ تھاٹ ص ۲۵ [2] البیان دسمبر ۱۹۳۹ء ص ۶

تھے، اور مختلف طریقون سے اس کا اظہار کرتے تھے، وہ انگلستان سے واپس آئے تو پہلے کشمیری انجمن کے اور اس کے بعد آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس کے سکریٹری مقرر ہوئے، اسی زمانے مین ظفروال کے ایک تحصیلدار نے ایک مقدمہ مین کشمیریون کے متعلق مفسد اور بہادر کے لفظ لکھے واقعہ یہ تھا کہ دس بارہ آدمیون نے تین کشمیریون پر مارپیٹ کا دعویٰ کیا، تحصیلدار نے فیصلہ مین لکھا کہ بظاہر یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ دس بارہ آدمی تین آدمیون سے کس طرح مار کھا سکتے ہین لیکن عام طور پر چونکہ کشمیری مفسد اور بہادر ہوتے ہین اس لیے اگر ان تین کشمیریون نے اپنے سے چوگنی تعداد کے حریفون کو زخمی کر دیا ہو تو تعجب کی کوئی وجہ نہین، ایک منچلے کشمیری نے اس فیصلہ کی مصدقہ نقل لے کر کانفرنس کے دفتر مین بھیجی کہ اس تحصیلدار نے ہم کو مفسد قرار دیا ہے، اس پر ہتک اور توہین کا مقدمہ قائم ہونا چاہیے، ڈاکٹر صاحب سکریٹری تھے، انھون نے فرمایا کہ تحصیلدار نے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہے، جو قوم بہادر ہے وہ ضرور مفسد ہے، اور جو مفسد ہے وہ بہادر اور دلیر ہے، اس فیصلہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا کشمیریون کی طرف سے نہین تھی اسلئے وہ کا تفسد وافی الارض کے ذیل مین نہین آسکتے، بلکہ انھون نے قومی غیرت سے کام لیکر اپنی مدافعت کی ہے،

اسی محبت کے تقاضے سے کشمیر کی علمی اور تاریخی حیثیت کو نمایان کرنے کی کوششون کو نہایت پسند کرتے تھے، منشی محمد الدین فوق اڈیٹر اخبار کشمیری لاہور نے کشمیر کے متعلق جسقدر کتابین لکھین ان کو ڈاکٹر صاحب نے بہت پسند کیا، اور ان کی اخباری خدمات اور تصنیفات متعلقہ کشمیر کی وجہ سے ان کو مجدد الکشامرہ کا خطاب دیا[۱]،

ظہور الدین صاحب مہجور نے تذکرہ شعرائے کشمیر لکھنے کا ارادہ کیا، تو ڈاکٹر صاحب نے

---

[۱] نیرنگ خیال اقبال نمبر ص ۴۹، ۵۰،

ان کی حوصلہ افزائی کی، اور ان کو مفید مشورے دیے، چنانچہ ان کو ایک خط مین لکھتے ہین:

مجھے یہ معلوم کرکے کمال مسرت ہوئی کہ آپ تذکرۂ شعرائے کشمیر لکھنے والے ہین،
مین کئی سالون سے اس کے لکھنے کی تحریک کر رہا ہون، افسوس کہ کشمیر کا لٹریچر تباہ ہو گیا،
اس تباہی کا باعث زیادہ تر سکھون کی حکومت اور موجودہ حکومت کی لاپروائی اور نیز مسلمانون
کی غفلت ہے، کیا یہ ممکن نہین کہ کشمیر کے تعلیم یافتہ مسلمان اب بھی موجودہ لٹریچر کی حفاظت
کے لیے ایک سوسائٹی بنائین؟ تذکرۂ کشمیر لکھتے وقت مولانا شبلی کی شعر العجم آپ کے پیش نظر
رہنی چاہیے، محض حروف تہجی کی ترتیب سے شعراء کا حال لکھدینا کافی نہ ہوگا، کام کی چیز یہ ہے
کہ آپ کشمیر مین فارسی شعر کی تاریخ لکھین، مجھے یقین ہے کہ ایسی تصنیف نہایت بارآور
ثابت ہوگی، اگر کبھی خود کشمیر مین یونیورسٹی بن گئی تو فارسی زبان کے نصاب مین اس کا
کورس ہونا یقینی ہے[1]

ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی نظمین زیادہ تر کشمیر ہی سے تعلق رکھتی ہین، ان مین چند رباعیان
جو انھون نے اپنے زمانۂ طالب العلمی مین لکھی تھین اور وہ مطبوعہ کلام مین شامل نہین ہین،
منشی محمد الدین فوق نے نیرنگ خیال اقبال نمبر صفحہ ۲۰ مین درج کی ہین:

کہکشان مین آکے اختر مل گئے — اک لڑی مین آکے گوہر مل گئے
واہ وا کیا محفل احباب ہے — ہم وطن غربت مین آکر مل گئے

موتی عدن سے، لعل ہوا ہے یمن سے دور — یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستان مین آئے ہین کشمیر چھوڑ کر — بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

سامنے ایسے گلستان کے کبھی گر نکلے — جیب خجلت سے سر طور نہ باہر نکلے

---

[1] اقبال نامہ ص ۵۸، ۵۹

ہے جو ہر لحظہ تجلی گہ مولائے جلیل   عرش و کشمیر کے اعداد برابر نکلے

کشمیر کی زبون حالی پر ان کا دل جلتا تھا، اور اس کی غربت و فلاکت پر آنسو بہاتے تھے، ایک بار کشمیر تشریف لے گئے تو نشاط باغ کی نشاط انگیزیوں کی حالت مین اہل کشمیر کی المناک حالت کا منظر نگاہوں کے سامنے پھر گیا اور یہ دردانگیز اشعار ان کے قلم سے نکلے :

کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ   بتے می تراشند ز سنگ مزارے

ضمیرش تہی از خیال بلندے   خودے ناشناسے ز خود شرمسارے

بریشم قبا خواجہ از محنت او   نصیب تنش جامۂ تار تارے

نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے   نہ در سینۂ او دل بیقرارے

ارمغان حجاز کے آخر مین بھی متعدد نظمین کشمیر کے متعلق ہین، انہی مین ایک پر درد شعر یہ ہے :

سرما کی ہواؤن مین ہے عریان بدن اسکا   دیتا ہے ہنر جس کا امیرون کو دوشالا

کشمیر سے نکلنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کے آبا و اجداد نے پنجاب مین قیام کیا اور وہی ڈاکٹر صاحب کا پیدائشی وطن قرار پایا، اس لیے وہ پنجاب سے بھی بیحد محبت رکھتے تھے، اور اس کو ہر قسم کا فائدہ پہنچانا چاہتے تھے، چنانچہ ایک بار اورنٹیل کالج لاہور مین ہیڈ پرشین ٹیچر کی جگہ خالی ہوئی تو اس کیلیے ڈاکٹر صاحب نے مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھا کہ اگر آپ پسند فرمائین تو آپ کے لیے کوشش کی جائے، آپ کا لاہور مین رہنا پنجاب والون کے لیے بیحد مفید ہوگا، لیکن انھون نے انکار کیا تو انکو لکھا کہ

مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ ملازمت کوئی قبول نہ کرینگے، لیکن سنڈیکیٹ کے بعض ممبرون کی تعمیل ارشاد مین آپ کو لکھنا ضرور تھا، کسی قدر خود غرضی کا شائبہ بھی میرے خط مین تھا، اور وہ یہ کہ مین چاہتا تھا کہ جس طرح پنجاب والون کو صوبہ متحدہ کے علما، و فضلا سے اس سے بیشتر فائدہ پہنچا ہے، اب بھی وہ سلسلہ آپ کے یہان رہنے سے بدستور جاری رہے، [1]

[1] اقبال نامہ ص ۵۵

مولانا شبلی مرحوم کی زندگی مین مین نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح مولانا مرحوم پنجاب مین مستقل طور پر اقامت گزین ہوجائین، مگر مسلمان امرا مین مذاق علمی مفقود ہوچکا ہے، میری کوشش بار آور نہ ہوئی، [1]

سیالکوٹ ان کا اصلی وطن تھا، اس لیے ان کو سیالکوٹ کی علمی حیثیت پر بھی فخر تھا، چنانچہ ایک بار سیالکوٹ کے مردم خیز ہونے کا ذکر آیا، تو اس کی تصدیق کے لیے انھون نے تاریخ سے ایسے کئی باکمالون کے نام گنوائے جو اس سرزمین سے اٹھے تھے، [2]

سیالکوٹ کے فخر و غرور کے لیے ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کا نام کافی خیال کیا جاتا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب کو صرف اسی پر قناعت نہ تھی، اس لیے انھون نے تاریخ سے اور بھی چند باکمالون کے نام ڈھونڈھ نکالے،

اگرچہ پان اسلامزم کے مبلغ ہونے کی حیثیت سے ان کا عقیدہ یہ تھا کہ "مسلم ہین ہم، وطن ہے سارا جہان ہمارا"، تاہم اس کا مطلب یہ نہین کہ وہ ہندوستان سے جو ان کا پیدائشی ملک تھا، محبت نہین رکھتے تھے، انھون نے "شعاعِ امید" کے نام سے جو دلپذیر نظم لکھی ہے، اس مین ہندوستان کی محبت کا اظہار خاص طور پر کیا ہے،

لطف صحبت ڈاکٹر صاحب باوجود شاعر اور حکیم ہونے کے تنہائی پسند اور خلوت نشین نہین تھے بلکہ جب ان کا قیام میکلوڈ روڈ والی کوٹھی مین تھا اور صحت اچھی تھی تو تقریباً روزانہ شام کو ان کے دولتکدہ پہ محفل جمتی تھی، جس مین ہر مذاق کے لوگ شریک ہوتے تھے، زمانہ علالت مین بھی جبکہ وہ جاوید منزل مین اٹھ آئے تھے، یہی حال تھا، صبح سے دوپہر تک لوگ آتے جاتے رہتے تھے، اور شام کا وقت بھی اسی طرح گذر جاتا تھا، البتہ دوپہر سے چار بجے تک کا وقت تنہائی کا ہوتا تھا، اور اس مین ڈاکٹر صاحب

[1] اقبال نامہ ص ۴۷، [2] آثار اقبال ص ۱۷

سخت تکلیف محسوس کرتے تھے، پڑھنا بند ہوچکا تھا، موسیقی سے بے شبہہ طبیعت بہل سکتی تھی، لیکن ہندوستانی موسیقی بہت الم انگیز اور پژمردہ ہے، اس لیے ڈاکٹر صاحب کی زندہ دلی کے لیے موزون نہ تھی۔[1]

ان صحبتون اور ملاقاتون کا حال متعدد اشخاص نے لکھا ہے، اور ان کے پڑھنے سے ڈاکٹر صاحب کے محاسن اخلاق، مذاق طبیعت، اور سیرت وکردار کے بہت سے گوشون پر روشنی پڑتی ہے، سید نذیر نیازی لکھتے ہین کہ "حضرت علامہ کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا تھا، اور ان کی سادگی پسند اور بے ریا طبیعت نے امیر، غریب، اپنے، بیگانے سب کو ایک نظر سے دیکھا، ان کے در دولت پر کبھی فرقِ مراتب یا امتیازات کا سوال ہی پیدا نہین ہوا، معلوم نہین لوگ کہان کہان سے آتے اور کیا کیا خیالات اپنے دل مین لے کر آتے، ان مین عامی بھی ہوتے اور جاہل بھی، اور ان کے ساتھ پڑھے لکھون کو بھی شریک محفل ہونا پڑتا، لیکن حضرت علامہ جب کسی سے ملتے بغیر کسی تکلف اور احساس عظمت کے ملتے، بسا اوقات وہ اپنے ملنے والون کی گفتگوؤن سے ایک طرح کا ذاتی تعلق پیدا کر لیتے، لہٰذا علامہ کی صحبت سے جو شخص اٹھتا ان کے انکسار، رواداری اور وسعت وکشادہ دلی کا ایک گہرا نقش لے کر اٹھتا،"[2]

علالت کے آخری زمانے مین بھی جب ان کو زیست سے مایوسی ہوچکی تھی، ان کے اخلاق عالیہ اور کمال وضعداری کا یہ عالم تھا کہ ان کے معمول اور روزمرہ زندگی مین انتہائی تکلیف کے باوجود کوئی فرق نہ آیا، وہ اپنے ملنے والون سے اسی خندہ پیشانی اور تپاک سے ملتے جس طرح تندرستی مین ان کا شیوہ تھا، بلکہ اب انھون نے اس بات کا اور بھی زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا تھا، کہ ان کی تواضع اور خاطرداری مین کوئی فروگذاشت تو نہین ہوئی،[3]

ڈاکٹر صاحب کا طریقۂ گفتگو نہایت دلآویز تھا، وہ ہر شخص کے مذاق کے مطابق گفتگو کرتے

---

[1] آثار اقبال ص۔ [2] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۱۰۵۱، [3] ایضاً ص ۱۰۶۸

تھے، اور ہر موضوع پر کرتے تھے، ان کی گفتگو رکیک و مبتذل الفاظ طنز و تشنیع اور ذاتیات کے حملے سے خالی ہوتی تھی، اور اس مین کسی قدر ظرافت کی چاشنی بھی پائی جاتی تھی، لیکن اس مین تصنع کو دخل نہ تھا بلکہ وہ ایک فطری چیز تھی جو آخیر دم تک قائم رہی،[1]

ڈاکٹر صاحب دوسری گول میز کانفرنس کے لیے انگلستان جا رہے تھے، تو حسن اتفاق سے ڈاکٹر قاضی عبد الحمید صاحب کا ساتھ بھی ہو گیا، اور ہر موضوع پر گفتگو ہوئی، انھون نے انکی گفتگو اور لطف صحبت کے چند واقعات لکھے ہین، جس سے اس اجمالی بیان کی تشریح ہوتی ہے، وہ لکھتے ہین کہ اس عرصے مین غالباً دنیا کا کوئی ایسا مسئلہ نہین ہے جس پر علامہ مرحوم سے تبادلۂ خیالات نہ ہوا ہو، معمولی سے معمولی اکل و شرب کے مسائل سے لے کر مشکل سے مشکل مابعد الطبیعیاتی مسائل تک زیر بحث آگئے، اور ہر چیز پر علامہ مرحوم کی وسیع معلومات اور ایک خاص زاویۂ نگاہ دیکھکر مین متحیر ہو جاتا تھا، ایک مرتبہ کھانون کا ذکر آیا، تو اس سلسلے مین انھون نے بارہوین صدی ہجری مین مرکز ایشیا مین جو کھانے رائج تھے اور وہان جو مختلف قسم کے پھل ہوتے تھے اس کا تذکرہ کیا، اور بے انتہا کھانون کے نام گنوا دیے، مین ان کا غیر معمولی حافظہ دیکھکر متحیر ہو گیا، وہ حد درجہ سادگی سے گفتگو فرما رہے تھے، وہ اپنے ساتھی کو اس کا احساس نہین ہونے دیتے تھے، کہ وہ ایک بہت ہی بڑے عالم و فاضل کی معیت مین ہے، مخاطب کو مانوس اور اپنی خاکساری کے ظاہر کرنے کے لیے وہ ان سے اس قسم کے سوالات کرتے تھے کہ وہ گویا اس سے مستفید ہو رہے ہین،[2]

ظرافت اگرچہ ان کی طبعی چیز تھی لیکن اس مین بھدا پن اور چھچھورا پن نہین پایا جاتا تھا، بلکہ ایک خاص ندرت، ذہانت اور لطافت پائی جاتی تھی، اور وہ اس کے ذریعہ سے بہت سے اہم مسائل کو بھی حل کر دیتے تھے، ایک بار کشمیری خاندان کے ایک شخص کا ٹھیاواڑ کے کسی خاندان

---

[1] اقبال ہز آرٹ اینڈ تھاٹ ص ۲۳ [2] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷

ہین شادی کرنا چاہتے تھے، لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان کو منع کر دیا، اور کہا کہ پنجاب کی کشمیری برادری سے باہر شادی نہ کرین، اس پر ایک نوجوان طالب العلم نے اعتراض کیا کہ آپ تو ہمیشہ کہا کرتے ہین کہ مسلمانون کو ذات پات کی تمیز مٹا دینی چاہیے، کیونکہ ہماری ذات صرف اسلام ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہنسکر جواب دیا، یہ تو بالکل صحیح ہے، لیکن خواجہ ...... اگر وہان شادی کرلین تو ان کی اولاد بھی کالی کلوٹی ہو گی، اور اس طرح اس خاندان سے وہ صباحت رخصت ہو جائے گی جو کئی پشتون سے اس کی خصوصیت چلی آرہی ہے، مین تو چاہتا ہون کہ مسلمانون کے بچے نہایت خوشرو اور سرخ و سپید ہون تا کہ ہم لوگ صحیح معنی مین ملت بیضا بن جائین"، اس لطیفہ پر بے اختیار قہقہہ بلند ہوا، اور دیر تک محفل مین خوش طبعی کی رو جاری رہی [1]

ایک روز ہندوستانی مذاہب پر گفتگو کر رہے تھے، بدھ مت کا ذکر آگیا، تو فرمانے لگے، انگلستان مین طالب العلمی کے زمانہ مین مجھے ہر روز شام کے وقت اپنی قیام گاہ کی طرف ریل گاڑی مین سفر کرنا پڑتا تھا، یہ گاڑی ایک جگہ ختم ہوتی تھی اور سب مسافرون کو سامنے والے پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی مین سوار ہونا پڑتا تھا، گاڑی جب اسٹیشن پر پہنچی تو گارڈ بلند آواز سے پکارتا "آل چینج (یعنی سب بدل جاؤ) ایک روز حسب معمول گاڑی مین بیٹھا تھا کہ میرے ارد گرد اخبار بین مسافر آپس مین بدھ مذہب کے متعلق باتین کرنے لگے، ایک صاحب نے میری طرف اشارہ کرکے کہا یہ صاحب غالباً ایشیائی ہین، ان سے بدھ مذہب کے متعلق پوچھنا چاہیے، چنانچہ مجھ سے پوچھا گیا، مین نے کہا ابھی جواب دیتا ہون یہ کہکر چپ رہا، چند منٹون کے بعد انھون نے مجھ سے دوبارہ پوچھا، مین نے پھر کہا ابھی جواب دیتا ہون، وہ کہنے لگے شاید آپ جواب سوچ رہے ہین، مین نے کہا ہان، اس دوران مین اسٹیشن آگیا، اور گارڈ "آل چینج یعنی سب بدل جاؤ" پکارنے لگا، مین نے کہا "بس یہی بدھ مذہب ہے، یعنی مسئلہ تناسخ

[1] آثار اقبال ص ۴۶، ۴۷

جو بدھ مذہب کا بنیادی عقیدہ ہے،

کیمبرج کے زمانہ مین چند ہمعصرون سے مذہب پر بحث چھڑ گئی، ایک صاحب پوچھنے لگے، مسٹر اقبال یہ کیا بات ہے کہ جتنے بھی پیغمبر اور بانیان مذہب دنیا مین آئے وہ بلا استثنا ایشیا مین مبعوث ہوئے، یورپ مین ایک بھی پیدا نہین ہوا، ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا، بھئی شروع شروع مین اللہ میان اور شیطان نے اپنا اپنا پیترا جمالیا، اللہ میان نے ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو، اس لیے پیغمبر جو اللہ میان کی طرف سے آئے ہین، ایشیا مین مبعوث ہوئے، وہ صاحب بول اٹھے تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے؟ اونھون نے جواب دیا "یہ تمھارے میکا یولی اور مشہور اہل سیاست اس کے رسول ہین" اس پر بہت قہقہہ پڑا،[1]

ان تمام واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نہایت سادگی پسند، مستغنی المزاج، فیاض، زندہ دل، شگفتہ مزاج اور شریف انسان تھے، ڈاکٹر صاحب نے اپنی بعض نظمون مین بھی اپنے بعض محاسن اخلاق کی طرف اشارے کیے ہین، جس سے ان کے شریفانہ کیرکٹر کا اندازہ ہوتا ہے،

آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند	پرسوزو نظر باز و نکو بین و کم آزار
کیا چھینے گا غنچہ سے کوئی ذوقِ شکر خند	ہر حال مین میرا دلِ بے قید ہے خرم
کہ چرچا بادشاہون مین ہے تیری بے نیازی کا	کہان سے تونے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی

ان کے کلام مین اس قسم کے اور بھی بہت سے اشعار نکل سکتے ہین جن سے انکے اخلاق و عادات پر روشنی پڑتی ہے یہ ڈاکٹر صاحب کی بے ریائی اور نیک نفسی ہے کہ انھون نے اپنے اُن اخلاق کو بھی بہ تصریح بیان کر دیا ہے جو قابل اعتراض سمجھے جاتے ہین،

ڈاکٹر صاحب کے اخلاق و عادات کی نہایت عمدہ تصویر حیاتِ اقبال کے ساترین باب مین

---

[1] آثار اقبال ص ۵۹، ۶۰

کھینچی گئی ہے، جو لوگ ان کی سادگی، راست گوئی، وضعداری اور صاف گوئی وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہین ان کو اس کتاب کے اس باب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے،

ڈاکٹر صاحب کی شاعری، فلسفہ اور سیاسی نظریات پر بہ کثرت اعتراضات کیے گئے ہین، اس کے علاوہ صوفیون کا ایک گروہ جو مستقل طور پر ان کا مخالف تھا، وہ اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے ان پر سخت سے سخت اعتراض کر سکتا تھا، لیکن ہم نے ڈاکٹر صاحب پر جو مضامین دیکھے ہین، ان مین کوئی مضمون ہماری نظر سے ایسا نہین گذرا جس مین ڈاکٹر صاحب کے اخلاق و عادات پر اعتراضات کیے گئے ہون، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اخلاقی حیثیت سے ان کے دامن پر کوئی دھبہ نہین تھا،

فتنہ گران یورپ کے تیر نگاہ کی زد سے بہت کم لوگ یورپ مین محفوظ رہتے ہین، لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنے اشعار مین صاف صاف تصریح کر دی ہے کہ وہ ہندوستانی عورتون کو ان سے بہتر سمجھتے ہین اسلیے ان کی عشوہ طرازیون کا ان پر کوئی اثر نہین پڑا، اور انھون نے قعر دریا مین بھی اپنے دامن کو تر نہین ہونے دیا،

حیدر آباد کی ہائیکورٹ کی ججی کی طرف بے شبہہ ان کا شدید میلان پایا جاتا ہے جو بظاہر استغنا و قناعت کے منافی ہے، لیکن اگر ایک معزز عہدہ خود ان کی تلاش کر رہا ہے تو اس کو اس تلاش مین مدد دینے سے ان کے استغنا و قناعت کو کیا صدمہ پہنچ سکتا ہے؟ یہ ایک مقابلہ کا میدان تھا، اور اس میدان مین وہ اپنے دوسرے حریفون کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے، اگر وہ اس مقابلہ سے گریز کرتے تو یہ ایک قسم کی راہبانہ شکست ہوتی، کیونکہ

گریز کشمکش زندگی سے مردون کی　　اگر شکست نہین ہے تو اور کیا ہے شکست

تصنیفات

ڈاکٹر صاحب کی تصنیفات کا زیادہ تر حصہ اگرچہ نظم مین ہے، لیکن ان کی سب سے پہلی کتاب جو شائع ہوئی وہ نثر مین علم الاقتصاد پر ہے، اور اس موضوع پر اردو مین یہ سب سے پہلی کتاب ہے[1]، خود ڈاکٹر صاحب نے مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر کو ایک خط مین لکھا ہے کہ "تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی ایک عرصہ سے جاری ہے علم الاقتصاد پر اردو مین سب سے پہلے مستند کتاب مین نے لکھی[2]، منشی محمد الدین فوق نے لکھا ہے کہ یہ کتاب آج کل نایاب ہے[3]، "آثار اقبال مین" اقبال اور معاشیات" کے عنوان سے اس کا جو دیباچہ نقل کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب مسٹر آرنلڈ کی تحریک سے لکھی گئی اور لالہ جیا رام صاحب ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور اور مسٹر فضل حسین بی اے کینٹب بیرسٹر ایٹ لا نے اس کی تصنیف کے لیے اپنے کتب خانون کی کتابین عنایت فرمائین، اور مولانا شبلی علیہ الرحمہ نے اس کتاب کے بعض حصون مین زبان کے متعلق قابل قدر اصلاح دی،

اس کے بعد وہ انگلستان تشریف لے گئے، اور فلسفۂ ایران پر انگریزی مین ایک کتاب لکھی، جب پر ان کو پی، ایچ، ڈی کی ڈگری ملی،[4] ڈاکٹر صاحب نے ایک امتیازی موقع پر اس کتاب کا ذکر بھی کیا ہے، اور مہاراجہ سر کشن بہادر کو ایک خط مین لکھا ہے کہ "انگریزی مین چھوٹی چھوٹی

---

[1] اقبال ہز آرٹ اینڈ تھاٹ ص ۱۰، [2] مکاتیب شاد و اقبال ص ۵۴، [3] نیرنگ خیال اقبال نمبر

[4] ایضاً ص ۴۱،

تصانیف کے علاوہ ایک مفصل رسالہ فلسفہ ایران پر بھی لکھا ہے، جو انگلستان مین شائع ہوا تھا، میرے پاس اسوقت یہ کتابین موجود نہین ورنہ ایصال خدمت کرتا، ان سب کے بعد ان کی نظمون کے مختلف مجموعے شائع ہوتے رہے، ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا آغاز اردو سے ہوا تھا، اور انھون نے چند ہی دنون مین کافی شہرت حاصل کرلی تھی اسلئے ابتدا ہی سے اردو کلام کے مجموعے کی ترتیب واشاعت کا تقاضا ہو رہا تھا لیکن چونکہ ابھی تک کلام کی مقدار اس حد تک نہین پہنچی تھی کہ اس کا کوئی مجموعہ شائع کیا جاسکے، اس لیے ڈاکٹر صاحب اس تقاضے کو پورا نہ کرسکے، چنانچہ ایک خط مین جو منشی سراج الدین کے نام ۱۱ مارچ ۱۹۰۳ء کو لکھا گیا ہے، لکھتے ہین:

ترتیب اشعار کی خود مجھے فکر ہو رہی ہے، مگر یہ خیال ہے کہ ابھی کلام کی مقدار تھوڑی ہے، بہرحال جب یہ کام ہوگا تو آپ کے صلاح و مشورہ کے بغیر نہ ہوگا،[1]

اس کے بعد وہ ۱۹۰۵ء مین انگلستان گئے، اور وہان ان کے خیالات مین جو انقلابات و تغیرات ہوئے، انھون نے ان کو ایک پرجوش مسلمان بنا دیا، اور انگلستان سے واپسی کے بعد یہی پرجوش خیالات ان کی نظمون مین ظاہر ہونے لگے، اس لیے ان کی شاعرانہ شہرت مین اور بھی غیر معمولی اضافہ ہوا لیکن اس کے بعد بھی ان کے اردو کلام کا مستقل مجموعہ شائع نہین ہوا بلکہ سب سے پہلے ان کی ایک فارسی مثنوی اسرار خودی کے نام سے ۱۹۱۵ء مین شائع ہوئی، اور یہی مثنوی ہے جو یورپ و امریکہ مین ڈاکٹر صاحب کی شہرت کا سبب ہوئی، چنانچہ اس کی اشاعت کے چند سال بعد جب ڈاکٹر نکلسن نے اس کا انگریزی مین ترجمہ کیا اور یورپ اور امریکہ مین اس پر متعدد ریویو شائع ہوئے تو اسی ترجمہ کے ذریعہ سے مغربی دنیا ڈاکٹر صاحب کی فکر سے

---

[1] مکاتیب شاد و اقبال ص ۴۵-۴۶، [2] اقبال نامہ ص ۲۱

آگاہ ہوئی، اور ولایت کی تحسین و اعتراف کے بعد ہندوستان کے مغرب پسندون کے لیے بھی "فکر اقبال" کچھ پہلے سے زیادہ جاذب توجہ ہونے لگی،[1]

ڈاکٹر صاحب ابتدا ہی سے ایک پرجوش شاعر سمجھے جاتے تھے، اور یورپ سے واپس آکر ان کا انداز بیان اور بھی زیادہ پرجوش ہوگیا تھا، لیکن اس مثنوی کے شائع ہونے کے بعد ان کی حیثیت ایک فلسفی اور مفکر کی ہوگئی، اور وہ شاعری کی دنیا سے نکل کر ایک دوسرے عالم مین آگئے، اور انھون نے خود اعلان کیا:

شاعری زین مثنوی مقصود نیست	بت پرستی بت گری مقصود نیست
حسن انداز بیان از من مجو	خوانسار و اصفہان از من مجو

اس لیے قدرتی طور پر ڈاکٹر صاحب کے آتش فشان اردو کلام کے مقابلہ مین ابتداءً انکی فارسی مثنوی ان کے عقیدت مندون کو بھی بے جان اور سرد معلوم ہوئی،[2] اس کے بعد اس مثنوی کا دوسرا حصہ **رموز بیخودی** کے نام سے ۱۹۱۸ء مین شائع ہوا، اور اس سے ڈاکٹر صاحب کی ادبی حیثیت اور شاعرانہ عظمت کو اور بھی نقصان پہنچا، چنانچہ مسٹر ابوظفر عبد الواحد صاحب ایم، اے علیگ لکھتے ہین کہ

> یہ مثنویان جابجا نو مشقی کا پتہ دیتی ہین، خصوصاً رموز بیخودی جس مین بے رس فلسفہ اور واعظانہ رنگ زیادہ ہے اور شعریت کم، اپنے شاعرانہ کمال کے بہترین نمونے اقبال نے بعد مین پیش کیے جن کے آگے یہ مثنویان پھیکی ہین،[3]

ان دونون مثنویون کے بعد اگرچہ اردو نظمون کا سلسلہ بھی جاری رہا، تاہم ڈاکٹر صاحب نے اپنی زیادہ تر توجہ فارسی کی طرف مبذول کردی اور اس سلسلے مین جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے "مغربی دیوان"

---

[1] آثار اقبال ص ۱۹۱، ۳۶۲، [2] ایضاً ص ۲۰۵، [3] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۹۵۳،

کا جواب لکھنا شروع کیا جس کا نام پیام مشرق ہے، چنانچہ ایک خط میں جو ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو لکھا گیا ہے، مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

فی الحال میں ایک مغربی شاعر کے دیوان کا جواب لکھ رہا ہوں جس کا قریباً نصف حصہ لکھا جا چکا ہے، کچھ نظمیں فارسی میں ہوں گی کچھ اردو میں۔[1]

لیکن پیام مشرق کا جو نسخہ ہمارے سامنے ہے اس میں اردو کی کوئی نظم نہیں ہے۔ البتہ اسرار خودی اور رموز بیخودی نے شاعرانہ حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کے کلام میں جو خشکی اور یبوست پیدا کر دی تھی پیام مشرق نے اس کی تلافی کر دی، چنانچہ مسٹر ابو ظفر عبد الواحد صاحب لکھتے ہیں:

اسرار اور رموز میں واعظانہ رنگ غالب ہے، فلسفہ زیادہ چھا گیا ہے اور شعریت کم۔ پیام مشرق کی اشاعت سے فلسفیت کم اور شعریت بڑھنے لگتی ہے اور موسیقی کا دور ختم ہو جاتا ہے، اسرار اور رموز کی شراب سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔[2]

یہ کتاب ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی، خود ڈاکٹر صاحب ایک خط میں جو اپریل ۱۹۲۳ء میں لکھا گیا ہے، مولوی عبد الماجد دریابادی کو لکھتے ہیں:

پیام مشرق اپریل کے آخر تک شائع ہو جائے گا، چند ضروری نظمیں ذہن میں تھیں لیکن افسوس ہے انھیں ختم نہ کر سکا، فکر روزی قاتل روح ہے، یکسوئی نصیب نہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ والد مکرم کا اصرار تھا کہ جتنا ہو چکا ہے اسے شائع کر دیا جائے۔[3]

یہ کتاب چار حصوں میں منقسم ہے:

شروع کے ۱۸ صفحوں میں جن کا عنوان "لالۂ طور" ہے قطعہ نما رباعیاں ہیں جن میں لطف زبان کے ساتھ خودی کے توحید آفریں رموز بیان کیے گئے ہیں

[1] اقبال نامہ ص ۱۰۷، [2] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۵۰۸، [3] اقبال نامہ ص ۲۳۴

(۲) دوسرے حصہ مین جس کا عنوان "افکار" ہے، مختلف موضوعون پر چھوٹی چھوٹی نظمین ہین،
لیکن اس حصے مین فصل بہار کشمیر، اور ساقی نامہ کے عنوان سے جو نظمین لکھی گئی ہین ان مین ڈاکٹر صاحب
کا رنگین تخیل فارسی زبان مین پھول برسا رہا ہے،

(۳) تیسرے حصے کا عنوان خواجہ حافظ کے ایک مشہور مصرع کے ٹکڑے کا ایک ٹکڑا
(بدہ ساقی مئ باقی) "مئ باقی" ہے، اور اسمین حافظ کے رنگ مین نہایت پرجوش اور مستانہ غزلین ہین،

(۴) چوتھے اور آخری حصے کا عنوان "نقش فرنگ" ہے، اور اس مین مغرب کے بعض حکما،
اور مشاہیر مثلاً نٹشے، برگسان، ہیگل، ٹالسٹاے، ہائنا اور بائرن وغیرہ پر شاعرانہ انداز مین پرلطف
تبصرے ہین،

ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا آغاز اردو سے ہوا، اور یورپ سے واپسی کے بعد بھی جب
۱۹۰۸ء سے ان کی شاعری کا تیسرا دور شروع ہوا، تو وہ چار پانچ سال تک برابر اردو مین شعر
کہتے رہے، ان کی فارسی شاعری کا باقاعدہ آغاز مثنوی اسرار خودی سے ہوا، جو ۱۹۱۵ء مین شائع
ہوئی، لیکن انھون نے یہ مثنوی ۱۹۱۳ء سے لکھنی شروع کی تھی چنانچہ وہ خود ایک خط مین جو ۱۴ر اکتوبر ۱۹۱۵ء
کو منشی سراج الدین کے نام لکھا گیا ہے، لکھتے ہین:

یہ مثنوی گذشتہ دو سال کے عرصہ مین لکھی گئی، مگر اس طرح کہ کئی کئی ماہ کے وقفون کے
بعد طبیعت مائل ہوتی رہی، چند اتوار کے دنون اور بعض بیخواب راتون کا نتیجہ ہے،[۱]

اس لئے اس مثنوی سے پہلے انھون نے جو نظمین لکھین وہ سب کی سب اردو مین تھین،
اس کے بعد اگرچہ ان کی توجہ زیادہ تر فارسی کی طرف مبذول ہو گئی، لیکن اس زمانے مین بھی انھون
نے اردو سے بالکل قطع تعلق نہین کیا، چنانچہ شیخ عبد القادر بانگ درا کے مقدمہ مین لکھتے ہین:

---

[۱] اقبال نامہ ص ۲۳

ولایت سے واپس آنے پر گو کبھی کبھی اردو کی نظمیں بھی کہتے تھے، مگر طبیعت کا رخ فارسی کی طرف ہوگیا، یہ ان کی شاعری کا تیسرا دور ہے، جو ۱۹۰۸ء کے بعد سے شروع ہوا اور جو اب تک چل رہا ہے، اس عرصہ میں اردو نظمیں بھی بہت سی ہوئیں اور اچھی اچھی جنکی دھوم مچ گئی،

ڈاکٹر صاحب کی مشہور ہنگامہ خیز نظمیں مثلاً شکوہ، جواب شکوہ، شمع و شاعر، طلوع اسلام اور خضر راہ اسی دور کی یادگار ہیں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اب تک ان کی اردو نظموں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا، احباب کا تقاضا ۱۹۰۳ء سے تھا، اور خود ڈاکٹر صاحب کو اس کی ترتیب کی فکر تھی، لیکن چونکہ کلام کی مقدار تھوڑی تھی، اس لیے وہ اس کو مرتب نہ کر سکے[1]، اس کے بعد ان کی یہ پرجوش اور ولولہ انگیز نظمیں شائع ہوئیں تو یہ تقاضا اور بڑھا، چنانچہ ان تقاضا کرنے والوں میں مولانا سید سلیمان ندوی بھی تھے، لیکن ۳ر اپریل ۱۹۱۹ء کے ایک خط میں ڈاکٹر صاحب نے ان سے یہ معذرت کی:

> مجموعہ اب تک مرتب نہ ہو سکنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اب ان تمام نظموں پر نظر ثانی کرنا چاہتا ہوں جس کے لیے فرصت نہیں ملتی، انشاء اللہ بعد از نظر ثانی شائع کروں گا،[2]

بالآخر پیام مشرق کی اشاعت کے بعد اور زبور عجم کی اشاعت سے پہلے مسٹر صلاح الدین احمد اڈیٹر ادبی دنیا لاہور کی اطلاع کے مطابق یہ مجموعہ ستمبر ۱۹۲۴ء میں **بانگ درا** کے نام سے شائع ہوا،

پیام مشرق اور بانگ درا کی اشاعت کے بعد زبور عجم شائع ہوئی، جو چار حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصے میں ۵۶ نغمے ہیں، جن کا ظاہری رنگ و روپ تو غزل کا ہے، لیکن حقیقت میں وہ وجد آفریں اور پرجوش ترانے ہیں، اور ڈاکٹر صاحب نے جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں

غزل سرائے و نواہائے رفتہ باز آور — باین فسردہ دلان حرف دلنواز آور

ان کے ذریعہ سے افسردہ دلان ہند کے قلب میں زندگی کی حرارت پیدا کرنی چاہی ہے،

[1] اقبال نامہ ص ۲۱ [2] ایضاً ص ۱۰۱

دوسرے حصے مین جو نغمے یا غزلین ہین اور پہلے حصے کی طرح جوش و مستی سے لبریز ہین،
اگر فارسی لٹریچر مین خواجہ حافظ کے جوش و مستی کا کوئی جواب ہو سکتا ہے تو وہ ڈاکٹر صاحب کے
یہی چند غزلین ہو سکتی ہین۔

تیسرے حصے کا عنوان "گلشن راز جدید" ہے، جو شیخ سعد الدین محمود شبستری کی گلشن راز کا جدید طرز مین جواب ہے
چنانچہ ڈاکٹر صاحب اس کی تمہید مین خود فرماتے ہین

بطرز دیگر از مقصود گفتم ۔ جواب نامۂ محمود گفتم

اس مین نو منظوم سوالات ہین، جن کے مفصل جوابات دیے گئے ہین، لیکن یہ جوابات فلسفیانہ
موشگافیون سے تعلق رکھتے ہین جو عام دلچسپی کا سامان نہین رکھتے

چوتھا حصہ جس کی سرخی "بندگی نامہ" ہے، نہایت مختصر ہے، اور اس مین غلامون کے فنون
لطیفہ مثلاً موسیقی، مصوری، اور مذہب پر بحث کی ہے، اور یہ دکھلایا ہے کہ غلامون کے فنون لطیفہ
مین زندگی کی روح نہین پائی جاتی،

بہر حال ان چارون حصون مین اصلی چیز پہلا اور دوسرا حصہ ہے اور یہی دونون حصے زبور عجم کی جان ہین،
پیام مشرق اور زبور عجم کے ذریعہ ڈاکٹر صاحب گوئٹے کے دیوان اور محمود شبستری کی مثنوی گلشن راز
کا جواب لکھ چکے تھے، اور اب انھون نے مغرب کے ایک بڑے شاعر ڈانٹے کا جواب لکھنا شروع
کیا جس کی ابتدا ۱۹۲۹ء سے ہوئی، اور وہ کم و بیش تین سال کی مدت یعنی ۱۹۳۲ء مین جاوید نامہ
کے نام سے شائع ہوا،

اسرار و حقائق معراج محمدیہ پر ایک کتاب لکھنے کا خیال ڈاکٹر صاحب کو ایک مدت سے
تھا، اور وہ "گلشن راز جدید" کی طرح علوم حاضرہ کی روشنی مین معراج کی شرح لکھ کر ایک قسم کا
"معراج نامۂ جدید" لکھنا چاہتے تھے، لیکن اس اثنا مین اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے کی کتاب ڈیوائن کامیڈی

پر بعض نئی اور اہم تنقیدات یورپ میں شائع ہو چکی تھیں جن میں اس حقیقت کو پایۂ ثبوت تک پہنچایا گیا تھا کہ "ڈیوائن کامیڈی" کے آسمانی ڈرامہ کا پلاٹ بلکہ اس کے بیشتر تفصیلی مناظر ان واقعات پر مبنی ہیں جو اسلام میں معراج محمدیہ کے متعلق بعض احادیث و روایات میں مذکور ہوئے یا بعد میں بعض مشہور متصوفین و ادبا کی کتابوں میں درج ہوئے۔

اس کے علاوہ بعض متصوفین مثلاً شیخ محی الدین ابن عربی نے اپنی مشہور کتاب "فتوحات مکیہ" میں اور بعض ادبا مثلاً ابو العلا معری نے "رسالۃ الغفران" میں خود اپنی سیاحت علوی اور مشاہدہ تجلیات کا ذکر کیا ہے، اور ابن عربی نے اس سیاحت علوی میں دو افراد کو جن میں ایک فلسفی اور دوسرا عالم دین ہے اپنا رفیق و رہنما بنایا ہے، اور ان کی زبان سے دنیا بھر کے علوم و فنون اور مسائل و مباحث کے متعلق اس انداز میں اظہار خیال کیا ہے کہ گویا یہ تمام خیالات وہ انکشافات و الہامات ہیں جو خود ان کے قلب پر اس معراج میں القا کیے گئے۔

ابو العلا معری نے "رسالۃ الغفران" اپنے ایک شاعر اور ادیب دوست کے جواب میں لکھا ہے جس میں اس نے طنز کے پیرایے میں ان شعرا و ادبا کو مورد عتاب الٰہی قرار دیا تھا جنھوں نے گنہگاری کی زندگی بسر کی تھی، لیکن ابو العلا نے رسالۃ الغفران میں ادبی رنگ میں اپنی بہشت و دوزخ کی سیر دکھائی، اور وسعت رحمت الٰہی کے واضح کرنے کے لیے بدکاروں، گنہگاروں، اور زمانۂ جاہلیت کے شاعروں کو جنھوں نے بالآخر مرنے سے پہلے توبہ کر لی تھی مغفرت و رحمت کا سزاوار ہوتے اور جنت میں داخل ہوتے ہوئے دکھایا۔

حیات مابعد الموت کی حقیقتوں کے تجسس میں ابن عربی اور ڈانٹے دونوں نے سات ستاروں (بعض صورتوں میں نو) کی سیر سے گذر کر بہشت و دوزخ اور اعراف کی فضاؤں کے نقشے کھینچے ہیں۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر رکھنے کے بعد اگر جاوید نامہ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ مسئلہ صاف طور پر

واضح ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ڈیوائن کامیڈی، فتوحات مکیہ اور رسالۃ الغفران کو سامنے رکھ کر
جاوید نامہ کا خاکہ قائم کیا ہے، اور ان کے بعض اشارات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ بعض
لوگون نے ان کی نظمون کا انگریزی مین ترجمہ کرنا چاہا تو انھون نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ

اس سے زیادہ اہم کام یہ ہے کہ جاوید نامہ کا تمام وکمال ترجمہ کیا جائے. یہ نظم ایک قسم
کی "ڈیوائن کامیڈی" ہے[1]

ابو العلاء معری کے "رسالہ غفران" سے بھی وہ پوری طرح پر واقف ہین، چنانچہ ایک نظم مین
اس کا نام لیا ہے،

یہ خوان تر و تازہ معری نے جو دیکھا کہنے لگا وہ صاحب غفران و لزومات

البتہ جاوید نامہ دو باتون مین "ڈیوائن کامیڈی" اور "فتوحات" سے مختلف ہے. ایک یہ کہ
اس مین وہ تمثیلی مظاہرات و اشارات نہین پائے جاتے جو "ڈیوائن کامیڈی" اور "فتوحات"
مین ہر جگہ ملتے ہین، اور جن کی وجہ سے ان کے بعض مباحث عقدۂ لاینحل ہو کر رہ گئے ہین، دوسرے
یہ کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی سیاحت کو زیادہ تر چھ ستارون تک محدود رکھا ہے، اور دوزخ و اعراف
کی سیر نہین کی ہے، بلکہ جن لوگون کو جہنم مین مبتلائے عذاب دکھانے کی ضرورت تھی ان کو "فلک زحل"
کے ایک قلزم خونین مین مبتلائے عذاب دکھایا ہے، اور وہ لوگ صرف مذہبی یا اخلاقی حیثیت
ہی سے مجرم نہین ہین بلکہ وہ ایسی ارواح خبیثہ ہین جنھون نے ملک و ملت سے غداری کی اور
جن کو دوزخ نے بھی اپنے اندر لینا قبول نہین کیا.

ایک بڑا فرق یہ ہے کہ "ڈیوائن کامیڈی" اور "فتوحات" مین زیادہ تر حیات بعد الممات
کے حقائق و کیفیات بیان کئے گئے ہین، لیکن ڈاکٹر صاحب نے "جاوید نامہ" مین زیادہ تر توجہ حیات حاضرہ

[1] اقبال نامہ ص ۳۰۰

یا حیات مطلق یا بالفاظ دیگر بقاے حیات انسانی کے مسئلہ پر صرف کی ہے[1]، اس لیے زیادہ تر وہی مضامین بیان کیے ہین جو عموماً ان کی شاعری کے اساسی مضامین ہین، لیکن ان کے بیان کا اسلوب اور قالب ایک جدید قسم کی شاعرانہ جاذبیت رکھتا ہے، شاعری ایک نہایت وسیع چیز ہے، اور اس کے عناصر ڈرامہ، تھیٹر، سینما اور موسیقی سب مین پاے جاتے ہین، اور اس لحاظ سے اس کتاب مین ڈاکٹر صاحب کی محدود شاعری نے غیر محدود قالب اختیار کر لیا ہے، اور اس مین یہ تمام عناصر سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو گئے ہین، اور انھون نے بہ ترتیب فلک قمر، فلک عطارد، فلک زہرہ، فلک مریخ، فلک مشتری اور فلک زحل کی سیر کی ہے، اور اس کے بعد افلاک سے بھی پرے نکل گئے ہین، اور ان تمام منازل مین انھون نے دور قدیم اور دور جدید کی مختلف تاریخی شخصیتون اور روحون سے دور حاضر کے اہم مسائل پر گفتگو کی ہے، اور اس طرح بتدریج پردے بدلتے گئے ہین، ایک پردہ گر گیا ہے تو فوراً دوسرا پردہ اٹھ گیا ہے، ایک تصویر غائب ہو گئی ہے تو اس کی جگہ دوسری تصویر نمایان ہو گئی ہے، کہین نغمہ ہے، اور کہین نوحہ، کہین پہاڑ ہے، کہین غار، غرض مختلف منظر سامنے آتے گئے ہین، اور یہ تبدیلیان تنوع پسند ذوق کے لیے ڈرامہ، تھیٹر، اور سینما کی طرح نہایت پر لطف و لذیذ معلوم ہوتی ہین، یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی تصنیفات مین نہایت اہم خیال کی جاتی ہے، خود ڈاکٹر صاحب نے بھی اس کو نہایت اہمیت دی ہے اور دوسرون نے بھی اس کو اسی اہمیت کی نگاہ سے دیکھا ہے، لیکن اگر ان تمام خصوصیات سے قطع نظر کر لی جائے اور محض شاعری کے محدود نقطۂ نظر سے اس کتاب پر نظر ڈالی جائے تو پیام مشرق اور زبور عجم کا پلہ بھاری ہو جائے گا، کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی شاعری کے اصلی جوہر صرف انکی نظمون اور غزلون مین کھلتے ہین، مثنوی مین ان کا وہ زور بیان قائم نہین رہتا، اور نہ قائم رہ سکتا، ہمارے

[1] ملخص از مضمون [illegible]، مندرجہ نیرنگ خیال اقبال نمبر ص ۲۰۱ تا صفحہ ۲۰۸ بحذف و اضافہ

نزدیک شاعری مین تخیل و محاکات کا عنصر غالب رہا ہے، اور مثنوی مین زیادہ تر واقعات بیان کیے جاتے ہین، اس لیے اس مین تخیل کی رنگینیان باقی نہین رہتین لیکن اس وقت اس کے پھیلانے کا موقع نہین، جب ہم ان کی شاعری پر ریویو کرین گے تو اس کی تفصیل کر دین گے

جاوید نامہ کے بعد ڈاکٹر صاحب کی شاعری کے دو مجموعے اردو مین اور دو مجموعے فارسی مین اور شائع ہوئے، اردو کا پہلا مجموعہ بال جبریل کے نام سے جنوری ۱۹۳۵ء مین شائع ہوا جس کے پہلے حصہ مین زبور عجم کے طرز کی کچھ غزلین، اور پیام مشرق کے طرز کی کچھ رباعیان یا قطعے ہین، اور یہ حصہ گویا زبور عجم کا چربہ ہے جس مین وہی باتین الفاظ کا قالب بدل کر دہرائی گئی ہین اس لیے ان مین زبور عجم کی تمام خصوصیات یعنی جوش، بلندی اور رنگینی سب کچھ موجود ہے، اسی مین وہ نظم بھی ہے جس کو انھون نے ۱۹۳۳ء مین حکیم سنائی غزنوی کے مزار کی زیارت کے بعد ان ہی کے ایک مشہور قصیدہ کے تتبع مین لکھی ہے،

دوسرے حصہ مین مختلف موضوعون پر نظمین ہین کچھ نظمین اندلس کی مشہور عمارات و مقامات پر ہین، اور یہ ان تاثرات کا نتیجہ ہین جب ڈاکٹر صاحب نے دوسری گول میز کانفرنس کی شرکت کے بعد اسپین کی سیر کی اور ان عمارات و مقامات کا ذاتی طور پر مشاہدہ کیا، اگرچہ ان مین وہ جوش و خروش نہین ہے جو شکوہ اور جواب شکوہ وغیرہ مین ہے، تاہم تسلسل معلومات اور عقیدت و محبت کے جذبات سے یہ نظمین خالی نہین ہین

ذوق و شوق کے عنوان سے ایک طویل نظم ہے جس کے اکثر اشعار فلسطین مین لکھے گئے ہین، لیکن اس مین بھی ڈاکٹر صاحب کا شاعرانہ زور بیان کم ہے مختلف عنوانات پر اور بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی نظمین ہین، لیکن ان سب مین خطبے کی سبب سے مشہور و مقبول نظم "ساقی نامہ" ہے، جو مثنوی سحر البیان کے طرز اور اسی کی بحر مین لکھی گئی ہے، اور اس مین جوش، سرمستی اور رنگینی سب کچھ موجود ہے،

اس کے بعد اردو کا دوسرا مجموعہ ضرب کلیم کے نام سے جولائی ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا[۱]، پہلے اس کا نام صور اسرافیل رکھنا چاہتے تھے[۲] لیکن بعد کو ضرب کلیم کے نام سے شائع کیا، غالباً اس نام کی بنیاد بال جبریل کا یہ شعر ہوگا

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم ——— عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

یہ کتاب مختلف عنوانات پر منقسم ہے، ابتدائی حصے کا کوئی عنوان نہیں، اس میں مختلف چیزوں پر چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں، ان کے علاوہ تعلیم و تربیت، عورت، ادبیات، فنون لطیفہ، سیاسیات مشرق و مغرب کے عنوانات سے ہر موضوع پر اسی قسم کی مختصر نظمیں ہیں، آخر میں "محراب گل افغان کے افکار" کے فرضی نام سے کچھ نظمیں ہیں، جن میں بعض ترانہ یا گیت کی شکل رکھتی ہیں اور دلچسپ ہیں لیکن اس کتاب میں شاعرانہ رنگینی اور دلآویزی کم ہے،

بال جبریل کی اشاعت سے پہلے انھوں نے فارسی زبان میں ایک چھوٹی سی مثنوی مسافر کے نام سے لکھی تھی جس میں سیاحت افغانستان کے متعلق اپنے تاثرات نظم کیے تھے[۳]، اور ضرب کلیم کی اشاعت کے بعد ان کی دوسری فارسی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کے نام سے ستمبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی، اس مثنوی کا شانِ نزول یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے بھوپال میں ایک رات خواب میں دیکھا کہ سرسید احمد خان مرحوم ان سے کہہ رہے ہیں کہ تم اپنی بیماری کا ذکر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کیوں نہیں کرتے؟ آنکھ کھلی تو یہ شعر زبان پر تھا،

با پرستارانِ شب دارم ستیز ——— باز روغن در چراغِ من بریز

پھر چند اشعار حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض احوال میں ہیں .... رفتہ رفتہ ہند اور بیرون ہند کے سیاسی اور اجتماعی حوادث نے ان کو اس قدر متاثر کیا کہ ان اشعار نے ایک مستقل

---

[۱] اقبال نامہ ۱۹۳۔ ۳۸، [۲] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۱۰۴، [۳] ایضاً ص ۱۰۳،

مثنوی کی شکل اختیار کر لی،[۱]

ڈاکٹر صاحب کی سب سے آخری کتاب "ارمغان حجاز" ہے، جو نومبر ۱۹۳۸ء مین شائع ہوئی، اور ایک پاک جذبہ اس کی تصنیف کا محرک ہوا، یعنی انھون نے ۱۹۳۷ء مین فریضۂ حج کے ادا کرنے کی جو تیاریان شروع کین، ان کے سلسلے مین وفور شوق نے ان کے دل کے درد بھرے ساز کو چھیڑا اور ان کی زبان جوش و مستی مین ترنم ریز ہونے لگی، اور طبیعت مین آمد کا وہ زور پیدا ہوا کہ رباعیون پر رباعیان موزون ہوتی چلی گئین، یہانتک کہ چند ہی دنون مین کتاب مکمل ہو گئی، اور مسودہ کی ترتیب و تبییض کا وقت آ گیا، رباعیات و قطعات کے علاوہ آخر مین چند اردو نظمین بھی ہین جن مین بعض کشمیر اور اہل کشمیر کے متعلق ہین، ابلیس کی مجلس شوریٰ کے عنوان سے ایک طویل نظم ہے، ان کی سب سے آخری اردو نظم جس کو انھون نے ، فروری ۱۹۳۸ء کو لکھا، ۶ شعر کا ایک مختصر سا قطعہ ہے، جس کا موضوع "حضرت انسان" ہے،[۲] وہ اسی مجموعے مین شامل ہے، اور تاریخی حیثیت سے قابل قدر ہے،

ان کتابون کے علاوہ ان کی اور بھی متعدد تصنیفات ہین جن مین بعض تو لکھی گئین مگر طبع نہین ہوئین، لیکن اکثر ایسی ہین جن کے خاکے ان کے دماغ ہی تک محدود رہے، اور ان کے لکھنے کی نوبت نہین آئی مثلاً مثنوی "رموز بیخودی" کے بعد ایک نئی منطق الطیر لکھنا چاہتے تھے اور اس کا آغاز بھی ہو گیا تھا،[۳] لیکن وہ نامکمل رہی، عہد جہانگیری مین ملا مسیح پانی پتی نے رامائن کو فارسی مین نظم کیا تھا، اور اسی کے تتبع مین ڈاکٹر صاحب بھی اردو مین رامائن لکھنا چاہتے تھے، اور اس کے لیے فارسی رامائن کے نسخے کی تلاش تھی، جب کہین نہین ملا تو مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کو لکھا کہ اگر آپ کے کتب خانے مین موجود ہو تو چند روز کے لیے مستعار عنایت فرمایا جائے، لیکن ان کے

---

۱ رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۰۱ و اقبال نامہ ص ۱۴۱، ۲ رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۳ مکاتیب شاد و اقبال ص ۹

کتب خانے مین بھی اس کا نسخہ نہ مل سکا،[1]

نظم کے علاوہ نثر مین بھی متعدد کتابون کے لکھنے کا ارادہ تھا، ایک کتاب "فراموش شدہ پیغمبر کی کتاب" کے نام سے لکھنا چاہتے تھے لیکن موت نے اس کی فرصت نہ دی،[2] اس کتاب کے متعلق سید نذیر نیازی صاحب نے لکھا ہے کہ مین ڈاکٹر صاحب کے حکم سے ہر روز عہد نامۂ عتیق یا اناجیل کا کوئی حصہ ان کو پڑھ کر سنایا کرتا تھا، اور یہ مشغلہ کئی روز تک جاری رہا، عہد نامۂ عتیق پر ان کی تنقید بڑے مزے کی ہوتی تھی، اور وہ اس کے انداز بیان اور مطالب کا مقابلہ بار بار قرآن پاک سے کیا کرتے تھے، دراصل ان کا خیال تھا کہ نٹشے کی کتاب (Also Sprach Zarathustra) کی طرح ایک نئی تصنیف (What an unknown Prophet Said.) یا (The Book of an unknown Prophet) کے نام سے مرتب کرین اور اس کے لیے انھین کسی مناسب ادبی اسلوب کی تلاش تھی،[3]

وہ اپنی سب سے آخری کتاب قرآن مجید پر لکھنا چاہتے تھے، اور اس پر انھون نے مدتون غور و فکر کیا تھا، چنانچہ ایک خط مین سر راس مسعود مرحوم کو لکھتے ہین :

اور اس طرح میرے لیے ممکن ہو سکتا کہ مین قرآن کریم پر عہد حاضر کے افکار کی روشنی مین اپنے وہ نوٹ تیار کر لیتا جو عرصہ سے میرے زیر غور ہین، لیکن اب تو نہ معلوم کیون ایسا محسوس کرتا ہون کہ میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا، اگر مجھے حیات مستعار کی بقیہ گھڑیان وقف کر دینے کا سامان میسر آئے تو مین سمجھتا ہون کہ قرآن کریم کے ان نوٹون سے بہتر مین کوئی پیشکش مسلمانان عالم کو نہین کر سکتا،[4]

یہ خط ۲۶ راپریل ۱۹۳۵ء کا لکھا ہوا ہے، اس کے بعد ۳۰ رمئی ۱۹۳۵ء کے دوسرے خط مین لکھتے ہین :

---

[1] مکاتیب شاد و اقبال ص ۱۰۲، ۱۰۳، [2] اقبال ہز آرٹ اینڈ تھاٹ ص ۴۰، [3] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۱۰۴، ۱۰۵،

[4] اقبال نامہ ص ۳۵۷، ۳۵۸

چراغ سحر ہون بجھا چاہتا ہون

تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلمبند کر جاؤن۔[1]

اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال سے انھون نے اس کتاب کے لکھنے کا وعدہ کیا تھا، اور وہ اس کو انگریزی زبان مین لکھنا چاہتے تھے، چنانچہ ۷ راگست ۱۹۳۶ء کے ایک خط مین مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہین:

انشاء اللہ موسم سرما مین وہ انگریزی کتاب لکھنا شروع کرونگا، جس کا وعدہ مین نے اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال سے کر رکھا ہے۔[2]

لیکن سوال یہ تھا کہ یہ کتاب کس رنگ مین لکھی جائے، تفسیر و تشریح یا ابتدائی مطالعہ کے لیے ایک مقدمہ؟ بالآخر موجودہ زمانہ کی اجتماعی تحریکات کو دیکھ کر ان کے دل مین یہ خیال روز بروز مستحکم ہوتا گیا کہ اس وقت اسلام کے نظام عمرانی کی تشریح و توضیح کی ضرورت ہے، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کی طرح تشکیل جدید فقہ اسلامی پر یہ دیکھکر کہ قرآن پاک نے ان مسائل کی رہنمائی کس انداز مین کی ہے قلم اٹھائین، اس غرض سے انھون نے یورپ اور مصر کی بعض نئی مطبوعات بھی فراہم کرنا شروع کر دی تھین لیکن افسوس یہ ہے کہ اس تصنیف کا کام استقصائے مسائل، ترتیب مقدمات اور تقسیم مباحث سے آگے نہ بڑھ سکا۔[3]

محمد اقبال سلمانی نے ان کے کتب خانے کی نسبت لکھا ہے کہ اس مین قاہرہ کی عربی یونیورسٹی الازہر کی بہت سی عربی کتابین بھی تھین جن کی مدد سے وہ "اسلامی اصول فقہ کی تجدید" (Re-cnstruction of Islamine gurisprudereo) کے عنوان سے ایک مہتم بالشان تصنیف کا آغاز کر چکے تھے، مگر افسوس کہ فرشتہ اجل نے ان کو اس کام کی تکمیل سے

[1] اقبال نامہ ص ۲ - ۶۱ - ۲۶۰ [2] ایضاً ص ۱۹۹ [3] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۳ - ۵ - ۱۰۴ - ۱۰۵

پہلے ہی رخت سفر باندھنے پر مجبور کر دیا۔[1]

یہ وہ کتابیں ہیں جن کے خاکے ان کے دماغ ہی میں رہے، اور ان کے لکھنے کی نوبت نہیں آئی، لیکن بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جن کو انھوں نے لکھ تو لیا لیکن وہ چھپ کر شائع نہ ہو سکیں، مثلاً انھوں نے تصوف کی ایک تاریخ لکھنی شروع کی تھی، لیکن کافی مواد نہ مل سکا، اس لیے صرف دو ایک باب لکھ کر رہ گئے۔[2]

سنہ ۱۹۲۵ء سے پہلے انھوں نے ایک مضمون اجتہاد پر لکھا تھا، مگر دوران تحریر میں معلوم ہوا کہ یہ مضمون اس قدر آسان نہیں جیسا انھوں نے ابتدا میں خیال کیا تھا، اس کے علاوہ بہت سی باتیں جن کو مفصل لکھنے کی ضرورت تھی اس مضمون میں نہایت مختصر طور پر محض اشارۃً بیان کی گئی تھیں، اس لیے اس کو شائع نہیں کیا، اس مضمون کو بڑھا کر وہ ایک مستقل کتاب کے قالب میں ڈھالنا چاہتے تھے، جس کا عنوان انھوں نے (Islam as I understand it) یعنی "اسلام میرے نقطۂ نظر سے"، تجویز کیا تھا تاکہ کتاب کا مضمون ان کی ذاتی رائے تصور کیا جائے، جو ممکن ہے کہ غلط ہو،[3] اس مضمون کا ذکر انھوں نے اپنے متعدد خطوط میں کیا ہے، جس سے اس کے مطالب و معانی کی نوعیت اور اس کے عدم اشاعت کی وجہ معلوم ہوتی ہے، چنانچہ ایک خط میں مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

> اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے، کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے، میں نے ایک رسالہ اجتہاد پر لکھا تھا لیکن چونکہ میرا دل بعض امور کے متعلق خود مطمئن نہیں اس واسطے اس کو اب تک شائع نہیں کیا۔[4]

ڈاکٹر صاحب اگرچہ بذات خود شاعر تھے، اور ان کی تصنیفات کا زیادہ تر حصہ نظم ہی میں ہے

[1] البیان، دسمبر سنہ ۱۹۳۹ء ص ۸۹، [2] اقبال نامہ ص ۴۵، [3] ایضاً ص ۴۷، ۴۸، [4] ایضاً ص ۱۴۳

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وہ نثر کی تصنیفات کو ملک و قوم کے لیے زیادہ مفید سمجھتے تھے، اور جدید نسل کو اسی کی ترغیب دیتے تھے، چنانچہ ایک بار اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ نے ایک مشاعرہ کرنا اور ڈاکٹر صاحب کو اس کا صدر بنانا چاہا تو ڈاکٹر صاحب نے ان کو اس ارادہ سے روکا اور فرمایا کہ "اس وقت ہندوستان کو اور بالخصوص مسلمانوں کو "شعربازی" کی ضرورت نہیں، لوگ شعربازی کی طرف اس لیئے جلد متوجہ ہو جاتے ہیں کہ بغیر کاوش، مطالعہ اور محنت کے انھیں شہرت حاصل کرنے کی خواہش دامنگیر ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس وقت بہت کم ایسے شاعر ہیں، جن کے کلام میں بقا کا عنصر موجود ہو، آپ توجوان ہیں، آپ کو اس غلط روش پر ہرگز نہیں چلنا چاہیے، ضرورت ہے نثر نگاروں کی جو محنت اور مطالعہ کے بعد اردو زبان میں مختلف موضوعوں پر کتابیں، رسالے، تراجم وغیرہ لکھیں اور اپنی قوم کو اور خود اپنے آپ کو بہتر بنائیں"[1]

---

[1] آثار اقبال ص ۶۶-۶۷

اُردو شاعری

ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا آغاز ان کی مادری زبان پنجابی سے ہوا، لیکن بعد مین شمس العلما مولوی میر حسن کے مشورے سے اردو مین کہنے لگے۔[1] شیخ عبدالقادر نے مقدمۂ بانگ درا مین لکھا ہے کہ وہ "ابھی اسکول ہی مین پڑھتے تھے کہ کلام موزون زبان سے نکلنے لگا"، لیکن پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ اسکول کی تعلیم ختم کرکے اسکاچ مشن کالج مین داخل ہوئے تو ان کی شاعری شروع ہوئی۔[2] بہرحال اس وقت پنجاب مین اردو کا اسقدر رواج ہوگیا تھا کہ کم وبیش ہر شہر مین زباندانی اور شعر وشاعری کا چرچا موجود تھا، اور ڈاکٹر صاحب کے وطن سیالکوٹ مین بھی ان کی طالب العلمی کے زمانے مین ایک چھوٹا سا مشاعرہ ہوتا تھا جس کے لیے کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب بھی غزل لکھا کرتے تھے۔[3] لیکن اس وقت ادب وشاعری کا سب سے بڑا مرکز لاہور تھا، اور دہلی و لکھنؤ کے بعض بچے کھچے شاعر جن مین مرزا ارشد گورگانی دہلوی اور میر ناظر حسین ناظم لکھنوی خاص طور پر قابل ذکر ہین، یہان جمع ہوگئے تھے، اور ان دونون کے قیام نے لاہور کے بازار حکیمان مین ایک بارونق مشاعرے کی بنیاد ڈال دی تھی، اس لیے جب ڈاکٹر صاحب ۱۸۹۵ء مین اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے سیالکوٹ سے لاہور آئے تو ان کی شاعری کی نشوونما کے لیے قدرتی طور پر ایک وسیع فضا مل گئی، اور وہ اس مشاعرے مین شریک ہونے لگے، اور ان کی شاعرانہ قابلیت نے محفل مشاعرہ کے تمام اراکین کو ان کا مداح اور دوست بنا دیا، اور خود ڈاکٹر صاحب کو یہ بڑا

---

[1] اقبال ہز آرٹ اینڈ تھاٹ ص ۵۔ [2] آثار اقبال ص ۱۰۹۔ [3] مقدمۂ بانگ درا۔

فائدہ ہوا کہ انھین مرزا ارشد کے فیض صحبت سے مستفید ہونے کا موقع مل گیا، اور داغ دہلوی کے تلمذ سے پہلے انھون نے ان ہی سے اصلاح لینی شروع کی[۱]۔ غالباً یہی مشاعرہ ہے جس کی نسبت شیخ عبدالقادر نے مقدمۂ بانگ درا مین لکھا ہے کہ "۱۹۰۱ء سے غالباً دو تین سال پہلے مین نے ان کو پہلی بار لاہور کے ایک مشاعرہ مین دیکھا جس مین ان کے چند ہم جماعت طلبہ ان کو کھینچ کر لائے تھے اور انھون نے کہہ سنکر ایک غزل بھی ان سے پڑھوائی، اس وقت تک لاہور مین لوگ ان سے واقف نہ تھے، چھوٹی سی غزل تھی، سادہ سے الفاظ، زمین بھی مشکل نہ تھی، مگر کلام مین شوخی اور بیساختہ پن موجود تھا، بہت پسند کی گئی، اس کے بعد دو تین مرتبہ پھر اسی مشاعرہ مین انھون نے غزلین پڑھین، اور لوگون کو معلوم ہوا کہ ایک ہونہار شاعر میدان مین آیا ہے"۔ ایک بار اسی مشاعرہ مین جس کے صدر مرزا ارشد گورگانی تھے، ڈاکٹر صاحب کے بعض بے تکلف دوست ان کو جبراً کھینچ لائے اور غزل پڑھنے پر مجبور کیا، اور جب انھون نے یہ شعر پڑھا

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے　　قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو مرزا ارشد گورگانی پھڑک اٹھے، اور یہ پیشین گوئی کی کہ اس نوجوان شاعر کا مستقبل نہایت درخشان ہوگا[۲]، کہا جاتا ہے کہ اکثر شاعرون اور نقادون نے جب یہ سنا کہ یہ شعر ایک نوجوان نے کہا ہے جو حال ہی مین لاہور آیا ہے، تو انھون نے ارادہ کر لیا کہ شعر کہنا چھوڑ دین اور سب کے سب متفق اللفظ ہو کر پکار اٹھے کہ اقبال غالب کے بعد اردو کا سب سے بڑا شاعر ہے[۳]،

اگرچہ یہ شہرت پہلے پہل لاہور کے کالجون کے طلبہ اور بعض ایسے لوگون تک محدود رہی جو صرف تعلیمی مشاغل سے تعلق رکھتے تھے، لیکن اس کے بعد ان کی شہرت کا دائرہ وسیع ہونے لگا، کیونکہ اسی زمانے مین لاہور مین ایک ادبی مجلس قائم ہوئی جس مین مشاہیر شریک ہونے

[۱] آثار اقبال ص ۱۰۹، ۱۱۰۔ [۲] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۲۷۹ و اقبال ہز آرٹ اینڈ تھاٹ ص ۶۔ [۳] نیرنگ خیال اقبال نمبر ص ۶۱

لگے، اور اس مین نثر و نظم کے مضامین کی مانگ ہوئی، ڈاکٹر صاحب نے اس کے ایک جلسہ مین اپنی وہ نظم جس مین "کوہ ہمالیہ" سے خطاب ہے، پڑھ کر سنائی، جس مین انگریزی خیالات اور فارسی بندشین تھین، اس پر مزید خوبی یہ کہ وطن پرستی کی چاشنی بھی اس مین موجود تھی، اس لیے مذاق زمانہ اور ضروریات وقت کے موافق ہونے کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی، اور کئی طرف سے فرمایشین ہونے لگین کہ اس کو شائع کیا جائے، مگر ڈاکٹر صاحب یہ عذر کر کے کہ ابھی نظر ثانی کی ضرورت ہے اس کو اپنے ساتھ لے گئے، اور وہ اس وقت چھپنے نہ پائی، لیکن اس کے چند ہی دنون کے بعد جب شیخ عبد القادر نے اردو ادب کی ترقی کے لیے رسالہ مخزن جاری کرنا چاہا اور دوستانہ تعلقات کی بنا پر ڈاکٹر صاحب سے وعدہ لیا کہ اس رسالہ کے حصۂ نظم کے لیے وہ نئے رنگ کی نظمین ان کو دیا کرین گے، تو اس رسالے کے پہلے نمبر کے لیے انھون نے ان سے ایک نظم مانگی، لیکن ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ابھی کوئی نظم تیار نہین، انھون نے "ہمالیہ" والی نظم لینی چاہی، لیکن چونکہ ڈاکٹر صاحب کے خیال مین اس مین کچھ خامیان تھین اس لیے انھون نے اس کے دینے مین پس و پیش کیا، بالآخر انھون نے زبردستی وہ نظم لے لی، اور مخزن کی پہلی جلد کے پہلے نمبر مین جو اپریل ۱۹۰۱ء مین نکلا، شائع کر دی، اور یہین سے گویا ڈاکٹر صاحب کی اردو شاعری کا پبلک طور پر آغاز ہوا، اور ۱۹۰۵ء تک جس مین وہ ولایت گئے، یہ سلسلہ جاری رہا، اس عرصہ مین وہ عموماً مخزن کے ہر نمبر کے لیے کوئی نہ کوئی نظم لکھتے تھے، اور جون جون لوگون کو ان کی شاعری کا حال معلوم ہوتا گیا، جابجا مختلف رسالون اور اخبارون سے فرمایشین آنے لگین، اور انجمنین اور مجلسین درخواست کرنے لگین، کہ ان کے سالانہ جلسون مین وہ لوگون کو اپنے کلام سے محظوظ کرین، ڈاکٹر صاحب اگرچہ ایک برجستہ گو شاعر تھے، لیکن ان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ باایں ہمہ روانی طبع وہ فرمایشی شعر کہنے سے قاصر تھے، اس لیے جب ان کی شہرت ہوئی اور فرمایشون کی بھرمار ہونے لگی تو ان کو اکثر فرمایشون کی تعمیل سے انکار کرنا پڑا، اسی طرح

انجمنون اور مجلسون کو بھی وہ عموماً جواب ہی دیتے رہے، صرف لاہور کی انجمن حمایت اسلام کو بعض وجوہ سے یہ موقع ملا کہ اس کے سالانہ جلسون مین کئی سال تک متواتر انھون نے اپنی نظم سنائی، جو خاص اسی جلسہ کے لیے لکھی جاتی تھی، اور جس کی فکر وہ پہلے سے کرتے رہتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے تو خواص ہی ان کے کلام کے قدر دان تھے اور اس کو سمجھ سکتے تھے، لیکن ان کے طرز ترنم کی کشش سے اب عوام بھی کھنچ آئے، اور جب حمایت اسلام کے جلسہ مین ان کی نظم پڑھی جاتی تھی تو دس دس ہزار آدمی ایک وقت مین جمع ہو جاتے تھے، اور جب تک نظم پڑھی جاتی تھی لوگ دم بخود بیٹھے رہتے تھے[1]

ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا یہ پہلا دور ہے جو ۱۹۰۱ء سے شروع ہو کر ۱۹۰۵ء تک قائم رہا، اس سے پہلے وہ زیادہ تر غزلین لکھتے رہے، اور اس سلسلے مین سب سے پہلے مرزا ارشد گورگانی سے، پھر اس کے بعد نواب مرزا داغ سے اصلاح لیتے رہے، لیکن ان کے مطبوعہ کلام مین داغ کے رنگ کی غزلین بہت کم ملتی ہین، صرف ایک غزل جس کا مطلع یہ ہے:

نہ آتے ہمین اس مین تکرار کیا تھی مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

داغ کے رنگ مین ہے، لیکن اس رنگ کی اور غزلون کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے خود ان کو چھانٹ دیا، چنانچہ پروفیسر عبد القادر سروری اس غزل کو نقل کر کے لکھتے ہین:

"اس طرح کی غزلین اس مین شک نہین کہ اقبال کے پاس کم ہین، لیکن ان کے قصداً نظر انداز کر دیے جانے کا سخت احتمال ہے، اقبال کی طبیعت بچپن سے سنجیدہ واقع ہوئی ہے، داغ کی شاعری کا اثر ان کے دل سے بہت جلد دور ہو گیا ہوگا، کیونکہ زبان کی چاشنی سے ہٹ کر تکراری مضامین کے سوا ان کے پاس کیا تھا، جو اس فلسفی شاعر کی توجہ کو الجھائے رکھتا، یقین ہے کہ اقبال نے اس طرح کی غزلین انتخاب کے وقت خود چھانٹ دین"[2]

---

[1] مقدمہ بانگ درا، [2] آثار اقبال ص ۱۱۱

اور قرائن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، ایک غزل مین جو رسالہ شورش محشر مین چھپی تھی ڈاکٹر صاحب نے داغ کے تلمذ پر مقطع مین فخر کیا تھا:

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہین نازان　　　مجھے بھی فخر ہے شاگردی داغ سخندان کا

لیکن یہ غزل بانگ درا مین موجود نہین ہے، ۱۸۹۹ء مین انھون نے نالۂ یتیم کے نام سے انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک جلسہ مین ایک نظم پڑھی، اور اس کے بعد انجمن کے ہر سالانہ جلسہ مین نظم اقبال ایک ضروری جزو ہوگئی، [1] لیکن یہ نظم بھی بانگ درا مین شامل نہین ہے، البتہ الگ چھپ گئی ہے، انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسہ مین انھون نے "یتیم کا خطاب ہلال عید سے"، اور ایک جلسے مین "ابر گہربار" کے عنوان سے ایک نظم پڑھی تھی، لیکن یہ دونون نظمین بھی بانگ درا مین شامل نہین ہین، [2] البتہ ابر گہربار فریاد امت کے نام سے الگ چھپ گئی ہے، لیکن اس کانٹ چھانٹ کے باوجود بھی ابتدائی دور کی بہت سی نظمین بانگ درا مین موجود ہین، چنانچہ ایک خط مین خود ڈاکٹر صاحب لکھتے ہین کہ

"بانگ درا کی بیشتر نظمین میرے طالب علمی کے زمانہ کی ہین،" [3]

البتہ ان نظمون کا پتہ چلانا مشکل ہے، تاہم انھون نے بچون کے لیے جو نظمین لکھی ہین، مثلاً "ایک مکڑی اور مکھی"، "ایک پہاڑ اور گلہری"، "ایک گائے اور بکری"، "بچے کی دعا"، "ہمدردی"، "ماں کا خواب"، یا "پیام صبح"، "عشق اور موت"، "رخصت اے بزم جہان"، ... ان کی نسبت یہ تصریح کردی ہے کہ وہ مختلف یورپین شعرا کے کلام سے ماخوذ ہین، وہ بظاہر ان کے طالب العلمی کے زمانے کی ہین، ان کے بعض خطوط سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے طالب العلمی کے زمانے مین یورپین شعرا کے تتبع و تقلید کی خاص طور پر کوشش کرتے تھے، چنانچہ ایک خط مین جو ۱۱ مارچ ۱۹۰۳ء کو منشی سراج الدین

[1] نیرنگ خیال اقبال نمبر ص ۱۱۳، ۲۷۲ . [2] اقبال، ہز آرٹ اینڈ تھاٹ ص ۷، [3] اقبال نامہ ص ۲۹۹

کے نام لکھا گیا ہے، لکھتے ہین:

ملٹن کی تقلید مین کچھ لکھنے کا ارادہ مدت سے ہے، اور اب وہ وقت قریب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ان دنون وقت کا کوئی لحظہ خالی نہین جاتا جس مین اس کی فکر نہ ہو، پانچ چھ سال سے اس آرزو کو دل مین پرورش کر رہا ہون مگر جتنی کاوش آجکل محسوس ہوتی ہے اسقدر کبھی نہین ہوئی[1]

اس قسم کی نظمون کی زبان نہایت صاف سادہ اور رواں ہے۔ چنانچہ انھون نے بچون کے لیے "پرندے کی فریاد" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے، اس کی نسبت اسی خط مین لکھا ہے کہ:

متدرجہ بالا نظم کی بندش ملاحظہ فرمایئے، چونکہ بچون کے لیے ہے اس واسطے اضافات اور دقت مضمون سے خالی ہے، علاوہ برین فریاد کرنے والا آخر پرندہ ہے،

اور غالباً اس معاملے مین انھون نے مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی تقلید کی ہے،

ان نظمون کے متعلق پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہین:

ان نظمون کے علاوہ اقبال کی ابتدائی شاعری کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو مغربی شعراء جیسے ٹینی سن، امرسن، گوئٹے وغیرہ کے کلام سے ماخوذ ہے، یہ درحقیقت اقبال کی موضوعی نظمون کا اولین نقش ہین، ماخوذ خیالات مین اقبال نے عموماً ایسی فلسفیانہ نظمین انتخاب کی ہین جو اردو مین آنے کے بعد اس کا ایک جزو معلوم ہونے لگتی ہین، یہ تقلید کی بڑی کامیابی ہے،[2]

داغ و امیر کے تتبع کا اثر ان کی ابتدائی نظمون پر یہ پڑا ہے کہ بہت سے الفاظ، محاورات، تلمیحات اور خیالات سے قدیم تغزل کی صاف جھلک نمایان ہوتی ہے، مثلاً فریاد امت مین کہتے ہین

داغ دل مہر کی صورت ہے نمایان لیکن	ہے اسے شوق ابھی اور نمایان ہون مین
ضبط کی جا کے سنا اور کسی کو ناصح	اشک بڑھ بڑھ کے یہ کہتا ہے کہ طوفان ہون مین

---

[1] اقبال نامہ ص ۱۲۰ ۔ [2] آثار اقبال ص ۱۲۳

حسن کا گنج گرانمایہ تجھے مل جاتا   تونے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

طور پر تونے جو اے دیدۂ موسیٰ دیکھا   وہی کچھ قیس نے دیکھا پسِ محمل ہوکر

دمِ خنجر مین دمِ ذبح سماجاتا ہون   جوہر آئینۂ خنجرِ قاتل ہوکر

اس قسم کے اشعار اگر اس نظم سے الگ کر لیے جائین تو وہ علانیہ غزل کے اشعار معلوم ہوتے ہین،

حسن تیرا مری آنکھون مین سماجاتاہے   تیر لگتی ہے شعاعِ مہ و انجم مجھکو

"تیر لگتی ہے" دلی کا محاورہ ہے، جس کو داغ نے اس مصرع مین استعمال کیا ہے،

ع تیر لگتی ہے مرے دل کو ہوا گلزار کی

عشق کا تیر قیامت تھا الٰہی توبہ   دل تڑپتا ہے مرا طائرِ بسمل ہوکر

"الٰہی توبہ" غزل کی زبان ہے،

اور بعض خیالات تو ان کے فلسفۂ خودی کے بالکل مخالف ہین

میری ہستی ہی جو تھی میری نظر کا پردا   اٹھ گیا بزم سے مین پردۂ محفل ہوکر

عین ہستی ہوا، ہستی کا فنا ہوجانا   حق دکھایا مجھے اس نقطے نے باطل ہوکر

خلق معقول ہے محسوس ہے خالق اے دل   دیکھ نادان ذرا آپ سے غافل ہوکر

یہ وہی صوفیانہ خیالات ہین جس کی انھون نے بعد کو شدت سے تردید کی ہے، اور غالباً اسی لیے انھون نے اس نظم کو بانگ درا سے خارج کردیا ہے، لیکن جو نظمین باقی رکھی ہین ان مین بھی کہین کہین یہ جھلک موجود ہے، مثلاً "بچہ اور شمع" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اسمین علانیہ فلسفۂ خودی کی مخالفت موجود ہے،

زندگانی جس کو کہتے ہین فراموشی ہے یہ   خواب ہے، غفلت ہے، سرمستی ہے، بیہوشی ہے یہ

اور قدیم رنگ تغزل تو جابجا نمایان ہے، مثلاً

پانی کو چھورہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی   جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

منھدی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو ۔ سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

اجالا جب ہوا رخصت جبین شب کی افشان کا ۔ نسیم زندگی پیغام لائی صبح خندان کا

رنگین کیا سحر کو بانکی دلہن کی صورت ۔ پہنا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی دی

اٹھی اول اول گھٹا کالی کالی ۔ کوئی حور چوٹی کو کھولے کھڑی تھی

امیر مینائی کا ایک شعر ہے :

گھٹا کی سیر سحر سے نکلکر دیکھ اے زاہد ۔ نہانے کو یہ چوٹی حور نے جنت مین کھوئی ہے

اور ڈاکٹر صاحب کی یہ تشبیہ اسی شعر سے ماخوذ ہے ،

لیکن اگر ان نظمون سے قطع نظر کر لیجائے تو اس دور مین ڈاکٹر صاحب کی بہت سی نظمین مختلف حیثیتون سے خاص اہمیت رکھتی ہین ، مثلاً اس دور کی متعدد نظمون مین ان کے فلسفۂ خودی کے بہت سے عناصر بھی موجود ہین ، فلسفۂ خودی کی بنیاد انسان کی فضیلت اور اس کی مخفی روحانی استعداد و قابلیت پر ہے اگر انسان مین خود شناسی کا مادہ پیدا ہو جائے اور وہ اس استعداد و قابلیت سے واقف ہو جائے تو دنیا اس کے نور سے جگمگا اٹھے ، ڈاکٹر صاحب نے "انسان اور بزم قدرت" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس مین فلسفۂ خودی کے اس جزو کو نہایت خوبی کے ساتھ نمایان کیا ہے ،

صبح خورشید درخشان کو جو دیکھا مین نے ۔ بزم معمورۂ ہستی سے یہ پوچھا مین نے

پرتو مہر کے دم سے ہے اجالا تیرا ۔ سیم سیال ہے پانی ترے دریاؤن کا

مہر نے نور کا زیور تجھے پہنایا ہے ۔ تیری محفل کو اسی شمع نے چمکایا ہے

گل و گلزار ترے خلد کی تصویرین ہین ۔ یہ سبھی سورۂ والشمس کی تفسیرین ہین

سرخ پوشاک ہے پھولونکی ، درختونکی ہری ۔ تیری محفل مین کوئی سبز کوئی لال پری

ہے ترے خیمۂ گردون کی طلائی جھالر ۔ بدلیان لال سی آتی ہین افق پر جو نظر

کیا بھلی لگتی ہے، آنکھون کو شفق کی لالی | مئے گلرنگ خم شام مین تونے ڈالی
رتبہ تیرا ہے بڑا، شان بڑی ہے تیری | پردۂ نور مین مستور ہے ہر شئے تیری
صبح اک گیت سراپا ہے تری سطوت کا | زیر خورشید نشان تک بھی نہین ظلمت کا
مین بھی آباد ہون اس نور کی بستی مین مگر | جل گیا پھر مری تقدیر کا اختر کیونکر
نور سے دور ہون، ظلمت مین گرفتار ہون مین | کیون سیہ روز، سیہ بخت، سیہ کار ہون مین
مین یہ کہتا تھا کہ آواز کہین سے آئی | بام گردون سے وہ یا صحن زمین سے آئی
ہے ترے نور سے وابستہ مری بود و نبود | باغبان ہے تری ہستی پہ گلزار وجود
انجمن حسن کی ہے تو، تری تصویر ہون مین | عشق کا تو ہے صحیفہ، تری تفسیر ہون مین
میرے بگڑے ہوئے کامون کو بنایا تو نے | بار جو مجھ سے نہ اٹھا وہ اٹھایا تو نے
نور خورشید کی محتاج ہے ہستی میری | اور بے منت خورشید چمک ہے تیری
ہو نہ خورشید تو ویران ہو گلستان میرا | منزل عیش کی جا نام ہو زندان میرا
آہ اے راز عیان کے نہ سمجھنے والے | حلقۂ دام تمنا مین الجھنے والے
ہائے غفلت کہ تری آنکھ ہے پابند مجاز | ناز زیبا تھا تجھے تو ہے مگر گرم نیاز
تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے | نہ سیہ روز رہے، پھر نہ سیہ کار رہے[1]

فلسفۂ خودی کا دوسرا عنصر عقل و عشق ہے، اور ڈاکٹر صاحب کی آیندہ نظمون مین عقل و عشق کی معرکہ آرائی ایک دلچسپ مضمون ہے، جس مین انھون نے ہر جگہ عشق کو عقل پر فضیلت دی ہے؛ لیکن اس دور مین بھی انھون نے عشق کو عقل پر ترجیح دی ہے۔ البتہ عشق کے بجائے دل کا لفظ استعمال کیا ہے، اور ایک مستقل نظم "عقل و دل" کے عنوان سے لکھی ہے، اور اس مین دونون نے

[1] جن الفاظ پر ہم نے خط کھینچ دیا ہے وہ قدیم رنگ تغزل کے الفاظ ہین،

مناظرانہ انداز مین اپنی اپنی فضیلت کے وجوہ بیان کیے ہین،

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا — بھولے بھٹکے کی رہنما ہون مین
ہون زمین پہ، گذر فلک پہ مرا — دیکھ تو کس قدر رسا ہون مین
کام دنیا مین رہبری ہے مرا — مثل خضرِ خجستہ پا ہون مین
ہون مفسر کتاب ہستی کی — مظہر شانِ کبریا ہون مین
بوند اک خون کی ہے تو لیکن — غیرت لعل بے بہا ہون مین
دل نے سنکر کہا یہ سب سچ ہے — پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہون مین
راز ہستی کو تو سمجھتی ہے — اور آنکھون سے دیکھتا ہون مین
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے — اور باطن سے آشنا ہون مین
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے — تو خدا جو، خدا نما ہون مین
علم کی انتہا ہے بیتابی — اس مرض کی مگر دوا ہون مین
شمع تو محفلِ صداقت کی — حسن کی بزم کا دیا ہون مین
تو زمان و مکان سے رشتہ بپا — طائر سدرہ آشنا ہون مین
کس بلندی پہ ہے مقام مرا — عرش رب جلیل کا ہون مین

فلسفۂ خودی کا تیسرا جزء خیر و شر کا امتزاج یا خیر و شر کی جنگ ہے جو ڈاکٹر صاحب کی رندانہ شاعری کا ایک دلچسپ موضوع ہے، لیکن اس دور مین بھی اس کا دھندلا سا فشان ملتا ہے، چنانچہ "ایک پرندہ اور جگنو" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس کا موضوع یہی ہے:

سر شام ایک مرغِ نغمہ پیرا — کسی ٹہنی پہ بیٹھا گا رہا تھا
چمکتی چیز اک دیکھی زمین پہ — اڑا طائر اسے جگنو سمجھ کر

کہا جگنو نے او مرغِ نوا ریز | نہ کر بیکس پہ منقارِ ہوس تیز
تجھے جس نے چہک گل کو مہک دی | اسی اللہ نے مجھکو چمک دی
لباسِ نور مین مستور ہون مین | پتنگون کے جہان کا طور ہون مین
چہک تیری بہشتِ گوش اگر ہے | چمک میری بھی فردوسِ نظر ہے
پرون کو میرے قدرت نے ضیا دی | تجھے اس نے صدائے دلربا دی
تری منقار کو گانا سکھایا | مجھے گلزار کی مشعل بنایا
چمک بخشی مجھے، آواز تجھکو | دیا ہے سوز مجھکو ساز تجھکو
مخالف ساز کا ہوتا نہین سوز | جہان مین ساز کا ہے ہم نشین سوز
قیام بزم ہستی ہے انہی سے | ظہور اوج و پستی ہے انہی سے
ہم آہنگی سے ہے محفل جہان کی | اسی سے ہے بہار اس بوستان کی

فلسفۂ خودی کا جو تھا جزو بقائے دوام اور حیاتِ جاودانی ہے، جس کو ڈاکٹر صاحب نے اپنی آیندہ شاعری مین بار بار لکھا ہے، لیکن اس دور مین بھی اس کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ "کنارِ راوی" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس کے اخیر مین فرماتے ہین:

روان ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز | ہوا ہے موج سے ملاح جس کا گرم ستیز
سبک روی مین ہے مثلِ نگاہ یہ کشتی | نکل کے حلقۂ حد نظر سے دور گئی
جہازِ زندگیٔ آدمی روان ہے یونہی | ابد کے بحر مین پیدا یونہی نہان ہے یونہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہین ہوتا | نظر سے چھپتا ہے، لیکن فنا نہین ہوتا

اس نظم مین جیسا کہ پہلے اور آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے، یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ زندگی حوادثِ زمانہ کے ساتھ ایک جنگ کا نام ہے جس مین زندگی کو کبھی شکست نہین ہوتی۔ اور اسی پر ڈاکٹر صاحب کی

عملی تعلیم کی بنیاد قائم ہے، اس دور مین ان پر فلسفیانہ خیالات غالب تھے، اور ان خیالات کی بنا پر وہ دین وملت کی قید سے بے نیاز ہو گئے تھے، اس لیے اس دور مین جب سیاسی ہنگامہ آرائی کا غلغلہ بلند ہوا تو انھون نے ہندو مسلم اتحاد اور جذبۂ وطنیت پر نہایت پرجوش اور پر اثر نظمین لکھین جن مین ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچون کا قومی گیت، نیا شوالہ اور صدائے درد اپنی سادگی، اختصار اور جوش کی وجہ سے نہایت مقبول ہوئین، اور ان کی وجہ سے انھون نے ہندوون اور مسلمانون مین یکسان شہرت حاصل کی، غرض ڈاکٹر صاحب کی شاعری کے اٹھان کا یہ نہایت کامیاب زمانہ تھا، اور ہر مضمون شاعرانہ الفاظ، شاعرانہ طرز اور شاعرانہ جذبات کے ساتھ ادا ہوتا تھا،

شیخ عبدالقادر صاحب اس دور کی نسبت لکھتے ہین،

شیخ صاحب اس وقت طالب علمی سے فارغ ہو کر گورنمنٹ کالج مین پروفیسر ہو گئے تھے، اور دن رات علمی صحبتون اور مشاغل مین بسر کرتے تھے، طبیعت زورون پر تھی، شعر کہنے کی طرف جس وقت مائل ہوتے تو غضب کی آمد ہوتی تھی، ایک ایک نشست مین بیشمار شعر ہو جاتے تھے، ان کے دوست اور بعض طالب علم جو پاس ہوتے پنسل کاغذ لیکر لکھتے جاتے اور وہ اپنی دھن مین کہتے جاتے، مین نے اس زمانے مین انھین کبھی کاغذ قلم لے کر فکر سخن کرتے نہین دیکھا، موزون الفاظ کا ایک دریا بہتا یا ایک چشمہ ابلتا معلوم ہوتا تھا،[1]

یہ ایک عینی شہادت ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انھون نے اس دور مین جو کچھ کہا ہے وہ صرف آمد ہے آورد نہین، اس دور کے بعد ۱۹۰۵ء سے جب وہ بغرض حصول تعلیم ولایت گئے ان کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوا، اور ۱۹۰۸ء تک جب وہ ولایت سے واپس آئے قائم رہا، لیکن اس دور مین انھون نے بہت کم نظمین لکھین، بلکہ خود شاعری ہی سے دل برداشتہ ہو گئے،

---

[1] مقدمۂ بانگ درا

جس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ یورپ مین انھون نے جو عملی مظاہر دیکھے ایشیائی شاعری اس کے لیے مفید نہ تھی، کیونکہ ایران کے فلسفۂ الٰہیات پر انھون نے جو مقالہ ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرنے کےلیے لکھا تھا، اس کے لیے ان کو ایران کے صوفیانہ لٹریچر بالخصوص صوفیانہ شاعری کا خاص طور پر مطالعہ کرنا پڑا تھا، اس مطالعہ سے ان کو معلوم ہوا تھا کہ ایرانی شاعری موجودہ دور جدوجہد کے لیے بالکل موزون نہین، بلکہ اس کے برخلاف رہبانیت، قناعت اور گوشہ نشینی کی تعلیم دیتی ہے،

یورپ مین یہ پہلا تغیر تھا جو شاعری کے متعلق ان کی طبیعت مین پیدا ہوا، مگر ڈاکٹر آرنلڈ کے مشورے سے اس کا خاتمہ ہو گیا، لیکن اس کے بجائے دوسرا تغیر یہ پیدا ہوا کہ ان کی شاعری کی زبان بدل گئی اور انھون نے اردو کے بجائے فارسی مین طبع آزمائی شروع کر دی، لیکن خود یورپ مین انھون نے فارسی زبان مین صرف دو غزلین لکھین، جن سے ان کو معلوم ہو گیا کہ وہ فارسی زبان مین بھی شعر کہنے پر قادر ہین، لیکن فارسی پر انھون نے اپنا زور طبع ہندوستان مین آکر دکھایا، یورپ مین صرف اردو مین کہتے رہے، لیکن اس دور کی نظمین کمیت و کیفیت دونون مین دور اول کی نظمون کا مقابلہ نہین کر سکتین، البتہ اس دور مین ان کا زاویۂ نگاہ بدل گیا، اور انھون نے شاعر کے بجائے پیامبر کی حیثیت اختیار کر لی، چنانچہ انھون نے علی گڈھ کالج کے طلبہ کے نام ایک خاص پیام بھیجا جو گویا ایک متن ہے، اور ہندوستان واپس آنے کے بعد انھون نے جو شاعری کی اس کی شرح ہے،

اورون کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے　　عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے

طائر زیر دام کے نالے تو سن چکے ہو تم　　یہ بھی سنو کہ نالۂ طائر بام اور ہے

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکون　　کہتا تھا مور ناتوان لطف خرام اور ہے

جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا　　اس کا مقام اور ہے اسکا نظام اور ہے

موت ہے عیش جاودان ذوقِ طلب اگر نہ ہو | گردشِ آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے
شمعِ سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز | غمکدۂ نمود مین شرطِ دوام اور ہے
بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی | رہنے دو خم کے سر پہ تم خشتِ کلیسیا ابھی

اس پیام کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی مسلسل جدوجہد، مسلسل حرکت اور مسلسل تگ ودو کا نام ہے، پہلے مورنا تو ان نے یہ نکتہ بتایا تھا اور اب چاند اور تارے اس کو بتاتے ہین،

ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے | تارے کہنے لگے قمر سے
نظارے رہے وہی فلک پر | ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا | چلنا چلنا مدام چلنا
بیتاب ہے اس جہان کی ہر شے | کہتے ہین جسے سکون نہین ہے
رہتے ہین ستم کشِ سفر سب | تارے، انسان، شجر، حجر سب
ہوگا کبھی ختم یہ سفر کیا؟ | منزل کبھی آئے گی نظر کیا؟
کہنے لگا چاند ہمنشینو! | اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو!
جنبش سے ہے زندگی جہان کی | یہ رسم قدیم ہے یہان کی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ | کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ مین مقام بے محل ہے | پوشیدہ قرار مین اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہین | جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہین

اسی مسلسل حرکت کا نام کوششِ ناتمام بھی ہے، کیونکہ جس مسافر کی کوئی منزل نہین، اس کا سفر نامکمل ہے، لیکن اسی نامکمل اور غیر مختتم سفر کا نام زندگی ہے، ڈاکٹر صاحب نے "کوششِ ناتمام" کے عنوان سے ایک چھوٹی سی نظم لکھی ہے، جس مین اس نکتہ کو نہایت خوبی کیساتھ دلنشین کیا ہے،

فرقتِ آفتاب مین کھاتی ہے پیچ و تابِ صبح
چشمِ شفق ہے خون فشان اخترِ شام کے لیے

رہتی ہے قیسِ روز کو لیلیٰ شام کی ہوس
اخترِ صبح مضطرب تابِ دوام کے لیے

کہتا تھا قطبِ آسمان قافلۂ نجوم سے
ہمرہو! مین ترس گیا لطفِ خرام کے لیے

سوتون کو ندیون کا شوق، بحر کو ندیون کا عشق
موجۂ بحر کو تپش ماہِ تمام کے لیے

حسنِ ازل کہ پردۂ لالہ و گل مین ہے نہان
کہتے ہین بیقرار ہے جلوۂ عام کے لیے

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

کہین کہین فلسفۂ خودی کے ساتھ فلسفۂ بیخودی کی جھلک بھی اس دور کی شاعری مین نظر آتی ہے

وجودِ افراد کا مجازی ہے ہستیٔ قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہین گویا
بچا کے دامن بتون سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

وطن کی فطری اور مذہبی محبت سے اگرچہ اب بھی ان کو انکار نہین تھا، تاہم اس دور مین انھون نے یہ نظریہ قائم کیا کہ وطنیت پر اسلامی قومیت کی بنیاد نہین قائم کی جا سکتی،

نرالا سارے جہان سے اسکو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہین ہے

کہان کا آنا، کہان کا جانا فریب ہے امتیازِ عقبیٰ
نمود ہر شے مین ہے ہماری کہین ہمارا وطن نہین ہے

اور اسی فلسفہ نے ان کو اسلامی خدمت پر آمادہ کیا، چنانچہ شیخ عبد القادر کے نام انھون نے جو پیغام بھیجا ہے، اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اب وہ اپنی شاعری کے ذریعہ سے مشرق بالخصوص عرب کی خدمت کرنا چاہتے ہین،

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پہ
بزم مین شعلہ نوائی سے اجالا کر دین

اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دیکر
قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دین

رختِ جان بتکدۂ چین سے اٹھا لین اپنا
سب کو محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دین

دیکھ یثرب مین ہوا ناقۂ لیلیٰ بے کار	قیس کو آرزوے نو سے شناسا کر دین
گرم رکھتا تھا ہمین سردی مغرب مین جو داغ	چیر کر سینہ اسے وقف تماشا کر دین
شمع کی طرح جئین بزم گہ عالم مین	خود جلین دیدۂ اغیار کو بینا کر دین

ان خیالات کے ساتھ ڈاکٹر صاحب ۱۹۰۸ء مین نئی نئی امنگین لے کر ہندوستان آئے اور اپنی شاعری کو مسلمانون کی خدمت کا ذریعہ بنایا، اگرچہ اس دور مین بھی انھون نے غیر مسلمون کے بعض مذہبی پیشواؤن مثلاً رام اور گرونانک کی مدح و توصیف مین مستقل نظمین لکھین تاہم اس دور کی نظمون کا زیادہ تر رخ مسلمانون کی طرف ہے، اس لیے ہم اس دور کی شاعری کو اسلامی شاعری کہہ سکتے ہین،

ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا یہ تیسرا دور ہے جو دونون گذشتہ دورون سے علانیہ ممتاز ہے، اس دور مین ڈاکٹر صاحب کی شاعرانہ زبان فارسی ہو رہی تھی، اس لیے اس دور کی نظمون مین فارسیت کا اثر زیادہ نمایان ہے، چنانچہ شیخ عبدالقادر مقدمۂ بانگ درا مین لکھتے ہین کہ "فارسی گوئی کا ایک اثر اقبال کے اردو کلام پر یہ ہوا ہے کہ جو نظمین اردو مین دور سوم مین لکھی گئی ہین ان مین اکثر فارسی ترکیبین اور فارسی بندشین پہلے سے بھی زیادہ ہین، اور بعض جگہ فارسی اشعار پر تضمین کی گئی ہے" لیکن یہ اثر صرف فارسی ترکیبون، فارسی بندشون اور تضمینون تک محدود نہین ہے؛ بلکہ بہت سی نظمون مین بند کا آخری شعر فارسی مین لکھا گیا ہے، اور "طلوع اسلام" کا آخری بند تو اول سے آخر تک فارسی زبان مین ہے، اور اس بند مین اسقدر جوش، روانی اور برجستگی ہے کہ بالکل قاآنی کے طرز و روش کا دھوکا ہوتا ہے، اسی طرح شمع و شاعر کا پہلا بند بالکل فارسی زبان مین ہے، زبان کے تغیر کے ساتھ خیالات بھی بدل گئے تھے؛ اور انکی شاعری کا موضوع فلسفۂ خودی اور فلسفۂ بیخودی ہو گیا تھا، اسلیے اب وہ اپنے اردو اشعار مین علانیہ اس کی تعلیم دینے لگے،

توراز کن فکان ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا | خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا
غودی مین ڈوب جا غافل یہ سرّ زندگانی ہے | نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

آبروباقی تری ملت کی جمعیت سے تھی | جب یہ جمعیت گئی دنیا مین رسوا تو ہوا

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہین | موج ہے دریا مین اور بیرون دریا کچھ نہین

اس دور مین خاک پاک حجاز اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے ڈاکٹر صاحب کی عقیدت اور محبت بے انتہا بڑھ گئی ہے، اور نہایت پردرد اور پراثر طریقون سے اس کا اظہار کیا ہے، اور ایک مختصر سی نظم "شفاخانۂ حجاز" کے عنوان سے لکھی ہے، اور اس مین سرزمین حجاز مین موت کی خواہش کا اظہار نہایت موثر شاعرانہ انداز مین کیا ہے،

اک پیشوائے قوم نے اقبال سے کہا | کھلنے کو جدہ مین ہے شفاخانۂ حجاز
ہوتا ہے تیری خاک کا ہر ذرہ بیقرار | سنتا ہے تو کسی سے جو افسانۂ حجاز
دستِ جنون کو اپنے بڑھا جیب کیطرف | مشہور تو جہان مین ہے دیوانۂ حجاز
دارالشفا حوالیِ بطحا مین چاہیے | نبض مریض پنجۂ عیسیٰ مین چاہیے
مین نے کہا کہ موت کے پردے مین ہے حیات | پوشیدہ جسطرح ہو حقیقت مجاز مین
تلخابۂ اجل مین جو عاشق کو مل گیا | پایا نہ خضر نے مئی عمر دراز مین
آئے ہین آپ لیکے شفا کا پیام کیا | رکھتے ہین اہل درد مسیحا سے کام کیا
اورون کو دین حضور یہ پیغام زندگی | مین موت ڈھونڈتا ہون زمین حجاز مین

"مین اور تو" کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس کے اخیر شعر مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے لطف و کرم کی درخواست کی ہے لیکن طرز خطاب مین جو تضرع و زاری پائی جاتی ہے ان سے انتہائی ادب اور انتہائی سوز و گداز کا اظہار ہوتا ہے لیکن اسی کے ساتھ اپنی خودداری شان بھی قائم ہے

کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہین منتظر کرم وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہی جنھین دماغ سکندری

ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا یہ اسلامی رنگ فرقہ پرستی کا نتیجہ نہین بلکہ اس زمانے کے حوادث و واقعات اور ان کی اثر پذیر شاعرانہ طبیعت کا نتیجہ ہے، وہ ۱۹۰۸ء مین یورپ سے واپس آئے تھے، اور وطنیت اور قومیت کے پردے مین یورپین قومین دوسری قومون کے مٹانے کی جو تدبیرین کر رہی تھین اس کا بچشم خود مطالعہ کر چکے تھے، اس کے بعد یہ زلزلہ جنگ بلقان اور جنگ طرابلس کی صورت مین عضو ضعیف یعنی مسلمانون پر گرا، اور قدرتی طور پر ان سے مسلمانون کے جذبات مشتعل ہوئے، اور ڈاکٹر صاحب نے شکوہ، جواب شکوہ، فاطمہ بنت عبداللہ، اور حضور رسالت مآب کے عنوان سے جو نظمین لکھی ہین ان مین مسلمانون کے انھی جذبات کی ترجمانی کی ہے، شمع و شاعر بھی اسی زمانے کی ایک پر جوش نظم ہے، جو شہرت اور مقبولیت مین شکوہ اور جواب شکوہ سے کم نہین ہے،

جنگ طرابلس و بلقان کے بعد ۱۹۱۴ء مین یورپ کی جنگ عظیم شروع ہوئی اور ۱۹۱۸ء مین اس کا خاتمہ ہوا، اور مسلمانون پر اس کا یہ اثر پڑا کہ قسطنطنیہ پر اتحادیون کا قبضہ ہو گیا، سلطان وحید الدین خان کی خلافت برائے نام رہ گئی، اور اسلامی ممالک کا بظاہر کوئی مستقبل نہ رہا، اسلامی ممالک کے علاوہ تجارتی سرد بازاری، بیروزگاری، افلاس اور فاقہ مستی مین تمام دنیا مبتلا ہو گئی، اور ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء کے شروع مین خضر راہ کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس مین ان تمام واقعات پر تبصرہ کیا، یہ نظم بھی ڈاکٹر صاحب کی مشہور نظمون مین ہے جس کے بعض بند سیاسی اور بعض جذباتی ہین،

غالباً اس نظم کی اشاعت کے ایک سال بعد مصطفٰے کمال نے ترکون کو یورپ کے پنجۂ اقتدار سے نجات دلائی اور برطانوی فوجین قسطنطنیہ سے پسپا ہوئین تو تمام دنیائے اسلام مین دھوم مچ گئی، اور سب کی نگاہین مصطفٰے کمال پر پڑنے لگین، اس حالت مین ڈاکٹر صاحب کے دل مین امید افزا خیالات پیدا ہوئے اور انھون نے طلوع اسلام کے عنوان سے ایک پر جوش نظم لکھی جس مین نہایت

بلند آہنگی سے ان خیالات کا اظہار کیا۔

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا — سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے — تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے — شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا — خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے — یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے — کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

ڈاکٹر صاحب کی اردو شاعری کا تیسرا دور طلوعِ اسلام پر ختم ہوا جو بانگ درا کی سب سے آخری نظم ہے۔ اس کے بعد ان کی توجہ زیادہ تر فارسی شاعری پر مبذول رہی اور اب وہ فارسی شاعری میں اس قدر منہمک ہو گئے کہ ان کے احباب کو خطرہ پیدا ہوا کہ مبادا اردو ان کے فیض سے بالکل محروم نہ ہو جائے۔ اسی لیے شیخ عبدالقادر نے مقدمۂ بانگ درا میں ڈاکٹر صاحب سے یہ درخواست کی کہ "وہ پھر کچھ عرصہ کے لیے گیسوئے اردو کے سنوارنے کی طرف متوجہ ہوں اور ہمیں موقع دیں کہ ہم اس مجموعۂ اردو کو جو اس قدر دیر کے بعد چھپا ہے، ایک دوسرے کلیاتِ اردو کا پیش خیمہ سمجھیں۔"

ایک ملاقات کے دوران میں جو ۱۹۳۲ء میں ہوئی، مسٹر یوسف علی نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ "آپ کو میرے ساتھ وہ وعدہ یاد ہے کہ آیندہ فارسی چھوڑ کر اردو کی طرف دوبارہ متوجہ ہوں گے۔" ڈاکٹر صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا کہ "جی ہاں میں اردو میں چند سالوں سے لکھ رہا ہوں۔"[1]

ان چند سالوں میں ڈاکٹر صاحب نے اردو زبان میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی اردو شاعری کا چوتھا دور شروع ہوتا ہے۔ اور بانگ درا کی اشاعت کے بعد انھوں نے جو کچھ اردو میں لکھا

(۱) [illegible] اقبال ص [illegible]

وہ سب اسی چوتھے دور مین شامل ہے، اور اس کی خصوصیات گذشتہ دورون سے مختلف ہین، کیونکہ گذشتہ دورون مین ان کی پرجوش اور طویل نظمون کے جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہین، خاص خاص محرکات تھے، لیکن اس دور مین کوئی پرجوش خارجی محرک ان کے سامنے نہین تھا، صرف ایک خودی کا فلسفہ تھا جس کے نشے مین وہ سرشار اور بیخود تھے، اس لیے بال جبریل مین جو اس دور کی اردو شاعری کا پہلا مجموعہ ہے، اس فلسفہ کی بہتات نظر آتی ہے،

خودی کی شوخی و تندی مین کبر و ناز نہین ۔۔۔ جو ناز ہو بھی تو بے لذت نیاز نہین

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہین ۔۔۔ تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہین

یہ پیام دے گئی ہے مجھے باد صبحگاہی ۔۔۔ کہ خودی کے عارفون کا ہی مقام پادشاہی

خودی مین گم ہے خدائی تلاش کر غافل ۔۔۔ یہی ہے تیرے لیے اب صلاح کار کی راہ

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی ۔۔۔ کھلتے ہین غلامون پر اسرار شہنشاہی

اور اس فلسفہ کے جتنے اجزا ہین سب اس مین موجود ہین، مثلاً اس فلسفہ کا سب سے مقدم جزو انسان کی فضیلت ہے، اور اس مجموعے مین اس پر موثر اشعار ملتے ہین،

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہین ۔۔۔ کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

خود خدا کو مخاطب کر کے فرماتے ہین:

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہان روشن ۔۔۔ زوال آدم خاکی زیان تیرا ہے یا میرا؟

اس فلسفہ کا دوسرا جزو عشق اور عقل کی جنگ ہے، اور اس مجموعے مین عشق اور عقل کی جنگ پر موثر اشعار موجود ہین:

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام ۔۔۔ اس زمین و آسمان کو بیکران سمجھا تھا مین

اسرار خودی کے شائع ہونے کے بعد ہی صوفیون اور ملاؤن سے ان کی جنگ چھڑ گئی، لیکن

بانگ درا کی نظمون مین انھون نے اس نزاع کا اظہار نہین کیا، لیکن اس کے بعد یہ ان کا ایک مستقل موضوع بنگیا، اور اس مجموعے مین متعدد اشعار اس موضوع پر ملتے ہین، بلکہ ایک مستقل نظم خاص طور پر پنجاب کے پیرزادون پر لکھی ہے، اور ملا اور بہشت کے عنوان سے، ایک نہایت پر لطف نظم کہی ہے:

مین بھی حاضر تھا وہان ضبط سخن کر نہ سکا　　حق سے جب حضرت مُلّا کو ملا حکم بہشت

عرض کی مین نے الٰہی مری تقصیر معاف　　خوش نہ آئینگے اسے حور و شراب و لب کشت

نہین فردوس مقام جدل و قال اقول　　بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت

ہے بد آموزی اقوام و ملل کام اس کا　　اور جنت مین نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

سیاسی موضوع پر بھی اس مین بعض عمدہ نظمین ہین جن مین سے ایک نظم مین اشتراکیت کی تائید نہایت پر زور طریقہ پر کی گئی ہے، اس کا عنوان "فرمان خدا" ہے، اور ایک نظم لینن پر لکھی ہے، اور اس مین یورپ مین تہذیب و تمدن کی تمام خرابیان خود لینن کی زبان سے بیان کی ہین، اس مجموعہ کی سب سے زیادہ پر جوش نظم ساقی نامہ ہے جس کو انھون نے مثنوی میر حسن کی بحر مین لکھا ہے، اس نظم مین ڈاکٹر صاحب کا جوش بیان اپنے منتہائے کمال کو پہنچ گیا ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ پر جوش الفاظ اور مست خیالات کا ایک سیلاب امنڈتا ہوا چلا آتا ہے، چنانچہ ہم آگے چل کر اس کے چند اشعار کا جو انتخاب درج کرین گے اس سے اس کا اندازہ ہوگا،

پیام مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ اور بال جبریل، پر ڈاکٹر صاحب کا تمام شاعرانہ زور صرف ہوچکا تھا، کہ ان کی طویل علالت کا زمانہ شروع ہوا، لیکن اس زمانے مین بھی ان کی زبان بند نہین ہوئی، اور وہ اردو اور فارسی دونون زبانون مین شعر کہتے رہے، اردو زبان مین انھون نے جو کچھ لکھا اس کا مجموعہ ضرب کلیم کے نام سے بال جبریل کی اشاعت کے بعد ۱۹۳۶ء مین شائع ہوا، جو ایک نیم واعظانہ اور نیم شاعرانہ کتاب ہے، باایں ہمہ ضرب کلیم کی بہت سی نظمین نہایت برجستہ اور رواں

ہین جن مین ایک نظم "مرد مسلمان" نہایت مشہور و مقبول ہے، بالخصوص جو خیالات انھون نے "محراب گل افغان" کے فرضی نام سے ظاہر کیے ہین ان مین انتہا درجہ کی دلچسپی پائی جاتی ہے، اس سلسلے مین انھون نے ایک نظم جو پشتو کے مشہور گیت "قربان" کی دھن مین لکھی ہے وہ اور بھی زیادہ دلچسپ ہے:

رومی بدلے، شامی بدلے، بدلا ہندوستان — تو بھی اے فرزند کہستان اپنی خودی پہچان

اپنی خودی پہچان — او غافل افغان

موسم اچھا، پانی وافر، مٹی بھی زرخیز — جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان

اپنی خودی پہچان — او غافل افغان

اونچی جس کی لہر نہین ہے وہ کیسا دریا ہے — جس کی ہوائین تند نہین ہین وہ کیسا طوفان

اپنی خودی پہچان — او غافل افغان

ڈھونڈھ کے اپنی خاک مین جس نے پایا اپنا آپ — اس بندے کی دہقانی پر سلطانی قربان

اپنی خودی پہچان — او غافل افغان

تیری بے علمی نے رکھ لی بے علمون کی لاج — عالم فاضل بیچ رہے ہین اپنا دین ایمان

اپنی خودی پہچان — او غافل افغان

اس کے علاوہ ان نظمون مین وہ نظمین زیادہ پر اثر اور پر لطف معلوم ہوتی ہین جن مین کوہستانی زندگی کے لوازم و خصوصیات کی طرف اشارے کیے گئے ہین، اور ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خودی کی تربیت اور نشو و نما صرف انہی مقامات مین ہو سکتی ہے جو آزاد اور عیش و تنعم کے اسباب سے خالی ہین،

ضرب کلیم کے بعد نومبر ۱۹۳۸ء مین ارمغان حجاز شائع ہوئی جس کا زیادہ تر حصہ فارسی زبان مین ہے لیکن آخر مین چند نظمین اردو مین بھی ہین، یہ زمانہ ڈاکٹر صاحب کی علالت اور پریشان حالی کا تھا،

اس لیے قدرتی طور پر ان کی طبیعت میں افسردگی اور پژمردگی پیدا ہوگئی تھی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب زورِ بیان اور جوشِ کلام سے زیادہ ان کے اشعار میں سوز و گداز پیدا ہوگیا، لیکن یہ سوز و گداز صرف ارمغانِ حجاز کے فارسی اشعار کے ساتھ مخصوص ہے، اردو نظمیں اگرچہ تعداد میں کم ہیں لیکن ان میں وہی بلندآہنگی اور جوشِ بیان پایا جاتا ہے، جو زبورِ عجم اور بالِ جبریل میں موجود ہے، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کشمیر میں جو سیاسی شورش پیدا ہوئی اور اس سلسلے میں مسلمانوں پر جو مقدمات قائم ہوئے اس نے ڈاکٹر صاحب کے جذبات میں قدرتی طور پر تلاطم پیدا کیا اور وہ کشمیر کے مسلمانوں کے مصائب سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، اور یہی وجہ ہے کہ ارمغانِ حجاز کی اردو نظموں میں متعدد نظمیں کشمیر اور مسلمانانِ کشمیر کے متعلق ہیں جن میں ان کو نہایت پرجوش طریقہ پر آزادی حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ مثلاً

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر — کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوزناک — مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر
کہہ رہا ہے داستان بیدردیِ ایام کی — کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر
آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ — ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیرگیر

سمجھا لہو کی بوند اگر تو اسے تو خیر — دل آدمی کا ہے فقط اک جذبۂ بلند
گردش مہ و ستارہ کی ہے ناگوار اسے — دل آپ اپنی شام و سحر کا ہے نقشبند
جس خاک کے ضمیر میں ہے آتشِ چنار — ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

تمام عارف و عامی خودی سے بیگانہ — کوئی بتائے یہ مسجد ہے یا کہ میخانہ
یہ راز ہم سے چھپایا ہے میر واعظ نے — کہ خود حرم ہے چراغِ حرم کا پروانہ
طلسمِ بےخبری کافری و دینداری — حدیثِ شیخ و برہمن فسون و افسانہ

کہ جس کے فقر مین انداز ہون کلیمانہ	نصیب خطہ ہو یارب وہ بندۂ درویش
گہر ہین آب ولر کے تمام یک دانہ	چھپے رہین گے زمانہ کی آنکھ سے کبتک

صرف کشمیر ہی کی خصوصیت نہین بلکہ ارمغان حجاز کے اس حصے مین جتنی نظمین ہین، سب بلند، پرجوش، ولولہ خیز اور شاعرانہ ہین، بعض لوگون نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے دور اخیر کی شاعری کا رنگ واعظانہ ہے، لیکن ارمغان حجاز کی ان نظمون پر یہ کلیہ صادق نہین آتا، چراغ جب بجھنے لگتا ہے تو اس کی لو اور زیادہ تیز ہو جاتی ہے، یا صوفیہ کے نظریہ کے مطابق جسم جب ضعیف ہوتا ہے تو روح قوی ہو جاتی ہے، ڈاکٹر صاحب کی ان نظمون کا یہی حال ہے، بہرحال وجہ جو کچھ بھی ہو لیکن یہ نظمین جوش بیان مین زبورعجم اور بال جبریل کی نظمون سے کم رتبہ نہین ہین، مثالین ملاحظہ ہون، بڈھا بلوچ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے،

اس دشت سے بہتر ہے نہ دلی نہ بخارا	ہو تیرے بیابان کی ہوا تجھکو گوارا
وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا	جس سمت مین چاہے صفت سیل رواں چل
پہناتی ہے درویش کو تاج سرِ دارا	غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو مین
کہتے ہین کہ شیشہ کو بنا سکتے ہین خارا	حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر
ہے ایسی تجارت مین مسلمان کا خسارا	دین ہاتھ سے دیکر اگر آزاد ہو ملت
تہذیب نے پھر اپنے درندون کو ابھارا	دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
ابلیس کو یورپ کی مشینون کا سہارا	اللہ کو پامردیِ مومن پہ بھروسا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا	تقدیر امم کیا ہے کوئی کہہ نہین سکتا
شاہان چہ عجب گر بنوازند گدا را	اخلاص عمل مانگ نیاگان کہن سے
نہ کام آیا ملا کو علم کتابی	کھلا جب چمن مین کتب خانۂ گل

متانت شکن تھی ہوائے بہاران | غزلخوان ہوا پیرکِ اندرابی
کہ لالۂ آتشین پیرہن نے | کہ اسرارِ جان کی ہون مین بیحجابی
سمجھتا ہے جو موت خوابِ لحد کو | نہان اس کی تعمیر مین ہے خرابی
نہین زندگی سلسلہ روز و شب کا | نہین زندگی مستی و نیم خوابی
حیات است در آتشِ خود طپیدن | خوش آن دم کہ این نکتہ را بازیابی
اگر زآتشِ دل شرارے بگیری | توان کرد زیرِ فلک آفتابی

اس حصے مین ڈاکٹر صاحب نے چند رباعیان بھی لکھی ہین جن مین نہایت لطیف مضامین پیدا کیے ہین، مثلاً یہ کہ یہ زمانہ ایجاد و اختراع کا زمانہ ہے، اس کے لیے پرانے گناہ کافی نہین، بلکہ نئے گناہون کی ضرورت ہے، اور شیطان بڑھا ہو کر اب اس ضرورت کو پورا نہین کر سکتا، اس لیے خدا سے کہتے ہین،

فراغت دے اسے کارِ جہان سے | کہ چھوٹے ہر نفس کے امتحان سے
ہوا پیری سے شیطان کہنہ اندیش | گناہِ تازہ تر لائے کہان سے

یا یہ کہ خدا کے سوا کسی اور پر نظر رکھنا کفر ہے، اس کو اس طریقہ سے بیان کرتے ہین،

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد | تجلّی کی فراوانی سے فریاد
گوارا ہے اسے نظارۂ غیر | نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

یا یہ کہ ایسے مسلمان جن مین مسلمانون کے اصلی اوصاف موجود ہون کمیاب ہین، یا یہ کہ خلوت مین رہتے ہین، اس کو اس شاعرانہ انداز مین بیان کیا ہے:

حدیثِ بندۂ مومن دل آویز | جگر پرخون، نفس روشن، نگہ تیز
میسر ہو کسے دیدار اس کا | کہ ہے وہ رونقِ محفل کم آمیز

اس کے علاوہ ان رباعیوں میں جو خیال بھی ظاہر کیا ہے، نہایت جوش اور بلند آہنگی سے ظاہر کیا ہے، مثلاً

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟ خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے؟

ہر دور کی خصوصیات سے الگ ہو کر اگر ڈاکٹر صاحب کے اردو کلام پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالی جائے تو وہ اصناف شاعری کے لحاظ سے غزل، مرثیہ، مثنوی، مناظر قدرت، رباعیات، یا قطعات، ظریفانہ و طنزیہ، قومی اور وطنی نظموں میں منقسم ہے، اور ہم ان میں سے ہر صنف پر الگ الگ ریویو کرنا چاہتے ہیں۔

غزل

غزل میں ڈاکٹر صاحب نواب مرزا داغ کے شاگرد تھے اس لیے ان کی بعض ابتدائی غزلوں میں نواب مرزا داغ کی تمام خصوصیتیں یعنی شوخی، روانی اور برجستگی وغیرہ موجود ہیں، مثلاً

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمھارے پیامی نے سب راز کھولا خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی
کھنچے خود بخود جانب طور موسیٰ کشش تیری اے شوق دیدار کیا تھی
کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

ان کے ابتدائی کلام میں اسی رنگ کی ایک آدھ غزلیں اور بھی ہیں لیکن یہ رنگ جیسا کہ پروفیسر عبد القادر سہروردی نے لکھا ہے ان کی سنجیدہ طبیعت کے خلاف تھا، اس لیے انھوں نے اس کو بہت جلد ترک کر دیا، اور اس رنگ کے ترک کرنے کے بعد جو رنگ اختیار کیا اس کے متعلق ان کی اردو شاعری کے نقادوں کا متفقہ بیان ہے کہ یہ غالب کا رنگ تھا، جو اس فلسفی

شاعری افتادِ طبیعت کے بالکل موافق تھا، چنانچہ شیخ عبدالقادر نے بانگِ درا کے دیباچہ مین اس کو کسی قدر شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ ان الفاظ مین بیان کیا ہے

غالب اور اقبال مین بہت سی باتین مشترک ہین، اگر مین تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسداللہ خان غالب کو اردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا اس نے انکی روح کو عدم مین جا کر بھی چین نہ لینے دیا، اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسدِ خاکی مین جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے، اور اس نے پنجاب کے ایک گوشے مین جسے سیالکوٹ کہتے ہین دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا،

لیکن پروفیسر عبدالقادر سروری کی محتاط اور معتدل رائے یہ ہے کہ "اس کے بعد انھون نے جو غزلین لکھین وہ لفظاً و معناً غالب کی تقلید نہین تو غالب کے کلام سے متاثر ضرور ہین، بہرحال اقبال نے ارشد سے صوری تلمذ حاصل کیا، داغ سے تحریری اصلاح لی، مگر غالب سے معنوی استفادہ کیا اور یہ آخری اثر ان کی طبیعت کے مناسب تھا، اس لیے وہ دیرپا ہے اور اب تک کسی نہ کسی صورت مین ظاہر ہوتا رہتا ہے[1]"

بعض لوگون نے میر کو بھی اس مین شامل کر لیا ہے،

روحِ غالب، دردِ میر، اقبال تیری دل مین ہے　　حسنِ لیلائے سخن پنہان اسی محمل مین ہے

فارسی مین تین شاعر پیدا ہوئے جنھون نے مختلف اقلیمِ سخن کی فرمانروائی کی،

ابیات و قصیدہ و غزل را　　فردوسی و انوری و سعدی

لیکن اردو مین میر و غالب صرف دو ہی مسلم الثبوت شاعر تھے، اور بعض لوگون کے خیال مین قدرت نے ان دونون کو ڈاکٹر اقبال کی ذات مین جمع کر کے ایک تیسرا شاعر پیدا کر دیا، اس لیے

---

[1] آثارِ اقبال ص ۱۱۱، ۱۱۲

اردو کی یہ کمی پوری ہو گئی، اور ایران کی طرح ہندوستان میں بھی تین شاعر پیدا ہو گئے،

تین شاعر مختلف اوقات میں پیدا ہوئے — جن کے فیض طبع نے اردو کو گنج زر دیا

اک اثر میں بڑھ گیا، اک رفعت تخئیل میں — تیسرے کی ذات میں دونوں کو حق نے بھر دیا

کائنات شاعری میں ہیں یہی دو با کمال — تیسرے میں اس لیے دونوں کو یکجا کر دیا[1]

(میر، غالب، اقبال)

پروفیسر عبد القادر سروری نے ڈاکٹر صاحب کی بعض غزلوں سے بھی غالب کا اثر نمایاں کیا ہے، مثلاً

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی — ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

عذر آفرین جرم محبت ہے حسن دوست — محشر میں عذر تازہ نہ پیدا کرے کوئی

کہوں کیا آرزوئے بیدلی مجھکو کہاں تک ہے — مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے

سکون دل سے سامان کشود کار پیدا کر — کہ عقدہ خاطر گرداب کا آب رواں تک ہے

ان اشعار میں "سکون دل"، "کشود کار"، اور "عقدۂ خاطر گرداب" غالب کی ترکیبیں ہیں،

اس غزل کا یہ شعر بھی

وہ میکش ہوں فروغ مے سے خود گلزار بن جاؤں — ہوائے گل فراق ساقیٔ نامہرباں تک ہے

غالب کے اس شعر سے ماخوذ ہے

اک نو بہار تازہ کو تاکے ہے پھر نگاہ — چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے

لیکن ان کی غزلوں کے رنگ میں ہمواری نہیں پائی جاتی، بلکہ اس کے مختلف دور ہیں، اور ہر دور میں ان کا رنگ مختلف ہے، غالب اور میر کا اثر ان کی غزل گوئی کے پہلے دور میں زیادہ نمایاں ہے، جیسا کہ ان کے مختلف اشعار سے اس کا اندازہ ہوگا،

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں — تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ

---

[1] نیرنگ خیال اقبال نمبر ص ۳۶

جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ چن کے تو — آ ہی نکلے گی کوئی بجلی جلانے کے لیے

موت کا نسخہ ابھی باقی ہے اے دردِ فراق — چارہ گر دیوانہ ہے مین لا دوا کیونکر ہوا

نہین بیگانگی اچھی رفیقِ راہ منزل سے — ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر چلنے والے ہین

چمن افروز ہے صیاد میری خوشنوائی تک — رہی بجلی کی بیتابی سو میرے آشیان تک ہے

زمانے بھر مین رسوا ہون مگر اے وائے نادانی — سمجھتا ہون کہ میرا عشق میرے رازدان تک ہے

محبت کیلیے دل ڈھونڈھ کوئی ٹوٹنے والا — یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہین نازک آبگینون مین

کوئی دم کا مہمان ہون اے اہلِ محفل — چراغِ سحر ہون بجھا چاہتا ہون

ان اشعار مین میرؔ کے رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے، غالبؔ کا انداز ان اشعار مین ہے:

ہین انتہائے عشق ہون تو انتہائے حسن — دیکھے مجھے کہ تجھکو تماشا کرے کوئی

وہ مشتِ خاک ہون فیضِ پریشانی سے صحرا ہون — نہ پوچھو میری وسعت کی زمین سے آسمان تک ہے

جرس ہون نالہ خوابیدہ ہے میری ہر رگ و پے مین — یہ خاموشی مری وقتِ رحیلِ کاروان تک ہے

چمن زارِ محبت مین خموشی موت ہے بلبل — یہان کی زندگی پابندیِ رسمِ فغان تک ہے

جوانی ہے تو ذوقِ دید بھی لطفِ تمنا بھی — ہمارے گھر کی آبادی قیامِ میہمان تک ہے

مدام گوش بہ دل رہ یہ ساز ہے ایسا — جو ہو شکستہ تو پیدا نوائے راز کرے

تمیزِ لالہ و گل سے ہے نالۂ بلبل — جہان مین وا نہ کوئی چشمِ امتیاز کرے

ہین جبھی تک تھا کہ تیری جلوہ پیرائی نہ تھی — جو نمودِ حق سے مٹ جاتا ہے وہ باطل ہون مین

بزمِ ہستی اپنی آرایش پہ تو نازان نہ ہو — تو تو اک تصویر ہے محفل کی اور محفل ہون مین

ڈھونڈھتا پھرتا ہون اے اقبال اپنے آپ کو — آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہون مین

واعظ کمالِ ترک سے ملتی ہے یان مراد — دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے گمر ہی
رستہ نہ ڈھونڈھ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

مانند خامہ تیری زبان پر ہے حرفِ غیر
بیگانہ شے پہ نازشِ بیجا بھی چھوڑ دے

شبنم کی طرح پھولون پہ رہ اور چمن سے چل
اس باغ مین قیام کا سودا بھی چھوڑ دے

ہے عاشقی مین رسم الگ سب سے بیٹھنا
بتخانہ بھی حرم بھی کلیسا بھی چھوڑ دے

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

شوخی سی ہے سوالِ مکرر مین اے کلیم
شرط رضا یہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے

واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز مین
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

ڈاکٹر صاحب کی غزل گوئی کا دوسرا دور قیام یورپ کے زمانے سے شروع ہوا، اور عام طور پر یورپ کو میخانۂ عیش و عشرت اور مرقع حسن و جمال خیال کیا جاتا ہے، اس لیے یہان ان کی غزلون مین حسن و عشق کے جذبات مین اور بھی زیادہ مستی اور رنگینی پیدا ہونی چاہیے تھی، لیکن خلاف توقع ڈاکٹر صاحب پر مہ جبینانِ یورپ کے حسن و جمال کا الٹا اثر پڑا، اور انھون نے اس معاملہ مین ہندوستان کو یورپ پر ترجیح دی،

مین نے اے اقبال یورپ مین اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستان کے ماہ سیماؤن مین تھی

اس لیے ان کے رنگِ تغزل مین کوئی نمایان فرق پیدا نہین ہوا، بلکہ وہی میرؔ و غالبؔ کی روش قائم رہی، مثلاً

ملا محبت کا سوز مجھکو تو بولے صبحِ ازل فرشتے
مثال شمع مزار ہے تو، تری کوئی انجمن نہین ہے

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا، نہ جس مین خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے نگار خانہ ہے آرزو کا

کھلا یہ مرکر کہ زندگی اپنی تھی طلسم ہوس سراپا
جسے سمجھتے تھے جسم خاکی، غبار تھا کوے آرزو کا

چمن مین گلچین سے غنچہ کہتا تھا اتنا بیدرد کیون ہے انسان
تری نگاہون مین ہے تبسم شکست ہونا مرے سبو کا

سپاس شرطِ ادب ہی ورنہ کرم ترا ہے ستم سے بڑھ کر ذرا سا اک دل دیا ہی وہ بھی فریب خوردہ ہے آرزو کا

پا گئی آسودگی کوئے محبت مین وہ خاک مدتون آوارہ جو حکمت کے صحراؤن مین تھی

بھلی ہے ہمنفسو! اس چمن مین خاموشی کہ خوش نواؤن کو پابندِ دام کرتے ہین

چمن مین لالہ دکھاتا پھرتا ہی داغ اپنا کلی کلی کو یہ جانتا ہی کہ اس دکھاوے سے دل جلون مین شمار ہوگا

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہی اسکی کہین سرِ راہ گزار بیٹھا ستمکشِ انتظار ہوگا

یہ میر کا لہجہ ہے، غالب کا صوفیانہ اور فلسفیانہ انداز ان اشعار سے واضح ہوگا،

چمک تیری عیان بجلی مین، آتش مین شرارے مین جھلک تیری ہویدا چاند مین سورج مین تارے مین

بلندی آسمانون مین، زمینون مین تری پستی روانی بحر مین افتادگی تیرے کنارے مین

جو ہے بیدار انسان مین وہ گہری نیند سوتا ہے شجر مین پھول مین حیوان مین پتھر مین ستارے مین

خصوصیت نہین کچھ اس مین اے کلیم تری شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہین

البتہ ان کے وطنی اور سیاسی خیالات مین جو تغیرات پیدا ہوئے اُنھون نے اس دور کی بعض غزلون مین بھی سرسری طور پر ان کا اظہار کیا ہے، بالخصوص یہ غزل تو پوری کی پوری سیاسی رنگ مین ہے،

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا سکوت تھا پردہ دار جسکا وہ راز اب آشکار ہوگا

لیکن یورپ کی تہذیب و تمدن اور سیاست و معاشرت کے متعلق جو مخالفانہ خیالات ان کے دل مین پیدا ہوئے، ان کا اظہار ان سرسری اشعار سے نہین ہوسکتا تھا، اس لیے ان کو انھون نے اپنے دل ہی مین مخفی رکھا، اور ہندوستان مین واپس آکر ان کو نہایت بیباکی سے ظاہر کیا، اور غالبؔ اس شعر مین اسی طرف اشارہ ہے،

زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اٹھے گا گفتگو کا مری خموشی نہین ہی، گویا مزار ہے حرف آرزو کا

دونون دور کی ان غزلون مین ڈاکٹر صاحب کی اصلی خصوصیت یہ ہے کہ غزل کے عام اور

متداول مضامین تو تمام شعراء کے یہان پائے جاتے ہین جن کی حقیقت نقالی سے زیادہ نہین ہوتی لیکن بعض شعراء مین کوئی خاص حقیقی جذبہ پایا جاتا ہے، اور وہ اس کو بار بار نہایت بلند آہنگی سے ظاہر کرتے ہین، یہی جذبہ ہے جو اس کے کلام مین امتیازی شان پیدا کرتا ہے، اور اس کو تمام شعراء سے ممتاز کر دیتا ہے، مثلاً شراب و کباب اور رندی و سرمستی کے مضامین تو تمام غزلگو شعراء کے یہان موجود ہین، لیکن خواجہ حافظ مین رندی و سرمستی کا یہ جذبہ حقیقۃً پایا جاتا تھا، اس سے بحث نہین کہ وہ شراب معرفت کے نشے مین چور تھے، یا بادۂ انگوری نے ان کو مست و سرشار بنا دیا تھا، لیکن بہر حال ان کے سر مین کسی نہ کسی شراب کا نشہ ضرور موجود تھا، جس کا اظہار انھون نے نہایت وسعت، تنوع اور جوش کے ساتھ کیا، اس لیے یہ مضامین ان کی خاص چیز بن گئے، اسی طرح ڈاکٹر صاحب کا جوش اور ولولہ کسی ظاہری یا باطنی کیفیت کا نتیجہ تھا، لیکن پہلے دونون گذشتہ دورون مین وہ اس ذوق سے نا آشنا تھے، یورپ سے پلٹنے کے بعد انھون نے خودی کو اپنا خاص فلسفہ اور خاص پیغام بنایا، اور اس کی تبلیغ نہایت پرجوش طریقہ پر کی، اس لیے ان کی غزلگوئی کے تیسرے دور مین، جو یورپ سے واپسی کے بعد شروع ہوا، جو جوش اور اصلیت موجود ہے وہ پچھلے دونون دور مین مفقود ہے، خیالات کا اثر الفاظ پر بھی پڑتا ہے، اس لیے اس دور کی غزلون کے الفاظ مین جو رعنائی، برجستگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے وہ پچھلے کلام مین موجود نہین، ان غزلون مین انتخاب کی گنجائش نہین، بلکہ پوری کی پوری غزلین انتخاب ہین

پردہ چہرے سے اٹھا انجمن آرائی کر ۔۔۔ چشم مہر و مہ و انجم کو تماشائی کر
تو جو بجلی ہے تو یہ چشمک پنہان کب تک ۔۔۔ بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر
نفس گرم کی تاثیر ہے اعجاز حیات ۔۔۔ تیرے سینے مین اگر ہے تو مسیحائی کر
کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثل کلیم ۔۔۔ اپنی ہستی سے عیان شعلۂ سینائی کر
ہو تری خاک کے ہر ذرہ سے تعمیر حرم ۔۔۔ دل کو بیگانۂ انداز کلیسائی کر

اس گلستان مین نہین حد سی گزرنا اچھا ناز بھی کر تو باندازۂ رعنائی کر
پہلے خود دار تو مانند سکندر ہو لے پھر جہان مین ہوسِ شوکتِ دارائی کر
مل ہی جائے گی کبھی منزل لیلئ اقبال کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر
پھر باد بہار آئی اقبال غزلخوان ہو غنچہ ہے اگر، گل ہو، گل ہے تو گلستان ہو
تو خاک کی مٹھی ہے اجزا کی حرارت سے برہم ہو، پریشان ہو، وسعت مین بیابان ہو
تو جنس محبت ہی، قیمت ہی گران تیری کم مایہ ہین سوداگر اس دیس مین ارزان ہو
کیون ساز کے پردے مین مستور ہو لے تیری تو نغمۂ رنگین ہے، ہر گوش پہ عریان ہو
اے رہرو فرزانہ رستے مین اگر تیرے گلشن ہی تو شبنم ہو، صحرا ہے تو طوفان ہو
سامان کی محبت مین مضمر ہی تن آسانی مقصد ہے اگر منزل غارت گر سامان ہو

ان اشعار مین ڈاکٹر صاحب کا پورا فلسفۂ حیات، فلسفۂ عمل، اور فلسفۂ خودی موجود ہے، جس کی تشریح ہم آیندہ فلسفۂ خودی کے عنوان مین کرین گے۔

ڈاکٹر صاحب کی چند غزلین بال جبریل کے شروع مین بھی ہین، اور یہ ان کی غزلگوئی کا چوتھا دور ہے، لیکن زبان اور مضمون دونون حیثیتون سے ہم ان کو بمشکل غزل کہہ سکتے ہین، غزل کی ایک خاص زبان ہے جو نرم، لطیف، شیرین، خوشگوار اور لوچدار ہوتی ہے لیکن ان غزلون کی زبان ان اوصاف سے بالکل خالی ہے، ڈاکٹر صاحب بھی اس نکتے سے واقف ہین اس لیے بطور معذرت کے فرماتے ہین:

مری نوا مین نہین ہے اداے محبوبی کہ بانگ صور سرافیل دلنواز نہین

الفاظ بالکل خیالات کے تابع ہوتے ہین، اور غزل کی یہ زبان قدرتی طور پر اس لیے پیدا ہو گئی ہے کہ غزل مین جو مضامین بیان کیے جاتے ہین وہ خود بھی نہایت لطیف و نازک ہوتے

ہین، اور ڈاکٹر صاحب کی یہ غزلین اس قسم کے لطیف مضامین سے خالی ہین، اور ڈاکٹر صاحب
خود اس کا اعتراف کرتے ہین،

حدیث بادہ و مینا و جام آتی نہین مجھکو ۔۔۔ نہ کر خارا شگافون سے تقاضا شیشہ سازی کا

اس بنا پر ہم بال جبریل کی غزلون کو بشکل غزل کہہ سکتے ہین، البتہ غزل کا ایک دلچسپ مضمون
عقل و عشق کی آویزش ہے اور اس کو صوفیانہ اور رندانہ دونون قسم کی شاعری سے تعلق ہے، اور
شعراء نے ان دونون حیثیتون سے عقل کے مقابلہ مین عشق کی حمایت کی ہے، ڈاکٹر صاحب
کی شاعری اگرچہ رندانہ نہین ہے، تاہم اس کا ایک ماخذ تصوف بھی ہے، اسی کے ساتھ عشق و
محبت کو جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کرین گے، فلسفۂ خودی سے بھی گہرا تعلق ہے، اس لیے عقل و عشق
کی معرکہ آرائی ان کی شاعری کا ایک اہم جزء ہے، اور انھون نے غزل مین اس مضمون کی آمیزش
اپنی غزلگوئی کے تیسرے دور مین کی ہے، اور چوتھے دور مین جو اسی تیسرے دور کا تتمہ و تکملہ ہے،
یہ شراب تند سے تند تر ہو گئی ہے،

مرثیہ ڈاکٹر صاحب نے مرثیے بہت کم لکھے ہین، اور جو لکھے ہین ان مین مرثیہ گوئی کی شان بہت کم
پائی جاتی ہے، وہ ایک ہنگامہ خیز، ولولہ انگیز اور فلسفیانہ طبیعت رکھتے تھے، اور مرثیہ مین درد و غم،
سوز و گداز اور حرمان و یاس کی ضرورت ہے، اس لیے ان سے یہ صنف بن نہین آتی، انھون
نے اپنی والدہ مرحومہ کا ایک طویل مرثیہ لکھا ہے، لیکن رنج و غم کا اظہار صرف اس کے ایک بند
سے ہوتا ہے،

کس کو اب ہوگا وطن مین آہ میرا انتظار ۔۔۔ کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بیقرار
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی ۔۔۔ مین تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی
وہ جوان، قامت مین ہے جو صورت سرو بلند ۔۔۔ تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھکر بہرہ مند

تجھکو مثلِ طفلکِ بیدست و پا رکھتا ہے وہ
صبر سے نا آشنا صبح و مسا رکھتا ہے وہ

اس کے علاوہ جتنے بند ہین ان مین موت کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے، بالخصوص ابتدائی بند تو بالکل شانِ مرثیہ گوئی کے خلاف ہے،

آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سرِ مجبوری عیان
خشک ہو جاتا ہے دل مین اشک کا سیلِ روان

علم و حکمت رہزنِ سامانِ اشک و آہ ہے
یعنی اک الماس کا ٹکڑا دلِ آگاہ ہے

گرچہ میرے باغ مین شبنم کی شادابی نہین
آنکھ میری مایہ دارِ اشکِ عنابی نہین

ایک مرثیہ انھون نے سر راس مسعود کا بھی لکھا ہے جن سے ان کو بے انتہا محبت تھی۔ اس مرثیہ کے ابتدائی اشعار تو بے شبہہ مرثیے کی شان رکھتے ہین،

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی
وہ یادگارِ کمالاتِ احمد و محمود

زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہان اسکی
وہ کاروان کا متاعِ گران بہا مسعود

مجھے رلاتی ہے اہلِ جہان کی بیدردی
فغانِ مرغِ سحر خوان کو جانتے ہین سرود

نہ کہہ کہ صبر مین پنہان ہے چارۂ غمِ دوست
نہ کہہ کہ صبر معماے موت کی ہے کشود

دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است

پھر بھی لہجہ حسرت و یاس کا نہین ہے، بلکہ وہی بلند آہنگی اس مین بھی موجود ہے، جو انکی ولولہ انگیز نظمون مین پائی جاتی ہے، بالخصوص خودی کی نعت و منقبت تو بالکل شانِ مرثیہ گوئی کے خلاف ہے،

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات

خودی ہے زندہ تو دریا ہے بیکرانہ ترا
ترے فراق مین مضطر ہے موجِ نیل و فرات

خود آگہان کہ ازین خاکدان برون جستند
طلسمِ مہر و سپہر و ستارہ بشکستند

لیکن یہ مقام خودی کے اظہار کا نہین بلکہ بیخودی کے اظہار کا ہے،

ڈاکٹر صاحب نے صرف داغ کا ایک ایسا مرثیہ لکھا ہے جس مین مرثیہ گوئی کی تمام خصوصیات موجود ہین،

عظمتِ غالب ہی اک مدت سے پیوندِ زمین
مہدیِ مجروح ہے شہرِ خموشان کا مکین

توڑ ڈالی موت نے غربت مین مینائے امیر
چشمِ محفل مین ہی اب تک کیفِ صہبائے امیر

آج لیکن ہمنوا! سارا چمن ماتم مین ہی
شمع روشن بجھ گئی، بزمِ سخن ماتم مین ہی

بلبلِ دلی نے باندھا اُس چمن مین آشیان
ہمنوا ہین سب عنادل باغِ ہستی کے جہان

چل بسا داغ آہ میت اسکی زیبِ دوش ہے
آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

اب کہان وہ بانکپن وہ شوخیِ طرزِ بیان
آگ تھی کافورِ پیری مین جوانی کی نہان

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل مین ہی
یعنی لیلی وہان بے پردہ، یان محمل مین ہی

اب صبا سے کون پوچھے گا سکوتِ گل کا راز
کون سمجھے گا چمن مین نالۂ بلبل کا راز

تھی حقیقت سی نہ غفلت فکر کی پرواز مین
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز مین

اور دکھلائینگے مضمون کی ہمین باریکیان
اپنے فکرِ نکتہ آرا کی فلک پیمائیان

تلخیِ دوران کے نقشے کھینچکر رلوائینگے
یا تخیل کی نئی دنیا ہمین دکھلائین گے

اس چمن مین ہون گے پیدا بلبلِ شیراز بھی
سیکڑون ساحر بھی ہونگے صاحبِ اعجاز بھی

اٹھین گے آذر ہزارون شعر کے بتخانے سی
مے پلائین گے نئے ساقی نئے پیمانے سی

لکھی جائین گی کتابِ دل کی تفسیرین بہت
ہونگی اے خوابِ جوانی تیری تعبیرین بہت

ہو بہو کھینچیگا لیکن عشق کی تصویر کون؟
اٹھ گیا ناوک فگن، مارے گا دل پر تیر کون؟

اشک کے دانے زمینِ شعر مین بوتا ہون مین
تو بھی رونے خاکِ دلی داغ کو روتا ہون مین

آہ اے بیت الحرام مذہب اہل سخن ۔۔۔ ہو گیا پھر آج پامال خزان تیرا چمن

وہ گل رنگین ترا رخصت مثال بو ہوا ۔۔۔ یعنی خالی داغ سے کاشانۂ اردو ہوا

تھی نہ شاید کچھ کشش ایسی وطن کی خاک مین ۔۔۔ وہ مہ کامل ہوا پنہان دکن کی خاک مین

اٹھ گئے ساقی جو تھے میخانہ خالی رہ گیا ۔۔۔ یادگار بزم دہلی ایک حالی رہ گیا

آرزو کو خون رلاتی ہے بیداد اجل ۔۔۔ مارتا ہے تیر تاریکی مین صیاد اجل

کھل نہین سکتی شکایت کیلیے لیکن زبان ۔۔۔ ہے خزان کا رنگ بھی وجہ قیام گلستان

ایک ہی قانون عالمگیر کے ہین سب اثر ۔۔۔ بوئے گل کا باغ سے گلچین کا دنیا سے سفر

جزیرہ سسلی اور گورستان شاہی پر جو نظمین انھون نے لکھی ہین ان مین بھی مرثیہ گوئی کی شان موجود ہے۔ البتہ یہ کسی خاص شخص کا نہین بلکہ ملک و قوم کا مرثیہ ہے،

رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار ۔۔۔ وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

تھا یہان ہنگامہ ان صحرا نشینون کا کبھی ۔۔۔ بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینون کا کبھی

زلزلے جن سے شہنشاہون کے دربارون مین تھے ۔۔۔ بجلیون کے آشیانے جنکی تلوارون مین تھے

غلغلون سے جسکے لذت گیر اب تک گوش ہے ۔۔۔ کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کیلیے خاموش ہے

آہ اے سسلی سمندر کی ہے تجھ سے آبرو ۔۔۔ رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا مین ہے تو

تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا ۔۔۔ حسن عالم سوز جس کا آتش نظارہ تھا

ہے ترے آثار مین پوشیدہ کسکی داستان ۔۔۔ تیرے ساحل کی خموشی مین ہے انداز بیان

درد اپنا مجھ سے کہہ مین بھی سراپا درد ہون ۔۔۔ جسکی تو منزل تھا مین اس کارواں کی گرد ہون

مین ترا تحفہ سوئے ہندوستان لے جاؤنگا ۔۔۔ خود یہان روتا ہون اورون کو وہان رلواؤنگا

آہ جولانگاہ عالمگیر یعنی وہ حصار ۔۔۔ دوش پر اپنے اٹھائے سیکڑون صدیون کا بار

زندگی سے تھا کبھی معمور اب سنسان ہے
یہ خموشی اسکے ہنگامونکا گورستان ہے

گو سکون ممکن نہین عالم مین اختر کے لیے
فاتحہ خوانی کو یہ ٹھہرا ہے دم بھر کے لیے

رنگ و آبِ زندگی سے گل بدامن ہے زمین
سیکڑون خون گشتہ تہذیبونکا مدفن ہے زمین

خوابگہ شاہون کی ہے یہ منزل حسرت فزا
دیدۂ عبرت! خراج اشک گلگون کر ادا

ہے تو گورستان مگر یہ خاک گردون پایہ ہے
آہ اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے

شورش بزم طرب کیا، عود کی تقریر کیا؟
دردمندانِ جہان کا نالۂ شبگیر کیا؟

عرصۂ پیکار مین ہنگامۂ شمشیر کیا؟
خون کو گرمانے والا نعرۂ تکبیر کیا؟

اب کوئی آواز سوتون کو جگا سکتی نہین
سینۂ ویران مین جانِ رفتہ آسکتی نہین

مصر و بابل مٹ گئے باقی نشان تک بھی نہین
دفترِ ہستی مین انکی داستان تک بھی نہین

آہ مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا
آسمان سے ابرِ آذاری اٹھا برسا گیا،

اس نشاط آباد مین گو عیش بے اندازہ ہے
ایک غم یعنی غمِ ملت ہمیشہ تازہ ہے

دل ہمارے یادِ عہد رفتہ سے خالی نہین
اپنے شاہون کو یہ امت بھولنے والی نہین

دہر کو دیتے ہین موتی دیدۂ گریان کے ہم
آخری بادل ہین اک گذرے ہوئے طوفان کے ہم

ہین ابھی صدہا گہر اس ابر کی آغوش مین
برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش مین

ہو چکا گو قوم کی شانِ جمالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جلالی کا ظہور

مثنوی | ڈاکٹر صاحب نے اردو مین کوئی مستقل مثنوی نہین لکھی، البتہ میر حسن کی مثنوی سحر البیان کی بحر مین ایک ساقی نامہ لکھا ہے، جو اکثر مثنویون کا تمہیدی جزو رہا ہے، اور ڈاکٹر صاحب کی پرجوش طبیعت کے لیے مثنوی کا یہی مستانہ حصہ موزون تھا، اس لیے انھون نے صرف اسی کو لیا اور اسکے ذریعہ سے اپنے پرجوش فلسفۂ خودی کی تبلیغ نہایت مستانہ لہجے مین کی، لیکن پورا ساقی نامہ پرجوش،

متین، سنجیدہ، باوقار اور غلغلہ انگیز مضامین و الفاظ سے بھرا ہوا ہے، اس لیے اسکا انتخاب مشکل ہے، ہم اِدھر اُدھر سے چند منتخب اشعار لیکر درج کرتے ہین،

دمادم روان ہے یمِ زندگی
ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی

یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی
عناصر کے پھندون سے بیزار بھی

یہ عالم یہ بتخانۂ شش جہات
اسی نے تراشا ہے یہ سومنات

چمک اس کی بجلی مین تارے مین ہے
یہ چاندی مین سونے مین پارے مین ہے

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج
اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی مین بند

اندھیرے اجالے مین ہے تابناک
من و تو مین پیدا من و تو سے پاک

ازل اسکے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اسکے پیچھے نہ حد سامنے

اسے واسطہ کیا کم و بیش سے
نشیب و فراز و پس و پیش سے

یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت
یہ عالم کہ ہے زیر فرمانِ موت

یہ عالم یہ بتخانۂ چشم و گوش
جہان زندگی ہے فقط خورد و نوش

خودی کی ہے یہ منزلِ اولین
مسافر یہ تیرا نشیمن نہین

تری آگ اس خاکدان سے نہین
جہان تجھ سے ہے تو جہان سے نہین

جہان اور بھی ہین ابھی بے نمود
کہ خالی نہین ہے ضمیرِ وجود

ہر اک منتظر تیرے یلغار کا
تری شوخیٔ فکر و کردار کا

یہ ہے مقصد گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ | حقیقت ہے آئینہ، گفتار زنگ
فروزان ہے سینے مین شمعِ نفس | مگر تاب گفتار رکھتی ہے بس
اگر یک سرِ موے برتر پرم | فروغِ تجلی بسوزد پرم

مناظر قدرت | شاعرانہ حیثیت سے مناظر قدرت کی خوبی صرف یہ سمجھی جاتی ہے کہ ایک چیز کی ہو بہو تصویر کھینچ دیجائے، لیکن ہمارے نزدیک صرف یہی خوبی کافی نہین ہے، بلکہ یہ تصویر اس طرح کھینچنی چاہیے کہ ہمارے جذبات بھی اس سے متاثر ہون، اور ہم مین رنج وغم، انبساط ومسرت، اور ولولہ وستی کی کیفیت پیدا ہو، اور ڈاکٹر صاحب نے مناظر قدرت پر جو نظمین لکھی ہین ان مین یہ خصوصیت خاص طور پر پائی جاتی ہے، کوہ ہمالہ پر انھون نے جو نظم لکھی ہے اس کے بعض اشعار اور بعض بندون سے اس کا اندازہ ہوگا

ابر کے ہاتھون مین رہوار ہوا کے واسطے | تازیانہ دے دیا برق سر کہسار نے
آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی | کوثر وتسنیم کی موجون کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی | سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراق دلنشین کے ساز کو | اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو
لیلی شب کھولتی ہے آکے جب زلف رسا | دامن دل کھینچتی ہے آبشارون کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا | وہ درختون پر تفکر کا سمان چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پہ | خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پہ

ابر کہسار

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا | ابر کہسار ہون گل پاش ہے دامن میرا
کبھی صحرا کبھی گلزار ہے مسکن میرا | شہر وویرانہ مرا، بحر مرا، بن میرا
کسی وادی مین جو منظور ہو سونا مجھکو | سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھکو

مجھکو قدرت نے سکھایا ہی درافشان ہونا — ناقۂ شاہد رحمت کا حدی خوان ہونا
غم زدائے دلِ افسردۂ دہقان ہونا — رونق بزم جوانانِ گلستان ہونا
بنکے گیسو رخ ہستی پہ بکھر جاتا ہون — شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہون
دور سے دیدۂ امید کو ترساتا ہون — کسی بستی سے جو خاموش گذر جاتا ہون
سیر کرتا ہوا جس دم لب جو آتا ہون — بالیان نہر کو گرداب کی پہناتا ہون
سبزۂ مزرع نوخیز کی امید ہون مین — زادۂ بحر ہون پروردۂ خورشید ہون مین

ابر پر انھون نے ایک نظم اور بھی لکھی ہے جو اس سے زیادہ پرجوش اور مستانہ ہے،

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا — سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سرمن کا
نہان ہوا جو رخِ مہر زیر دامن ابر — ہوائے سرد بھی آئی سوارِ توسنِ ابر
گرج کا شور نہین ہی خموش ہے یہ گھٹا — عجیب میکدۂ بے خروش ہی یہ گھٹا
چمن مین حکمِ نشاط مدام لائی ہے — قبائے گل مین گہر ٹانکنے کو آئی ہے
جو پھول مہر کی گرمی سے سو چلے تھے اٹھے — زمین کی گود مین جو پڑکے سو رہے تھے اٹھے
ہوا کے زور سے ابھرا، بڑھا، اڑا بادل — اٹھی وہ اور گھٹا لو، برس پڑا بادل
عجیب خیمہ ہے کہسار کے نہالون کا — یہین قیام ہو وادی مین پھرنے والون کا

ڈاکٹر صاحب نے اس قسم کی نظمون سے بعض موقعون پر اپنے فلسفۂ خودی کی تبلیغ کا پہلو بھی پیدا کیا ہے، اس لیے وہ اور بھی زیادہ نشاط انگیز ہوگئی ہین، اور شاعرانہ حیثیت سے قصائد کے گریز کی لطیف شکل پیدا ہوگئی ہے، مثلاً صبح کا منظر اس طرح دکھاتے ہین:

آتی ہے مشرق سے جب ہنگامہ در دامن سحر — منزلِ ہستی سے کر جاتی ہے خاموشی سفر
محفلِ قدرت کا آخر ٹوٹ جاتا ہی سکوت — دیتی ہے ہر چیز اپنی زندگانی کا ثبوت

چہچہاتے ہین پرندے پاکے پیغامِ حیات
باندھتے ہین پھول بھی گلشن مین احرامِ حیات

مسلمِ خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو
وہ چمک اٹھا افق گرمِ تقاضا تو بھی ہو

وسعتِ عالم مین رہ پیما ہو مثلِ آفتاب
دامنِ گردون سے ناپیدا ہون یہ داغِ سحاب

کھینچ کر خنجر کرن کا، پھر ہو سر گرمِ ستیز
پھر سکھا تاریکیٔ باطل کو آدابِ گریز

تو سراپا نور ہے خوشتر ہے عریانی تجھے
اور عریان ہو کے لازم ہی خود افشانی تجھے

ہاں نمایان ہو کے برق دیدۂ خفاش ہو
اے دلِ کون و مکان کی رازِ مضمر فاش ہو

ڈاکٹر صاحب نے اور بھی مختلف عنوانات مثلاً چاند، جگنو، صبح کا ستارہ، چاند اور تارے، ایک شام ستارہ، اور شعاعِ آفتاب پر نظمین لکھی ہین لیکن سب کو مناظرِ قدرت مین شامل کر لینا غلطی ہے، اور غالبًا یہ غلطی بہت سے لوگون نے کی ہے،

قطعات یا رباعیات حکما اور صوفیا نے فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات کو رباعیون مین ادا کیا ہے، اور ڈاکٹر صاحب نے بھی ان کی تقلید کی ہے، اور دو دو شعر کے بہت سے قطعے لکھے ہین جنکو صورۃً تو رباعی نہین کہہ سکتے، کیونکہ وہ رباعی کی متداول بحرون مین نہین ہین، لیکن معنیً ان کو قطعہ نما رباعی کہہ سکتے ہین،

ان قطعات یا رباعیات کی ابتدا انھون نے فارسی شاعری سے کی، اور پیامِ مشرق مین اس قسم کے بہت سے قطعے لکھے، اس کے بعد اپنی شاعری کے چوتھے دور مین بہت سے قطعے لکھے جو بالِ جبریل اور ارمغانِ حجاز مین موجود ہین، چونکہ ان سے ڈاکٹر صاحب کے خیالات کے تنوع اور فراوانی کا اندازہ ہوتا ہے اس لیے وہ ان کی شاعری کا اہم جزء ہین، اور ہم اسی حیثیت سے انکا انتخاب درج کرتے ہین،

خدا سے نرم لہجے مین ایک شکایت
ترے شیشے مین مے باقی نہین ہے
بتا کیا تو مرا ساقی نہین ہے!

ع یعنی خودی،

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم　　بخیلی ہے یہ رزّاقی نہین ہے

یہ ان کی طویل نظم شکوہ کا خلاصہ اور اختصار ہے۔

ایک پاکیزہ آرزو:

جوانون کو مری آہ سحر دے　　پھران شاہین بچون کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے　　مرا نورِ بصیرت عام کردے

آزادی پر فخر و ناز:

کرم تیرا کہ بے جوہر نہین مین　　غلامِ طغرل و سنجر نہین مین

جہان بینی مری فطرت ہے لیکن　　کسی جمشید کا ساغر نہین مین

صوفیہ نے دل کو جام جم سے تشبیہ دی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کو اس سے بھی بوے غلامی آتی ہے کہ وہ ایک شاہی چیز ہے، اس لیے اس نسبت سے بھی انکار کرتے ہین،

عشق کے گوناگون مظاہر

کبھی آوارہ و بے خانمان عشق　　کبھی شاہ شہان نوشیروان عشق

کبھی میدان مین آتا ہے زرہ پوش　　کبھی عریان و بے تیغ و سنان عشق

کبھی تنہائیِ کوہ و دمن عشق　　کبھی سوز و سرور و انجمن عشق

کبھی سرمایۂ محراب و منبر　　کبھی مولا علی خیبر شکن عشق

انسان کا بلند مقام اب تک نامعلوم ہے

مکانی ہون کہ آزاد مکان ہون؟　　جہان مین ہون کہ خود سارا جہان ہون؟

وہ اپنی لامکانی مین ہین مست　　مجھے اتنا بتا دین مین کہان ہون؟

فلسفہ و حکمت سے عشق و مستی کا نشہ اتر جاتا ہے:

جمالِ عشق و مستی نے نوازی | جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدر | زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی

اس قطعہ مین جمال، جلال، کمال اور زوال کے ہم قافیہ الفاظ نے جو شعر کے ہر مصرع کے اول مین آئے ہین نہایت لطیف لفظی ترنم اور معنوی جامعیت پیدا کی ہے،

عقل پر عشق کی فضیلت:

ترے سینے مین دم ہے دل نہین ہے | ترا دم گرمیٔ محفل نہین ہے
گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور | چراغِ راہ ہے منزل نہین ہے

امت محمدیؐ مین شامل ہونے پر فخر و ناز اور اس امت کی فضیلت فرشتون پر:

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو | فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صید زبون افرشتہ و حور | کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو

مسلمانون مین جذبۂ عشق کا فقدان:

محبت کا جنون باقی نہین ہے | مسلمانون مین خون باقی نہین ہے
صفین کج، دل پریشان سجدہ بیذوق | کہ جذب اندرون باقی نہین ہے

عقل سے قلب کے مکاشفات و اسرار نہین معلوم ہو سکتے،

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے | خرد کیا ہے، چراغِ رہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہین کیا کیا | چراغِ رہگذر کو کیا خبر ہے

مسلمانون مین اعمال و عبادات کی کمی نہین، صرف خودی کا فقدان ہے:

رگون مین وہ لہو باقی نہین ہے | وہ دل وہ آرزو باقی نہین ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج | یہ سب باقی ہین تو باقی نہین ہے

قومی اور وطنی نظمیں ڈاکٹر صاحب سے پہلے قومی اور وطنی نظمیں قوم و ملک کے تنزل و مصائب و معائب کی طویل داستان ہوتی تھیں، اور ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی قومی نظموں کا بھی یہی انداز ہے، چنانچہ فریادِ امت میں فرماتے ہیں:

کیا کہوں امتِ مرحوم کی حالت کیا ہے ۔۔۔ جس سے برباد ہوئے ہم وہ مصیبت کیا ہے

مولانا حالی کا طرز یہی ہے، اور ڈاکٹر صاحب نے ان ہی کی تقلید کی ہے، مولانا شبلی اور مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے اسلاف کے پرفخر کارنامے بھی بیان کیے ہیں، اور اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کو ان کے تنزل پر شرم و غیرت دلائی ہے، لیکن بہر حال اپنی پستی کا اظہار خودداری کے خلاف ہے۔ اور اس سے دلوں میں پست جذبات پیدا ہوتے ہیں، اس لیے ڈاکٹر صاحب نے اس انداز کو چھوڑکر اپنی وطنی اور قومی نظموں کی بنیاد فخر و دعوی پر رکھی جو بلند خیالی کے ساتھ دلوں میں جوش و ولولہ پیدا کرتا ہے،

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ۔۔۔ ہم بلبلیں ہیں اسکی وہ گلستاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا ۔۔۔ وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اسکے ہزاروں ندیاں ۔۔۔ گلشن ہے جنکے دم سے رشکِ جناں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے ۔۔۔ اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا ۔۔۔ مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے ۔۔۔ آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا
دنیا کے بتکدے میں پہلا وہ گھر خدا کا ۔۔۔ ہم اسکے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا
تیغوں کے سائے میں ہم پلکر جواں ہوے ہیں ۔۔۔ خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا
مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری ۔۔۔ تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا
باطل سے دبنے والے ای آسماں نہیں ہم ۔۔۔ سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

اے گلستان اندلس وہ دن ہین یاد تجھکو | تھا تیری ڈالیون مین جب آشیان ہمارا
اے موج دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو | ابتک ہے تیرا دریا افسانہ خوان ہمارا
اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا[1] | ہوتا ہے جادہ پیما پھر کاروان ہمارا

چشتی نے جس زمین مین پیغام حق سنایا | نانک نے جس چمن مین وحدت کا گیت گایا
تاتاریون نے جس کو اپنا وطن بنایا | جس نے حجازیون سے دشتِ عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

یونانیون کو جس نے حیران کر دیا تھا | سارے جہان کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا | ترکون کا جس نے دامن ہیرون سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسمان سے | پھر تاب دیکے جس نے چمکائے کہکشان سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکان سے | میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہان سے

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

بندے کلیم جسکے پربت جہان کا سینا | نوح نبی کا آکر ٹھہرا جہان سفینا
رفعت ہے جس زمین کی بام فلک کا زینا | جنت کی زندگی ہے جسکی فضا مین جینا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

بالخصوص شکوہ مین تو مسلمانون کی پوری مذہبی تاریخ کا پرفخر لہجے مین اعادہ کر دیا ہے، اور اس سے دنیا استحقاق ثابت کیا ہے، جواب شکوہ مین اگرچہ مسلمانون کے معائب بھی بیان کیے ہین، لیکن خود اپنی زبان سے نہین بلکہ خدا کی زبان سے ،

---

[1] بانگ درا کا نام اسی شعر کی بنیاد پر رکھا گیا ہے۔

عرب کے جاہلی شعرا مین عمرو بن کلثوم نے ایک فخریہ قصیدہ لکھا تھا، جو اسقدر پرجوش تھا کہ اسکے قبیلہ تغلب کا ہر بچہ بچپن ہی سے اس کے اشعار سیکھتا اور یاد کرتا تھا، اہل تاریخ کا بیان ہے کہ اس قصیدہ کی بدولت کئی سو برس تک اس قبیلہ مین شجاعت اور دلیری کے اوصاف قائم رہے، اور آج بھی یہ قصیدہ افسردہ دلون کو گرما دیتا ہے،

اردو زبان مین ڈاکٹر صاحب کی قومی اور وطنی نظمین اس قصیدہ کا پورا جواب ہین، اور اسی وجہ سے ان کو اسقدر قبولِ عام حاصل ہوا کہ بچے، جوان، اور بوڑھے سب کی زبانون پر چڑھ گئین،

ظریفانہ شاعری | اکبر الہ آبادی کی تقلید مین ڈاکٹر صاحب نے چند ظریفانہ اشعار بھی لکھے ہین، اور بعض موقعون پر کامیاب بھی ہوئے ہین، مثلاً

لڑکیان پڑھ رہی ہین انگریزی ڈھونڈھ لی قوم نے فلاح کی راہ

روشِ مغربی ہے مدنظر وضع مشرق کو جانتی ہین گناہ

یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

آخری مصرع مین ایہام ہے، پردہ سے عورتون کا پردہ بھی مراد ہے اور تھیٹر کا بھی۔

مشرق مین اصول دین بنجاتے ہین مغرب مین مگر مشین بنجاتے ہین

رہتا نہین ایک بھی ہمارے پلے وان ایک کے تین تین بنجاتے ہین

یعنی ہمارے پاس ایک خدا بھی نہین اور یورپ مین تثلیث نے تین خدا پیدا کر دیے ہین، اور یا یہ کہ ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہین رہتا اور یورپ مین ایک پیسے کے تین پیسے ہو جاتے ہین، اکبر الہ آبادی کی ظریفانہ شاعری مین قافیون کی جدت بڑا لطف پیدا کر دیتی ہے، اور ڈاکٹر صاحب کے ان اشعار مین بھی قافیہ کی یہ جدت موجود ہے، اور دوسرے اشعار مین بھی یہ جدت پائی جاتی ہے،

تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجیے

بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق | کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجیے

نادان تھے اسقدر کہ جانی عرب کی قدر | حاصل ہوا یہی نہ بچے مار پیٹ سے

مغرب مین ہے جہاز بیابان شتر کا نام | ترکون نے کام کچھ نہ کیا اس فلیٹ سے

انگریزی الفاظ کو قافیہ مین لانا اکبر ہی کی تقلید ہے،

بعض اشعار مین ہندوستان کے بعض قانونی مسائل پر ظریفانہ انداز مین اظہار خیال کیا ہے۔

ہاتھون سے اپنے دامن دنیا نکل گیا | رخصت ہوا دلون سے خیال معاد بھی

قانون وقف کے لیے لڑتے تھے شیخ جی | پوچھو تو وقف کے لیے ہے جائداد بھی

رات مچھر نے کہدیا مجھ سے | ماجرا اپنی ناتمامی کا

مجھکو دیتے ہین ایک بوند لہو | صلہ شب بھر کی تشنہ کامی کا

اور یہ بسوہ دار بے زحمت | پی گیا سب لہو اسامی کا

لیکن بااینہمہ وہ اس صنف مین مقلد ہین، مجتہد نہین،
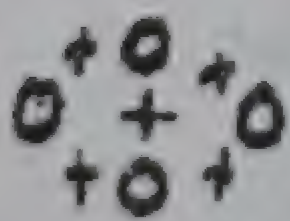
فارسی شاعری

تیموریون کے دور مین کشمیر فارسی شاعری کا ایک بڑا مرکز بن گیا تھا، تیموری سلاطین مین اکبر، جہانگیر اور شاہ جہان سیر و تفریح کے لیے اکثر کشمیر جایا کرتے تھے، اور ان کے ساتھ پایۂ تخت کے مشہور شعرا، بھی ہوتے تھے، جن کی وجہ سے کشمیر مین فارسی شاعری کا خاص ذوق پیدا ہوگیا تھا اور فارسی غزل گوئی کی ایک خاص طرز مثالیہ پیدا ہوگئی تھی، جس کو کلیم، مرزا صائب اور غنی کشمیری نے خاص طور پر ترقی دی تھی، اور اس کی وجہ مولانا شبلی مرحوم نے شعر العجم جلد سوم (ص ۲۱۹) مین یہ لکھی ہے کہ

یہ تینون شاعر کشمیر مین مدت تک ساتھ ہمدم و ہم قلم رہے تھے، اور باہم مشاعرے رہتے تھے، اس لیے قیاس یہ ہے کہ ہم صحبتی کے اثر نے اس طرز کو مشترک جولانگاہ بنا دیا، علی قلی سلیم بھی مثالیہ مین کمال رکھتا ہے، اور اس کی بھی وجہ شاید یہی ہو کہ سلیم بھی یہین (کشمیر) مین مدفون ہے۔

اس بنا پر کشمیریون مین قدرتی طور پر فارسی زبان کے ساتھ مناسبت کا پیدا ہونا ضرور تھا۔ اس قدرتی مناسبت کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے جس زمانے مین تعلیم و تربیت حاصل کی، اس مین قدیم مکتبی نظام تعلیم جس کا لازمی جزو فارسی زبان تھی قائم تھا، اور ڈاکٹر صاحب نے اس طریقۂ تعلیم سے کافی فائدہ اٹھایا تھا، اور اسکول کے اوقات کے بعد مساجد و مکاتب مین مختلف مولویون کی خدمت مین حاضر ہوکر فارسی پڑھا کرتے تھے، وہ خود فرماتے ہین کہ

لوگون کو تعجب ہوتا ہے کہ اقبال کو فارسی کیونکر آگئی، جب کہ اس نے اسکول یا کالج

مین یہ زبان نہین پڑھی، انھین یہ معلوم نہین کہ مین نے فارسی زبان کی تحصیل کے لیے اسکول ہی کے زمانے مین کسقدر محنت اٹھائی اور کتنے اساتذہ سے استفادہ کیا،[1]

مولوی سید میر حسن صاحب کے فیض صحبت نے اس ذوق کو اور بھی جلا دی، اور لوگون کا خیال ہے کہ قیام یورپ کے زمانے مین ڈاکٹر نکلسن اور براؤن کے فیض صحبت نے اس کو اور بھی چمکا دیا، بہر حال ڈاکٹر صاحب کو فارسی زبان اور فارسی شاعری سے ابتدا ہی سے دلچسپی اور کسی دو نون قسم کی مناسبت پیدا ہو گئی تھی، اور وہ جستہ جستہ فارسی شعر کہنے لگے تھے، چنانچہ ۱۹۰۲ء مین منشی سراج الدین نے کشمیر سے ان کی خدمت مین چار انگشتریان تحفۃً بھیجی تھین ان کے تشکر یہ مین انھون نے ایک طویل نظم لکھی ہے جس کا پہلا بند اردو مین اور دوسرا بند فارسی مین ہے، یہ نظم ان کے مطبوعہ کلام مین شامل نہین ہے لیکن اقبال نامہ صفحہ ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹ مین پوری درج ہے، اس کے بعد ۱۹۰۵ء مین ڈاکٹر اقبال نے لاہور سے قطع تعلق کر کے یورپ گئے تو انھون نے نالۂ فراق کے عنوان سے ان کے متعلق جو الوداعی نظم لکھی وہ ان کی شاعری کے دور اول مین شامل ہے، لیکن اس کی ٹیپ کے متعدد اشعار فارسی زبان مین ہین،

تا ز آغوش وداعش داغ حیرت چیدہ است	ہمچو شمع کشتہ در چشمم نگہ خوابیدہ است
ایہ رحمت دامن از گلزار من برچید و رفت	اندکے بر غنچہ ہاے آرزو تابید و رفت
شور لیلی کو؟ کہ باز آرایش سودا کند	خاک مجنون را غبار خاطر صحرا کند

اسی دور کی ایک نظم بلال ہے، اور اس مین بھی فارسی اشعار کی آمیزش ہے،

تری نظر کو رہی دید مین بھی حسرت دید	خنک دلے کہ تپید و دمے نیاسائید
تپش ز شعلہ گرفتند و بر دل تو زدند	چہ برق جلوہ بخاشاک حاصل تو زدند

التجائے مسافر کے پہلے بند کی ٹیپ یہ ہے:

[1] اقبال نامہ ص ۳، ۴

اگر سیاہ دلم داغ لالہ زار تو ام | اگر کشادہ جبینم گل بہار تو ام

لیکن وہ تک انھون نے فارسی زبان مین کوئی مستقل غزل یا مسلسل نظم نہین لکھی تھی، شیخ عبد القادر صاحب کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ (یورپ مین) وہ ایک دوست کے ہان مدعو تھے جہان ان سے فارسی اشعار سنانے کی فرمایش ہوئی اور پوچھا گیا کہ وہ فارسی شعر کہتے ہین یا نہین؟ انھین اعتراف کرنا پڑا کہ انھون نے سوائے ایک آدھ شعر کہنے کے فارسی لکھنے کی کوشش نہین کی، مگر کچھ ایسا وقت تھا اور اس فرمایش نے ایسی تحریک ان کے دل مین پیدا کی کہ دعوت سے واپس آکر بستر پر لیٹے ہوئے باقی وقت وہ شاید فارسی شعر کہتے رہے، اور صبح اٹھتے ہی مجھ سے ملے تو دو تازہ غزلین فارسی مین تیار تھین، جو انھون نے مجھے زبانی سنائین،[۱] لیکن اس کے بعد انھون نے یورپ مین کوئی فارسی نظم نہین لکھی، اور ہندوستان مین واپس آنے کے بعد بھی چار پانچ برس تک ان کی کوئی فارسی نظم منظر عام پر نہین آئی، اور غالباً اس زمانے مین وہ اپنے آپ کو فارسی زبان مین شعر کہنے کیلیے تیار کرتے رہے، ان کے کتب خانے مین اکثر فارسی شعراء کے دواوین موجود تھے،[۲] اور انھون نے اپنے کلام مین جو تضمینین کی ہین ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھون نے نقیبی شاملو، ملا عرشی، فیضی، رضی، ملک قمی، صائب، غنی، بیدل، خاقانی وغیرہ کے کلام کا مطالعہ کیا تھا، اور یہ مطالعہ غالباً اسی غرض سے کیا گیا تھا کہ ان کی آیندہ فارسی شاعری مشہور فارسی شعراء کے زبان اور طرز بیان سے منحرف اور بیگانہ نہ ہونے پائے، لیکن یہ پتہ نہین چلتا کہ انھون نے کن اسباب سے فارسی شاعری کی طرف توجہ کی، لوگون نے قیاسی وجہین بہت سی بیان کی ہین، شیخ عبد القادر صاحب نے مقدمۂ بانگ درا مین لکھا ہے کہ انھون نے یورپ مین حالات تصوف یعنی الہیات ایران پر کتاب لکھنے کے لیے جو کتب بینی کی اس نے ان کو اس طرف مائل کیا، اس کے ساتھ انھون نے یورپ مین جو دو غزلین

---

[۱] مقدمۂ بانگ درا۔ [۲] البیان دسمبر ۱۹۳۹ء

کہیں ان سے بھی ان کو اپنی فارسی گوئی کی قوت کا حال معلوم ہوا جس کا انھوں نے پہلے اس طرح امتحان نہیں کیا تھا"، پروفیسر عبدالقادر سروری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا پیغام ہندوستان سے باہر دوسرے اسلامی ممالک میں بھی پہنچانا چاہتے تھے، لیکن اردو زبان صرف ہندوستان تک محدود ہے اس لیے انھوں نے فارسی زبان کو اپنی شاعری کا ذریعہ بنالیا تاکہ مسلمانوں کا زیادہ حصہ اس کو پڑھ سکے۔[1]

اور ڈاکٹر صاحب کے متعدد اشعار سے بھی اشارۃً اس کی تائید ہوتی ہے،

عجم از نغمہ ہاے من جوان شد | زسودایم متاعِ او گران شد
ہجومے بود رہ گم کردہ در دشت | ز آواز درایم کاروان شد

عجم از نغمہ ام آتش بجان است | صداے من دراے کاروان است
حدی را تیز تر خوانم چو عرفی | کہ رہ خوابیدہ و محمل گران است

لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات کے ادا کرنے کے لیے دنیا کی زبانوں میں فارسی زبان سے زیادہ بہتر کوئی زبان نہیں، عربی زبان نہایت وسیع ہے، اور عربی شعراء کی کثرت کا شمار نہیں، بایں ہمہ عربی شاعری فلسفہ و تصوف سے بالکل تہی دامن ہے، اس لیے یورپ سے پلٹنے کے بعد جب ڈاکٹر صاحب نے فلسفیانہ خیالات ادا کرنے چاہے تو انھوں نے اردو کو چھوڑ کر اس قسم کی شاعری کے لیے فارسی زبان اختیار کی، شیخ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں:

جوں جوں ان کا مطالعہ علم فلسفہ کے متعلق گہرا ہوتا گیا اور دقیق خیالات کے اظہار کو جی چاہا تو انھوں نے دیکھا کہ فارسی کے مقابلہ میں اردو کا سرمایہ بہت کم ہے، اور فارسی میں کئی فقرے اور جملے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایسے ملتے ہیں جن کے مطابق اردو میں فقرے ڈھالنے

[1] آثار اقبال ص ۱۳۱

آسان نہین، اس یسے وہ فارسی کی طرف مائل ہو گئے‘‘

ڈاکٹر صاحب کے بعض اشعار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ مثنوی اسرار خودی مین فرماتے ہین

گرچہ ہندی درعذوبت شکر است　　طرز گفتار دری شیرین تر است

فکر من از جلوہ اش مسحور گشت　　خامہ من شاخ نخل طور گشت

دیدہ از خاک عجم نورانی است　　لاجرم طرز نگہ تورانی است

پارسی از رفعت اندیشہ ام　　در خورو با فطرت اندیشہ ام

بہرحال متعدد اسباب سے ڈاکٹر صاحب نے فارسی زبان مین شاعری شروع کی اور ان کی بلند ہمتی نے اس کا آغاز مثنوی سے کیا جو شاعری کی سب سے مشکل صنف ہے، اس مثنوی سے ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا نیا دور شروع ہوا، اب تک ان کا نظریہ ’’ادب برائے ادب‘‘ تھا یا کم از کم ادب برائے زندگی کے نظریہ کو انھون نے لازمی طور پر اختیار نہین کیا تھا، لیکن اب ان کا نظریہ ’’ادب برائے زندگی‘‘ ہو گیا، اور اب وہ شعر برائے شعر اور ادب برائے ادب سے بیزاری ظاہر کرنے لگے، اور مثنوی اسرار خودی مین اس قسم کی شاعری سے علانیہ برأت ظاہر کی،

شاعری زین مثنوی مقصود نیست　　بت پرستی بت گری مقصود نیست

ڈاکٹر صاحب کی فارسی شاعری کے متعلق ایک اہم سوال یہ ہے کہ وہ شعرائے ایران مین کس شاعر کے اثر سے متاثر ہین؟ ڈاکٹر صاحب نے جابجا مولانا روم کا نام نہایت جوش وعقیدت کے ساتھ لیا ہے، اور یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ ناچیز قطرہ انہی کے فیض سے گوہر آبدار ہوا ہے، چنانچہ مثنوی اسرار خودی مین جس سے ان کی فارسی گوئی کی ابتدا ہوئی ہے، فرماتے ہین:

باز بر خوانم ز فیض پیر روم　　دفتر سربستہ اسرار علوم

موجم و در بحر او منزل کنم　　تا در تابندہ حاصل کنم

اس کے علاوہ انھون نے متعدد شعرائے ایران مثلاً انیسی شاملو، ابوطالب کلیم، اور صائب وغیرہ کے بعض اشعار پر تضمینین کی ہین، اور اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ انھون نے ان شعرا کا اثر قبول کیا ہے، چنانچہ ڈاکٹر سید عبداللہ ایم، اے اپنے مضمون "تشریح اقبال" مین لکھتے ہین:

اقبال کی زبان حکیمانہ اصطلاحون اور ترکیبون سے پر ہے، عام خصوصیات کے اعتبار سے اقبال پر حافظ، فغانی، جلال اسیر، علی قلی سلیم، سالک یزدی، رضی دانش، ابوطالب کلیم، طالب وغیرہ کی زبان کا بڑا اثر ہے، لیکن حکیمانہ مضامین کے لیے انھون نے رومی، خاقانی، بیدل اور طالب کی زبان استعمال کی ہے۔[1]

دوسرے موقع پر لکھتے ہین:

اقبال کے کلام مین تضمینات بھی بہ کثرت ہین، بانگ درا، پیام مشرق، جاوید نامہ، ضرب کلیم، زبور عجم اور بال جبریل مین شعرا کے اشعار کی بہت سی تضمینین ملتی ہین جن مین سے بعض مشہور و معروف ہونے کی وجہ سے محتاج تعارف نہین، مگر بعض ایسی بھی ہین جنکا مجمل علم اقبال کے مطالعہ کرنے والے کے لیے بیحد ضروری ہے، مثلاً انیسی شاملو، ملا عرشی، فیضی، رضی دانش، ملک قمی، صائب، غنی، مرزا مظہر جانجانان وغیرہ کی تضمینات، تضمینون کے سلسلے مین یہ بھی بتانا ضروری ہوگا کہ کسی خاص شاعر کو اقبال نے کیون پسند کیا اور اسی شعر کو کیون تضمین کے لیے انتخاب کیا گیا ہے، اس مین کیا خاص خوبی ہے، مین نے اس بحث کو اپنے ایک مضمون "اقبال کے محبوب فارسی شاعر" مین قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔[2]

---

[1] آثار اقبال ص ۲۶۷، [2] براہ کرم جناب ممدوح نے ہم کو اس مضمون کی نقل عنایت فرمائی ہے جسکا خلاصہ یہ ہے: (۱) شعرائے فارسی مین ڈاکٹر صاحب نے سب سے زیادہ صوفی اور عارف شاعرون کے حکیمانہ افکار و خیالات سے فائدہ اٹھایا ہے، مثلاً سنائی، عطار، اور مولانا روم وغیرہ (۲) انکے بعد وہ ان شاعرون کو پسند کرتے ہین جنکے کلام مین زندگی، توانائی، جوش اور عزیمت کے خیالات ملتے ہین، مثلاً عرفی، (۳) یہ پسندیدگی تو معانی و مطالب کے لحاظ سے ہے، لیکن جہانتک بان و بیان کا تعلق ہے، ان پر خواجہ حافظ کی رنگین نوائی کا بڑا اثر پڑا ہے، لیکن سب سے زیادہ اس معاملہ مین وہ فیضی کے متبع ہین۔

ان شعراء کے حالات معلوم ہونے کے بعد یہ سمجھنا نسبتہً آسان ہو جائے گا کہ ان کی سیرت اور شاعری مین اقبال کے لیے کیا خاص وجہ کشش تھی، ان تضمینون کا جائزہ لینا اس اعتبار سے بھی ہمارے لیے مفید ہے کہ ہم ان کے ذریعہ اقبال کی محبوب کتابون اور مطالعہ کتب کے سلسلے مین ان کے طریقون سے بھی واقفیت حاصل کرسکتے ہین"[1]

اصل یہ ہے کہ شاعری الفاظ و معانی دونون کے مجموعے کا نام ہے، اور جہانتک معانی و مطالب کا تعلق ہے، ڈاکٹر صاحب نے فلسفۂ خودی کے ایک اہم جزو یعنی عشق کو مولانا روم ہی سے اخذ کیا ہے، بلکہ خود فلسفۂ خودی کا تخیل بھی انہی سے ماخوذ ہے، چنانچہ مولانا روم کی ایک غزل کا ایک مشہور شعر یہ ہے:

ما ز فلک برتریم، وز ملک افزون تریم زین دو چرا بگذریم منزل ما کبریاست

اور ڈاکٹر صاحب اس شعر سے جو فلسفۂ خودی کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے خاص طور پر متاثر ہوئے ہین اور اسی زمین مین ایک مستقل غزل لکھی ہے جس کا آخری شعر یہ ہے:

شعلۂ در گیر زد بر خس و خاشاکِ من مرشد رومی کہ گفت "منزل ما کبریاست"

لیکن جہان تک الفاظ و طرز بیان کا تعلق ہے ڈاکٹر صاحب نے متاخرین شعرائے ایران کی شستہ زبان اور خواجہ حافظ کا پر جوش انداز بیان اختیار کیا ہے، اور اس نے ان کے یہان مولانا روم سے زیادہ مستی اور رنگینی پیدا کر دی ہے، مثلاً

چو موج مست خودی باش و سر بطوفان کش ترا کہ گفت کہ بنشین و پا بدامن کش
بقصد صید پلنگ از چمن سرا بہ خیز بکوہ رخت کشا خیمہ در بیابان کش
بہ مہر و ماہ بکمند گلو فشار انداز ستارہ را ز فلک گیر و در گریبان کش
گرفتم اینکہ شراب خودی بسے تلخ است بدرد خویش نگر زہر مایہ درمان کش

[1] آثار اقبال ص ۲۷۲، ۲۷۳

بیا کہ ساقیِ گل چہرہ دست بر چنگ است — چمن ز باد بہاران جواب ارژنگ است
حنا ز خونِ دلِ نو بہار می بندد — عروس لالہ چہ اندازہ تشنۂ رنگ است
نگاہ مے رسد از نغمۂ دل افروزے — بمعنئ کہ برو جامۂ سخن تنگ است
بچشمِ عشق نگر تا سراغ او گیری — جہان بچشمِ خرد سیمیا و نیرنگ است
ز عشق درسِ عمل گیر ہر چہ خواہی کن — کہ عشق جوہرِ ہوش است و جانِ فرہنگ است
تو قدرِ خویش نہ دانی بہا ز تو گیرد — وگرنہ لعلِ درخشندہ پارۂ سنگ است

اصناف سخن کے لحاظ سے ڈاکٹر صاحب کا فارسی کلام غزل، قطعہ، رباعی، مثنوی، اور مختلف قسم کی نظمون مین منقسم ہے، مرثیہ، نوحہ یا وطنی اور قومی نظمین اس مین نہین ہین، ان اصناف پر ریویو کرنے سے پہلے یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ڈاکٹر صاحب کی شاعری جسقدر مختصر ہوتی ہے اسی قدر اس مین شاعرانہ لطافت، شاعرانہ زور اور شاعرانہ رنگینی زیادہ پائی جاتی ہے، اور جس قدر اس مین طوالت پیدا ہوتی جاتی ہے اسی قدر ان چیزون مین کمی آجاتی ہے، اس لیے ان کی شاعری مین سب سے مقدم چیز غزل ہے جس کے مضامین صرف ایک شعر مین ختم ہو جاتے ہین، اور ہم سب سے پہلے اسی پر ریویو کرتے ہین،

غزل ڈاکٹر صاحب نے بالِ جبریل مین جو غزلین اردو زبان مین لکھی ہین ان کے زیادہ تر مضامین تغزل سے بیگانہ ہین، لیکن ان کی فارسی غزلین تغزل کا بے مثل نمونہ ہین، الفاظ کی شیرینی اور نرمی کے ساتھ مضامین مین نہایت سوز و گداز پایا جاتا ہے، اور ان غزلون مین انھون نے خاراشگافی کے بجائے شیشہ سازی کی ہے،

حلقہ بستند سرِ تربتِ من نوحہ گران — دلبران، زہرہ وشان، گلبدنان، سیم بران
بر سرِ بام آ نقاب از چہرہ بیباکانہ کش — نیست در کوے تو چون من آرزومندے دگر

بسکہ غیرت می برم از دیدۂ بیناے خویش   از نگہ باقم بہ رخسار تو رو بند دگر

یک نگہ، یک خندۂ دزدیدہ، یک تابندہ اشک   بہر پیمان محبت نیست سوگندے دگر[1]

پئے نظارۂ روے تو مے کنم پاکش   نگاہ شوق بہ جوے سرشک مے شویم

محبت چون تمام افتد رقابت از میان خیزد   بہ طوف شعلۂ پروانہ با پروانہ می سازد[2]

کو آن نگاہ ناز کہ اول دلم ربود   عمرت دراز باد ہمان تیرم آرزوست

حسرت جلوۂ آن ماہ تمامے دارم   دست بر سینہ نظر بر لب بامے دارم

ہر کس نگہے دارد، ہر کس سخنے دارد   در بزم تو مے خیزد ا فسانہ ز افسانہ

من بندۂ بے قیدم شاید کہ گریزم باز   این طرۂ پیچان را در گردنم آویزی

دام زگیسوان بدوش زحمت گلستان بری   صید چرا لمی کنی طائر بام خویش را

ببالینم بیا یکدم نشین کز در مہجوری   تہی پیمانۂ بزم ترا پیمانہ لبریز است

اشارتہاے پنہان خانمان برہم زند لیکن   مرا آن غمزہ مے باید کہ بیباک است و خونریز است

چہ شود اگر خرامی بسراے کاروانے   کہ متاع ناروایش دلکی است پارہ پارہ

بامید آن کہ روزے بشکار خواہی آمد   ز کمند شہریاران رم آہوانہ دارم

پہلا مصرع امیر خسرو کا ہے، ان کا پورا شعر یہ ہے،

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف   بامید آن کہ روزے بشکار خواہی آمد

ڈاکٹر صاحب نے اس کے دوسرے مصرع کو لیکر بے انتہا ترقی دی ہے، اگرچہ شوق شہادت مین سر کو ہاتھ پر لے کر جانا جانبازی کی بہت بڑی دلیل ہے، لیکن معشوق کے جال مین

---

[1] یہ شعر خانخانان کے اس مصرع سے ماخوذ ہے: "نگاہ اہل محبت تمام سوگند است"

[2] اس شعر مین غنی اور صائب کا مثالیہ رنگ ہے،

پھنسنے کے لیے دوسرون کے جال سے بالخصوص جب وہ جال بادشاہون کا ہو ہرن کی طرح حسبت کر کے نکلنا اور بھی زیادہ شوق کی دلیل ہے، اور اس مین شوق و نیازمندی کے ساتھ ایک پرجوش جذبۂ ولولہ بھی پایا جاتا ہے،

بخلوتش چو رسیدی نظر بادہ مکشا — کہ آن دمے است کہ کار از نظارہ میگذرد

سوز و گداز زندگی لذت جستجوے تو — راہ چو مار مے گزو گر نروم بسوے تو

سینہ کشادہ جبرئیل از بر عاشقان گذشت — تا شررے بادفتد ز آتش آرزوے تو

من بتلاش تو روم یا بتلاش خود روم — عقل و دل و نظر ہمہ گم شدگان کوے تو

از چمن تو رستہ ام قطرۂ شبنمے بہ بخش — خاطر غنچہ واشود کم نشود ز جوے تو

تو عیار کم عیاران تو قرار بے قراران — تو دوائے دلفگاران نگر اینکہ دیریابی

عشق انداز طپیدن ز دل ما آموخت — شرر ماست کہ بر جست و بہ پروانہ رسید

سوز و گداز کے ساتھ جابجا خواجہ حافظ کی سرمستیان بھی پائی جاتی ہین، اور ان مین انھی کا جوش بیان بھی ہوتا ہے،

بزم بباغ و راغ کش، زخمہ بتار چنگ زن — بادہ بخور، غزل سرائے، بند کشا قباے را

از بزم جہان خوشتر، از حور و جنان خوشتر — یک ہمدم فرزانہ، وز بادہ دو پیمانہ

برخیز کہ فرودین افروخت چراغ گل — برخیز دمے بنشین با لالۂ صحرائی

فصل بہار اینچنین، بانگ ہزار اینچنین — چہرہ کشا، غزل سرا، بادہ بیار اینچنین

ساقیا بر جگرم شعلۂ نمناک انداز — دگر آشوب قیامت بکف خاک انداز

او بہ یک دانۂ گندم بزمینم انداخت — تو بیک جرعۂ آب آنسوے افلاک انداز

عشق را بادۂ مرد افگن و پرزور بدہ — لاے دین بادہ بہ پیمانۂ ادراک انداز

حکمت و فلسفہ کرد است گران خیز مرا
خضرمن از سرم این بار گران پاک انداز

ازان آبے کہ در من لالہ کارو ساتگینے دہ
کف خاکِ مرا ساقی بیاد فرو دینے دہ

گہے پیچد جہان بر من گہے من بر جہان پیچم
بگردان بادہ تا بیرون ازین پیچاپک می آیم

یاد ایامیکہ خوردم بادہا با چنگ و نے
جام مے در دست من مینائے مے در دست مے

عاشقانہ اور رندانہ مضامین کے علاوہ ان کا پورا فلسفۂ خودی اپنے تمام اجزاء و لوازم کے ساتھ ان کی فارسی غزلون مین موجود ہے، اور ہم جہان اس فلسفے پر بحث کرین گے ان غزلون کا انتخاب پیش کرین گے،

قطعات یا رباعیات

غزل کا موضوع صرف عشق و محبت ہے، یہ سچ ہے کہ ہمارے شعراء نے اس مین ایسے مضامین بھی شامل کر دیے ہین جو اصل موضوع سے تعلق نہین رکھتے، تاہم ان مضامین کی حیثیت طفیلی سے زیادہ نہین ہے، اس لیے جب اس قسم کے مضامین کی کثرت ہو جاتی ہے تو غزل، غزل باقی نہین رہتی، ایسی حالت مین ایک ایسی صنف کی ضرورت تھی جس کا کوئی خاص موضوع نہ ہو، بلکہ اس مین ہر قسم کے صوفیانہ، فلسفیانہ اور اخلاقی مضامین بیان کیے جا سکین، قدماء نے اسی مقصد کے لیے رباعی ایجاد کی اور اس مین ہر قسم کے مضامین بیان کیے،

خیالات کے تنوع و بوقلمونی مین اردو اور فارسی زبان کا کوئی شاعر ڈاکٹر صاحب کی ہمسری نہین کر سکتا، اس لیے ان کے لیے اس صنف کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، اور اس ضرورت کے لیے انھون نے فارسی زبان مین دو دو شعر کے بکثرت قطعات لکھے، جس کی ابتدا پیام مشرق سے کی، اور ارمغان حجاز پر اس کا خاتمہ کر دیا، ہم ان مین سے چند قطعات کا انتخاب اس غرض سے درج کرتے ہین کہ ڈاکٹر صاحب کے خیالات کے تنوع و وسعت کا اندازہ ہو سکے،

پروانہ کی طرح دوسرے کی آگ مین جلنا شیوۂ مردانگی نہین، خود اپنی "آگ" مین جلنا چاہیے تاکہ خودی کا چراغ

زیادہ روشن ہو:

دلا نارائی پروانہ تا کے — نگیری شیوۂ مردانہ تا کے
یکے خود را بسوزِ خویشتن سوز — طوافِ آتشِ بیگانہ تا کے

اعتماد علی النفس

شنیدم کرمکِ شب تاب میگفت — نہ آن مورم کہ کس نالد ز نیشم
توان بے منتِ بیگانگان سوخت — نہ پنداری کہ من پروانہ کیشم
اگر شب تیرہ تر از چشمِ آہو ست — خود افروزم چراغِ راہِ خویشم

جرأت اور بیباکی کی تعلیم

دل بیباک را ضرغام (شیر) رنگ (دیگری) است — دلِ ترسندہ را آہو پلنگ است
اگر بیمے نداری بحر صحرا است — اگر ترسی بہر موجش نہنگ است

تقلید سے بیزاری اور اجتہاد کی ترغیب

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش — براہِ دیگران رفتن عذاب است
گر از دست تو کار نادر آید — گناہے ہم اگر باشد ثواب است

صوفیانہ تجرد اور گوشہ نشینی کی مخالفت

بیا با شاہدِ فطرت نظر باز — چرا در گوشۂ خلوت گزینی
ترا حق داد چشمِ پاک بینے — کہ از نورش نگاہے آفرینی

خودی و خود شناسی

اگر آگاہی از کیف و کمِ خویش — یمے تعمیر کن از شبنمِ خویش
دلا دریوزۂ مہتاب تا کے — شبِ خود را برافروز از دمِ خویش

تراشیدم صنم بر صورت خویش | بشکل خود خدا را نقش بستم
مرا از خود برون رفتن محال است | بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم

ضمیر کن فکان غیر از تو کس نیست | نشان بے نشان غیر از تو کس نیست
قدم بیباک تر نہ در رہ زیست | بہ پہنائے جہان غیر از تو کس نیست

ارمغان حجاز میں مختلف سرخیاں قائم کرکے ہر قسم کے خیالات قطعات میں ظاہر کیے ہیں، ہم ان قطعات سے مختلف موقعوں پر کام لیں گے،

نظمیں ڈاکٹر صاحب نے فارسی زبان میں کوئی قومی اور وطنی نظم نہیں لکھی، اس دور میں ان کے سامنے صرف فلسفہ، شعر اور سیاست تین چیزیں تھیں اور فارسی میں انھوں نے جو نظمیں لکھی ہیں، انھی تینوں چیزوں سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن ان کی فلسفیانہ اور سیاسی نظموں سے ہم ان کے فلسفہ و سیاست کی بحث میں کام لیں گے، اس موقع پر صرف وہ نظمیں درج کرتے ہیں جن کا تعلق صرف شاعری سے ہے، شعرائے ایران نے بہاریہ قصائد میں خاص طور پر اپنا شاعرانہ زور بیان صرف کیا ہے، اور ڈاکٹر صاحب نے بھی اپنے شاعرانہ زور طبع دکھلانے کے لیے اس میں چند بے نظیر نظمیں لکھی ہیں، بالخصوص کشمیر کے دلفریب مناظر اور خوشگوار آب و ہوا نے ان کی شاعرانہ قوت کو اور بھی ابھارا ہے، اور نشاط باغ کشمیر میں بیٹھکر ایک نہایت پر زور بہاریہ ساقی نامہ لکھا ہے،

خوشا روزگارے خوشا نوبہارے | نجوم پرن رست از مرغزارے
زمین از بہاران چو بال تذروے | ز فوارہ الماس بار آبشارے
نہ پیچد نگہ جز کہ در لالہ و گل | نہ غلطد ہوا جز کہ بر سبزہ زارے
لب جو خود آرائی غنچہ دیدی؟ | چہ زیبا نگارے چہ آئینہ دارے
چہ شیرین نوائے چہ دلکش صدائے | کہ مے آید از خلوت شاخسارے

به تن جان، به جان آرزو زنده گردد ❊ ز آوای سارے ز بانگ ہزارے

نواہاے مرغِ بلند آشیانے ❊ در آمیخت با نغمۂ جویبارے

تو گوئی کہ یزدان بہشتِ برین را ❊ نہا دست در دامنِ کوہسارے

کہ تا رحمتش آدمی زادگان را ❊ رہا سازد از محنت انتظارے

چہ خواہم درین گلستان گر نخواہم ❊ شرابے، کتابے، ربابے، نگارے

سرت گردم اے ساقیِ ماہ سیما ❊ بیار از نیاگانِ ما یادگارے

بہ ساغر فرو ریز آبے کہ جان را ❊ فروزد چو نورے بسوزد چو نارے

شقائق بر دیان ز خاک نژندم ❊ بہشتے فروچین بہشت غبارے

ایران کے شعراے جدید کے انداز مین انھون نے جو بہاریہ نظمین لکھی ہین وہ اور بھی زیادہ دلآویز ہین :

(۱)

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابر بہار

مست ترنم ہزار

طوطی و دراج و سار

بر طرفِ جویبار

کشت گل و لالہ زار

چشم تماشا بیار

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابر بہار

(۲)

خیز کہ در باغ و راغ . قافلۂ گل رسید

بادِ بہاران وزید

مرغ نوا آفرید

لالہ گریبان درید

حسنِ گلِ تازہ چید

عشقِ غمِ نو خرید

خیز کہ در باغ و راغ، قافلۂ گل رسید

(۳)

بلبلگان در صفیر، صلصلگان در خروش

خونِ چمن گرم جوش

اے کہ نشینی خموش

در شکن آئینِ ہوش

بادۂ مینی بنوش

نغمہ سرا و گل بپوش

بلبلگان در صفیر، صلصلگان در خروش

(۴)

حجرہ نشینی گذار، گوشۂ صحرا گزین

بر لبِ جوئے نشین

آبِ روان را ببین

نرگسِ نازآفرین

تختِ دلِ فرودین

بوسہ زنش بر جبین

حجرہ نشینی گذار، گوشۂ صحرا گزین

(۵)

دیدۂ معنی کشا اے زعیان بے خبر

لالہ کمر در کمر

نیمۂ آتش بہ بر

مے چکدش بر جگر

شبنم اشکِ سحر

در شفق انجم نگر

دیدۂ معنی کشا اے زعیان بے خبر

(۶)

خاکِ چمن وانمود، رازِ دلِ کائنات

بود و نبود و صفات

جلوہ گریہاے ذات

آنچہ تو دانی حیات

آنچہ تو خوانی ممات

ہیچ ندارد ثبات

خاکِ چمن وانمود، رازِ دلِ کائنات

تخئیل اور محاکات اگرچہ دونون شاعری کے ضروری جزو ہین، لیکن دونون کے مواقع استعمال الگ الگ ہین، یہ سخت غلطی ہے کہ ایک کے بجائے دوسرے کا استعمال کیا جائے مثلاً مناظر قدرت کا بیان محاکات مین داخل ہے، مثلاً اگر بہار، خزان، باغ، سبزہ، مرغزار، اور آب رواں کا بیان کیا جائے تو محاکات سے کام لینا چاہیے یعنی اس طرح بیان کرنا چاہیے کہ ان چیزون کا اصلی سمان آنکھون کے سامنے پھر جائے، متاخرین کی سخت غلطی جس سے ان کی شاعری بالکل برباد ہو گئی یہ ہے کہ وہ ان موقعون پر محاکات کے بجائے تخئیل سے کام لیتے ہین،" (شعر العجم جلد پنجم صفحہ ۵۶، ۵۷) ڈاکٹر صاحب نے اسی غلطی سے بچنے کے لئے ان موقعون پر قدما، کی روش اختیار کی ہے، یون تو انکی شاعری عموماً تخئیلی نہین ہے لیکن بہاریہ مضامین مین انھون نے خاص طور پر محاکات سے کام لیا ہے، اور ایران کے شعرائے جدید کے طرز نے ان مین ترنم و موسیقیت پیدا کر کے اور بھی دلآویزی پیدا کر دی ہے،

بہاریہ نظمون کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے چند اور نظمین بھی اسی جدید ایرانی طرز مین لکھی ہین اور ان مین فلسفۂ خودی اور اپنے پیام زندگی کو نہایت دلآویز شاعرانہ طریقون سے پیش کیا ہے،

مانند صبا خیز و وزیدن دگر آموز دامان گل و لالہ کشیدن دگر آموز

اندر دل یک غنچہ خزیدن دگر آموز

موئینہ بہ بر کردی و بے ذوق تپیدی آن گونہ تپیدی کہ بجائے نرسیدی

در انجمن شوق تپیدن دگر آموز

کافر دل آوارہ دگر بارہ بدبند بر خویش کشا دیدہ و از غیر فرو بند

دیدن دگر آموز و ندیدن دگر آموز

دم چیست پیام است شنیدی؟ نشنیدی در خاک تو یک جلوۂ عام است ندیدی

دیدن دگر آموز شنیدن دگر آموز

ما چشمِ عقاب و دلِ شہباز نداریم   چون مرغِ سرا لذتِ پرواز نداریم

اے مرغِ سرا خیز و پریدن دگر آموز

تختِ جم و دارا سرِ راہے نفروشند   این کوہ گران است بکاہے نفروشند

با خونِ دلِ خویش خریدن دگر آموز

نومیدی و تقدیر ہمان است کہ بود است   آن حلقۂ زنجیر ہمان است کہ بود است

نومید مشو نالہ کشیدن دگر آموز

واسوختۂ؟ یک شہر راز داغِ جگر گیر   یک چند بخود پیچ و نیستان ہمہ در گیر

چون شعلہ بخاشاک دویدن دگر آموز

اے غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگران خیز   کاشانۂ ما رفت بتاراجِ غمان خیز

از نالۂ مرغِ چمن از بانگِ اذان خیز   از گرمیِ ہنگامۂ آتش نفسان خیز

از خوابِ گران خوابِ گران خوابِ گران خیز   از خوابِ گران خیز

خورشید کہ پیرایہ بسیمائے سحر بست   آویزہ بگوشِ سحر از خونِ جگر بست

از دشت و جبل قافلہ ہا رختِ سفر بست   اے چشمِ جہان بین بہ تماشائے جہان خیز

از خوابِ گران خوابِ گران خوابِ گران خیز   از خوابِ گران خیز

خاور ہمہ مانندِ غبارِ سرِ راہے است   یک نالۂ خاموش و اثر باختہ آہے است

ہر ذرۂ این خاک گرہ خوردہ نگاہے است   از ہند و سمرقند و عراق و ہمدان خیز

از خوابِ گران خوابِ گران خوابِ گران خیز   از خوابِ گران خیز

دریای تو دریاست کہ آسودہ چو صحراست   دریای تو دریاست کہ افزون نشد و کاست

بیگانۂ آشوب و نہنگ است چہ دریاست   از سینۂ چاکش صفتِ موجِ روان خیز

از خواب گران خواب گران خواب گران خیز ‏ ‏ ‏ از خواب گران خیز

این نکتہ کشایندۂ اسرار نہان است ‏ ‏ ‏ ملک است تن خاکی و دین روح روان است

تن زندہ و جان زندہ ز ربط تن و جان است ‏ ‏ ‏ با خرقہ و سجادہ و شمشیر و سنان خیز

از خواب گران خواب گران خواب گران خیز ‏ ‏ ‏ از خواب گران خیز

ناموس ازل را تو امینی تو امینی ‏ ‏ ‏ دارائے جہان را تو یساری تو یمینی

اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی ‏ ‏ ‏ صہبائے یقین درکش و از دیر گمان خیز

از خواب گران خواب گران خواب گران خیز ‏ ‏ ‏ از خواب گران خیز

فریاد ز افرنگ و دلآویزی افرنگ ‏ ‏ ‏ فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ ‏ ‏ ‏ معمار حرم باز بہ تعمیر جہان خیز

از خواب گران خواب گران خواب گران خیر ‏ ‏ ‏ از خواب گران خیز

ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا مقصد ایک عام اور ہمہ گیر انقلاب ہے، اس زمانے مین انقلاب کے مدعی تو بہت سے ہین لیکن ان کا انقلاب محدود ہے، کوئی سیاست مین انقلاب کا خواستگار ہے کوئی تعلیم مین، کوئی مذہب مین اور کوئی تصوف مین، لیکن ہر چیز مین انقلاب صرف ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا موضوع ہے، اور جدید ایرانی طرز مین اس پر انھون نے ایک نہایت عمدہ نظم لکھی ہے،

خواجہ از خون رگ مزدور سازد لعل ناب ‏ ‏ ‏ از جفائے دہ خدایان کشت دہقانان خراب

انقلاب، انقلاب اے انقلاب

شیخ شہر از رشتۂ تسبیح صد مومن بدام ‏ ‏ ‏ کافران سادہ دل را برہمن زنار تاب

انقلاب، انقلاب اے انقلاب

میر و سلطان نرد باز و کعبتین شان دغل ‏ ‏ ‏ جان محکومان ز تن بردند و محکومان خراب

انقلاب، انقلاب اے انقلاب

واعظ اندر مسجد و فرزند او در مدرسہ آن بہ پیری کودکے این پیر در عہد شباب

انقلاب، انقلاب اے انقلاب

اے مسلمانان فغان از فتنہ ہاے علم و فن اہرمن اندر جہان ارزان و یزدان دیر یاب

انقلاب، انقلاب اے انقلاب

شوخیٔ باطل نگر اندر کمینِ حق نشست شپر از کوری شب خون زند بر آفتاب

انقلاب، انقلاب اے انقلاب

در کلیسا ابن مریم را بدار آویختند مصطفیٰ از کعبہ ہجرت کردہ با ام الکتاب

انقلاب، انقلاب اے انقلاب

من درون شیشہ ہاے عصر حاضر دیدہ ام آن چنان زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

انقلاب، انقلاب اے انقلاب

با ضعیفان گاہ نیروے پلنگان می دہند شعلۂ شاید برون آید ز فانوس حباب

انقلاب، انقلاب اے انقلاب

اردو شاعری مین ہزارون تغیرات و انقلابات ہوئے اور ہوتے رہتے ہین لیکن جہانتک ہم کو معلوم ہے، دور جدید کے اردو شعراء مین کسی نے اس جدید ایرانی طرز کا تتبع نہین کیا، صرف ڈاکٹر صاحب ایک ایسے شاعر ہین جنھون نے فارسی کے ساتھ اس طرز مین بعض نظمین اردو مین بھی لکھین

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن

عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن

بندۂ تخمین و ظن! کرم کتابی نہ بن

عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات

علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات

عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات

علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب

عشق کے ہیں معجزات، سلطنت و فقر و دین

عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگین

عشق مکان و مکین، عشق زمان و زمین

عشق سراپا یقین، اور یقین فتحِ باب

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام

شورشِ طوفان حلال، لذتِ ساحل حرام

عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام

علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے ام الکتاب

مثنوی | ڈاکٹر صاحب نے فارسی زبان مین سب سے پہلے پے در پے دو مثنویان یعنی اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی لکھین، اس کے بعد گلشنِ رازِ جدید، جاوید نامہ، مسافر، اور "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" لکھی، لیکن ان مثنویون مین وہ شاعرانہ زور، وہ شاعرانہ جوش اور وہ شاعرانہ لطافت موجود نہین ہے، جو پیامِ مشرق اور زبورِ عجم کی نظمون اور غزلون مین قدم قدم پر ملتی ہے، بالخصوص دورِ اول کی مثنویون مین رموزِ بیخودی اور دورِ آخر کی مثنویون مین "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کی نسبت خود ان کے ایک معتقد نے لکھا ہے کہ ان کا رنگ شاعرانہ نہین بلکہ واعظانہ ہے[1]، لیکن دو حیثیتون

---

[1] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۷۸ ۹ ، ۹۸۳

سے ان مثنویون کو بڑی اہمیت حاصل ہے،

(۱) ایک تو یہ کہ اسرار خودی اور رموز بیخودی مین ان کے فلسفیانہ عقائد سادہ طور پر ہمارے

سامنے آگئے ہین، چنانچہ یہی معتقد اس شاعرانہ تنقید کے بعد لکھتا ہے،

"البتہ اقبال کے شاعرانہ معتقدات کا مکمل دستور اور لائحۂ عمل ہونے کی حیثیت سے ان

مثنویون کی بڑی اہمیت ہے"[۱]

انہی دونون مثنویون کی وجہ سے ان کی فلسفیانہ حیثیت قائم ہوئی، اور گو انھون نے فلسفۂ خودی

کو اپنی نظمون اور غزلون مین زیادہ آب و رنگ کے ساتھ پیش کیا ہے، تاہم جب تک ان مثنویون

کو رہنما نہ بنایا جائے ان سے کوئی مکمل فلسفہ نہین بن سکتا،

(۲) دوسرے شاعر ہونے کے ساتھ ان کی ایک حیثیت مجدد، مصلح اور مبلغ کی بھی ہے، اور

ان کے دور آخر کی شاعری مین یہی آخری حیثیت زیادہ نمایان نظر آتی ہے، چنانچہ خلیفہ عبد الحکیم لکھتے ہین:

اس مین کوئی شک نہین کہ آخر مین ایک مفکر شاعر اور مبلغ شاعر کا رنگ اقبال مین

غالب نظر آتا ہے، اعلیٰ درجہ کی شاعری مین جو جزو نبوت کا ہوتا ہے وہ اقبال کی شاعری کے

آخری دور مین بہت نمایان ہو گیا،"[۲]

اس لیے جہان تک ان کی تعلیمات اور تبلیغی مسائل کا تعلق ہے ان مثنویون کو ان کی نظمون

اور غزلون پر تفوق حاصل ہے، اور خود قدیم فارسی زبان مین صوفیانہ، مصلحانہ اور اخلاقی مسائل کے لیے

مثنوی ہی ایک موزون صنف خیال کی گئی ہے، بعض مضمون نگارون نے بھی اس اہمیت کو محسوس

کیا ہے، اور پروفیسر عبد القادر سروری نے "اقبال کی شاعری کا آخری دور" کے عنوان سے ایک مستقل

مضمون لکھا ہے، جس کے آخر مین وہ لکھتے ہین:

---

[۱] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۹۸۳، [۲] ایضاً ص ۸۲۸

غرض موجودہ زندگی کے بہت کم مسائل ہون گے جن پر اقبال نے اس زمانے مین روشنی نہ ڈالی ہو یا تنقید نہ کی ہو، اگر کوئی قوم جو حالت پستی مین ہو اقبال کے صرف آخری زمانے کے کلام کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے تو یقین ہے کہ اس مین حیات کی ایک تازہ لہر پیدا ہو جائیگی"[۱]

لیکن بایںہمہ تبلیغ اور شاعری مین کوئی تضاد نہین ہے، قرآن مجید خالص تبلیغی کتاب ہے، لیکن قرآن مجید سے زیادہ شاعری کس کتاب مین پائی جاتی ہے؟ بعینہٖ اسی طرح ڈاکٹر صاحب کی تبلیغ بھی شاعرانہ لطافت سے خالی نہین ہے، افسوس ہے کہ مثنویون کا انتخاب طوالت سے خالی نہین ہے اس لیے ہم بہت سی مثالین نہین پیش کر سکتے، صرف رموز بیخودی سے بعض مثالین پیش کرتے ہین،

ڈاکٹر صاحب نے ایک عنوان یہ قائم کیا ہے کہ ملت محمدیہ ہمیشہ قائم رہے گی، اور اس کو اس شاعرانہ انداز مین ثابت کیا ہے کہ باغ مین فصل بہار آتی ہے، کلیان کھلتی ہین اور مرجھا جاتی ہین، لیکن فصل بہار کی رونق بدستور قائم رہتی ہے، کان سے موتی نکال لیے جاتے ہین لیکن کان بدستور باقی رہتی ہے، صبح و شام برابر آتی جاتی رہتی ہین، لیکن دن بدستور باقی رہتا ہے، اسی طرح افراد کے فنا ہونے سے کوئی قوم مر نہین جاتی بلکہ بدستور زندہ رہتی ہے،

در بہاران جوش بلبل دیدۂ رستخیز غنچۂ و گل دیدۂ

چون عروسان غنچہ ہا آراستہ از زمین یک شہر انجم خاستہ

سبزہ از اشک سحر شوئیدۂ از سرود آب جو خوابیدۂ

غنچۂ برمے دمد از شاخسار گیردش باد نسیم اندر کنار

غنچۂ از دست گلچین خون شود رخت ہستی از چمن بیرون کشد

---

[۱] سب رس اقبال نمبر ص ۹۱

بست قمری آشیان، بلبل پرید | قطرۂ شبنم رسید و بو رمید

رخصت صد لالۂ ناپایدار | کم نسازد رونق فصل بہار

از زیان گنج فراوانش ہمان | محفل گل ہائے خندانش ہمان

فصل گل از نسترن باقی تراست | از گل و سرو و سمن باقی تراست

کان گوہر پرورے گوہر گرے | کم نگردد از شکست گوہرے

صبح از مشرق ز مغرب شام رفت | جام صد روز از خم ایام رفت

بادہا خوردند و صہبا باقی است | دردشہا خون گشت و فردا باقی است

ہمچنان از فردہائے پے سپر | ہست تقویم امم پایندہ تر

در سفر یار است و صحبت قائم است | فردہ گیر است و ملت قائم است

مولانا روم کا طرز یہ ہے کہ وہ تمام مسائل کو شاعرانہ تمثیلات سے سمجھاتے ہین، اور ڈاکٹر صاحب نے یہ طرز انہی سے سیکھا ہے اور اس حیثیت سے اگر اسرار خودی اور رموز بیخودی کا مطالعہ کیا جائے تو وہ شاعرانہ طرز سے بیگانہ معلوم نہ ہون گی، مثنوی مین ڈاکٹر صاحب نے ایک لطیف جدت یہ پیدا کی ہے کہ جابجا اس مین غزلون کی آمیزش کرتے ہین اور ان سے ذائقہ مین تبدیلی پیدا ہوکر عجیب دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً انھون نے ایک دریا کے کنارے بیٹھکر بے اختیارانہ مولانا روم کی یہ غزل گانا شروع کی،

بگشای لب کہ قند فراوانم آرزوست | بنمای رخ کہ باغ و گلستانم آرزوست

اور اس کو سنکر مولانا روم کی روح ان کے سامنے آگئی،

روح رومی پردہا را بر درید | از پس کہ پارہ آمد پدید

جب وہ زروان کے ساتھ عالم علوی کی سیاحت مین گئے، تو تمام پردے اٹھ گئے،

اور ستارون نے یہ غزل گا کر ان کا خیر مقدم کیا

عقلِ تو حاصلِ حیات، عشقِ تو سرِّ کائنات ۔۔۔ پیکرِ خاکی، خوش بیا این سوئے عالمِ جہات

شاعرون کے فرشتہ سروش سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ یہ غزل سناتا ہے،

ترسم کہ تو مے رانی زورق بسراب اندر ۔۔۔ زادی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر

جاوید نامہ مین انھون نے اس قسم کی اور بھی متعدد غزلین مناسب موقعون پر شامل کی ہین، اور مسافر مین بھی اس طرز سے کام لیا ہے، چنانچہ جب سرزمین کابل مین شہنشاہ بابر کے مزار کی زیارت کی ہے تو بے ساختہ ان کی زبان سے یہ غزل نکل گئی ہے:

بیا کہ سازِ فرنگ از نوا بر افتاد است ۔۔۔ درون پردۂ او نغمہ نیست فریاد است الخ

قندھار مین جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خرقۂ مبارک کی زیارت کو گئے ہین تو سب سے پہلے اپنے جذبات کا اظہار ایک غزل مین کیا ہے، جس کے ابتدائی اور آخری اشعار یہ ہین،

از دیرِ مغان آیم بے گردشِ صہبا مست ۔۔۔ در منزلِ لا بودم از بادۂ الاّ مست

سیناست کہ فاران است، یا رب چہ مقام است این ۔۔۔ ہر ذرۂ خاکِ من چشمے است تماشا مست

کلامِ اقبال کی ادبی خوبیاں

"اقبال کو فلسفہ کے نام سے چڑھ تھی، اور وہ اپنے آپ کو کبھی بھی فلسفی کہنا پسند نہین کرتے تھے، دوران گفتگو مین بعض مرتبہ میرے منہ سے بلا ارادہ اگر ان کے لیے فلسفی اور ان کے خیالات کے لیے نظامِ فلسفہ کے الفاظ نکل گئے تو انھون نے مجھے یہ کہکر ٹوک دیا کہ "ان کا کوئی نظامِ فلسفہ نہین ہے" وہ کہا کرتے تھے کہ "فقیری ان کو وراثتہً ملی ہے، اور فلسفہ وغیرہ انھون نے صرف انہی حقائق کو جن کا ان کو کلی یقین ہے، عقلی طور پر سمجھنے کے لیے سیکھ لیا ہے"، محدود معنی مین فلسفہ اس نظامِ خیالات کا نام ہے جو عقلی غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے، جو نامی نہین بلکہ جامد ہوتا ہے، جس کا تعلق زندگی کے تمام سرچشمون سے نہین بلکہ صرف عقل سے وابستہ ہوتا ہے، جو کلیات کے تمام تصور پر نہین بلکہ صرف عقلی استدلال پر مبنی ہوتا ہے، اقبال ایک شاعر تھا اور شاعری اس کیلیے جزو پیغمبری تھی، اور اس نے جو کچھ حاصل کیا تھا وہ سرچشمۂ حقیقت سے بلاواسطہ تعلق کا نتیجہ تھا، وہ صرف عقل کا ممنون احسان نہین تھا بلکہ اپنی تمام وجدانی کیفیت کا، اس بنا پر اس کے خیالات کو ہم محدود معنی مین فلسفہ نہین کہہ سکتے۔ بلکہ وہ ایک مکمل تصورِ کائنات تھا، جس کو شاعری کا رنگ و روپ دیکر اقبال نے دنیا کے سامنے پیش کیا، ہر بڑے شاعر کے لیے ایک تصورِ کائنات کا ہونا لازمی امر ہے۔ اسی طرح اقبال کا بھی ایک تصورِ کائنات تھا، جو لوگ اقبال کے کلام اور زندگی کو بحیثیت ایک شاعر کے سمجھنے کی کوشش کرینگے وہ اسے صحیح سمجھین گے، لیکن جو لوگ اسے بحیثیت ایک فلسفی یا سیاست دان کے سمجھنے کی کوشش کرینگے ان کے لیے اقبال کا کلام اور اس سے زیادہ اس کی زندگی ایک عقدۂ لاینحل

ہو کر رہ جائے گی، اقبال از اول تا آخر ایک شاعر تھا"[1]

"اقبال کے فلسفیانہ میلانات اور ان کے پیغام میں ہم کچھ اس طرح محو ہو جاتے ہیں کہ ان کی ایک حیثیت کو جو سب سے زیادہ مستقل اور ممتاز ہے بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں، ہم بھول جاتے ہیں کہ اقبال کی پہلی اور آخری حیثیت شاعر کی ہے، اگر ہم ان کے فلسفہ اور پیغام کو نظر انداز کر دیں یا کسی ایسے زمانے کا تصور کر سکیں جبکہ ان کے افکار و میلانات کا کوئی عنصر بھی زندہ نہ رہے گا تو اس حالت میں بھی ہم کو ماننا پڑے گا کہ محض صناع اور شاعر کی حیثیت سے اقبال دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے ساتھ جگہ پا سکتے ہیں، افکار و جذبات سے برطرف ہو کر اقبال نے اردو شاعری میں جو نئے اسالیب و صور تراشے ہیں اور پرانے اسالیب کو نئے انداز سے استعمال کر کے جو نئے آہنگ پیدا کیے ہیں وہ ہماری شاعری کی زبان میں یقیناً اختراعات کا حکم رکھتے ہیں اور مستقل فنی اضافے ہیں"[2]

ان دونوں اقتباسات سے جو ڈاکٹر صاحب کے دو نقادوں کے مضامین سے ماخوذ ہیں صاف ثابت ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی اصلی حیثیت صرف شاعر کی ہے، فلسفی کی نہیں لیکن افسوس اور افسوس کے ساتھ تعجب ہے کہ لوگوں نے ان کی شاعرانہ حیثیت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے، اور ان کو دنیا کے سامنے صرف ایک فلسفی، ایک مجدد اور ایک سیاست دان کی حیثیت سے پیش کیا ہے، ڈاکٹر صاحب کی ذات و صفات کے متعلق اس قدر مضامین و رسائل لکھے گئے ہیں کہ ایک مستقل لٹریچر پیدا ہو گیا ہے، جو "اقبالیات" کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے، لیکن ادبی حیثیت سے ان کے شاعرانہ کمالات پر گنتی کے چند مضامین لکھے گئے ہیں جو نہایت مختصر اور تشنہ و نامکمل ہیں، اور ان پر اضافہ کی کافی گنجائش ہے،

اس موقع پر یہ نکتہ خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ادبی اور شاعرانہ حیثیت سے ڈاکٹر صاحب

---

[1] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۹۲۶، [2] اقبال از مجنون گورکھپوری ص ۸۲، ۸۳، ۸۴

کے کلام کی تنقید کے دو طریقے ہو سکتے ہین، ایک قدیم اور دوسرا جدید، اور ان دونون حیثیتون سے ڈاکٹر صاحب کے کلام کی تنقید کی ضرورت ہے، کیونکہ ڈاکٹر صاحب اگرچہ دورِ جدید کے ایک روشن خیال آدمی ہین، لیکن درحقیقت وہ قدیم تہذیب کی یادگار ہین، اور جدید مسلک سے زیادہ انکا رجحان قدیم مسلک کی طرف ہے، چنانچہ وہ خود ایک خط مین لکھتے ہین:

میرے نزدیک اقوام کی زندگی مین قدیم ایک ایسا ہی ضروری عنصر ہے جیسا کہ "جدید" بلکہ میلر ذاتی میلان قدیم کی طرف ہے،[1]

بالخصوص شاعری مین تو وہ بالکل قدیم طرز کے متبع ہین، چنانچہ ایک شاعر کو جو غالباً ان کے شاگرد بھی ہین، لکھتے ہین:

سنیے غزل اور رباعی کے لیے قافیہ کی شرط تو لازمی ہے، اگر ردیف بھی بڑھا دی جائے تو سخن مین اور بھی لطف بڑھ جاتا ہے، البتہ نظم ردیف کی محتاج نہین، قافیہ تو ہونا چاہیے، اب کچھ عرصہ سے بلا ردیف و قافیہ نظمین لکھی جاتی ہین اور یہ انگریزی نظمون کی تقلید ہے، جس کا نام انگریزی مین "بلینک ورس" ہے، جس کو (نثر مرجز) کہنا چاہیے، اگرچہ پبلک مذاق کچھ ایسا ہو چلا ہے، مگر میرے خیال مین یہ روش آیندہ مقبول نہ ہوگی،

مین فقط فرسودہ مضامین کی حد تک جدید و قدیم کی بحث کو مانتا ہون، شاعری کی جان تو شاعر کے جذبات ہین، جذبات انسانی اور کیفیات قلبی اللہ کی دین ہے، ہان یہ ضرور ہے کہ طبع موزون اس کے ادا کرنے کے لیے پر اثر الفاظ کی تلاش کرے،

نظم کے اصناف کی تقسیم جو قدیم سے ہے ہمیشہ رہے گی، اور انسانی جذبات ماحول کے رنگ کا تابع رہین گے، بس یہ سمجھ لیا جائے کہ جس شاعر کے جذبات ماحول سے اثر پذیر ہین وہ شاعر جدید

[1] اقبالنامہ ص ۱۴۸

حامل متصور ہو سکتا ہے نہ نفس شعری، اگر ہم نے پابندی عروض کی خلاف ورزی کی تو شاعری کا قلعہ ہی منہدم ہو جائے گا، اور اس نقطۂ خیال سے یہ کہنا پڑے گا اور یہ کہنا درست ہے کہ موجودہ شعراء کا کام تعمیری ہونا چاہیے، نہ کہ تخریبی[۱]

اس بنا پر ڈاکٹر صاحب کے کلام کی تنقید میں قدیم ادبی طریقۂ تنقید کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس حیثیت سے ان کے کلام کی تنقید بہت کم کی گئی ہے، اور دو ایک مضمون جو لکھے گئے ہیں وہ نہایت مختصر اور غیر تشفی بخش ہیں، البتہ جدید ادبی طرز تنقید کے موافق ڈاکٹر یوسف حسین خان پروفیسر تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ نے ایک نہایت مفصل و مدلل مضمون رسالہ اردو اقبال نمبر بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں لکھا ہے، اور بعد کو اور مضامین کے اضافہ کے ساتھ اپنی مشہور و مقبول کتاب "روح اقبال" میں شامل کر لیا ہے، اگرچہ اس میں خلط مبحث ہو گیا ہے، اور بعض عنوانات قدیم ادبی طریقۂ تنقید کے بھی شامل ہو گئے ہیں، تاہم اردو میں جدید طریقۂ تنقید کے موافق اس سے بہتر کوئی تنقید موجود نہیں، اس لیے ہم اس کا خلاصہ درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں،

جدید طریقۂ تنقید کے اجزا میں تین جزء نہایت نمایاں ہیں:

(۱) **رمزیت**، یعنی ایک مضمون کو استعارہ، کنایہ، اور قصص و حکایات کے ذریعہ بیان کرنا، بذات خود کوئی نئی چیز نہیں ہے، بلکہ قدیم ادب میں بھی یہ عنصر نہایت کثرت سے پایا جاتا ہے، مولانا روم حکایات و تمثیلات کے ذریعہ سے جو مضامین بیان کرتے ہیں ان میں یہی عنصر شامل ہوتا ہے، اور اسی بنا پر فرماتے ہیں:

خوشتر آن باشد کہ سر دلبران گفتہ آید در حدیث دیگران

غالب نے بھی اسی خیال کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے،

---

[۱] اقبال نامہ ص ۲۷۹، ۲۸۰

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہین ہی بادہ و ساغر کہے بغیر

بعض اہل تحقیق کا بیان ہے کہ اہل یورپ نے یہ اسلوب بیان قدیم اسلامی ادب ہی سے اخذ کیا ہی،
یہ اسلوب دقیق صوفیانہ، فلسفیانہ بلکہ بعض سیاسی مسائل کے بیان کے لیے زیادہ موزون ہے،
مولانا روم نے اسی غرض سے اس اسلوب کو اختیار کیا ہے، اور ڈاکٹر صاحب نے بھی اسی غرض سے رمز و
کنایہ مین گفتگو کی ہے، چنانچہ خود فرماتے ہین:

برہنہ حرف نگفتن کمال گویائی است حدیث خلوتیان جز بہ رمز و ایما نیست

اور اس طریقہ سے بہت سے اہم فلسفیانہ مسائل کی تشریح کی ہے، مثلاً ڈاکٹر صاحب کے
فلسفہ خودی کا ایک اہم جزو خیر و شر کی آمیزش ہے، اور انہی دونون کی آمیزش سے ایک حرکت
پذیر اور آئین پسند مکمل خودی پیدا ہوتی ہے، لیکن شیطان مجسم شر، فرشتہ مجسم خیر اور انسان خیر و شر
دونون کا مجموعہ ہے، اگر اس مجموعے کے دونون اجزا الگ الگ رہین تو کوئی مکمل خودی
نہین پیدا ہو سکتی، شیطان خودی، لذت پرستی اور خالص عقل کا ایک پیکر مجسم ہے، جو کسی قسم کے
ضبط و آئین کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے، اس کے برخلاف فرشتے مجسم خیر ہین، جو بدی مین
مبتلا ہو ہی نہین سکتے، البتہ انسان بدی مین مبتلا ہو کر اس سے رہائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا
ہے، اور اسی کوشش کا نام ضبط، آئین، اور مذہب و اخلاق ہے، اس لیے ہر خیر کی بنیاد شر پر
ہے، اور اسی مسئلے کو ڈاکٹر صاحب نے اپنی نظم تسخیر فطرت مین میلاد آدم اور انکار ابلیس کے
قصے کے ضمن مین بیان کیا ہے، حضرت آدم جنت مین فرشتون کی طرح نہایت پرسکون زندگی بسر کرتے تھے،
لیکن چونکہ یہ زندگی شور و شر سے ناآشنا تھی، اس لیے اس مین کوئی لطف نہ تھا، اب شیطان
نے اس خیر مین شر کی آمیزش کی، اور حضرت آدم علیہ السلام کو فریب دیا کہ

زندگی سوز و ساز بہ ز سکون دوام فاختہ شاہین شود، از تپش زیر دام

ہیچ نیاید ز تو غیر سجود و نیاز | خیز چو سرو بلند اے بعمل نرم گام
کوثر و تسنیم برد از تو نشاط عمل | گیر ز میناے تاک بادۂ آئینہ فام
زشت و نکو زادۂ وہم خداوند تست | لذت کردار گیر گام بنہ جوے کام
خیز کہ بنمایمت مملکت تازۂ | چشم جہان بین کشا، بہر تماشا خرام
قطرۂ بے مایہ گوہر تابندہ شو | از سر گردون بیفت گیر بدریا مقام
تیغ درخشندۂ جان جہانے گسل | جوہر خود را نماے آے برون از نیام
باز دے شاہین کشا خون تدروان بریز | مرگ بود باز را زیستن اندر کنام
تو نشناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل | چیست حیات دوام، سوختن ناتمام

اب وہ جنت سے نکل کر دنیا مین آئے تو ان کو معلوم ہوا کہ درحقیقت شر کے بغیر خیر کوئی چیز نہین، اگر بھوک نہین تو کھانے مین کچھ لذت نہین، اگر پیاس نہین تو ٹھنڈے پانی مین کوئی مزا نہین، اگر گرمی نہین تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکون مین کوئی لطف نہین، اس لیے دنیا مین آکر ان کو یہ لطف حاصل ہوئے تو بے اختیار پکار اٹھے،

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن | دل کوہ و دشت و صحرا بدمے گداز کردن
ز قفس درے کشادن بہ فضاے گلستانے | رہ آسمان نوردن بہ ستارہ راز کردن
بگداز ہاے پنہان بہ نیاز ہاے پیدا | نظرے ادا شناسے بحریم ناز کردن
گہے جز یکے ندیدن بہ ہجوم لالہ زارے | گہے خار نشتن تن را ز گل امتیاز کردن

اس لیے انھون نے اگرچہ حکم خداوندی کی خلاف ورزی کی تھی تاہم اسی حیلے سے خداوند تعالیٰ کے حضور مین اپنا عذر گناہ پیش کیا،

گرچہ فسونش مرا برد ز راہ صواب | از غلطم در گذر عذر گناہم پذیر

رامم نگردد جہان نانہ فسونش خوریم | جز بکمند نیاز ناز نگردد اسیر
تا شود از آہ گرمم این بت سنگین گداز | بستن زنار او بود مرا ناگزیر
عقل بدام آورد فطرت چالاک را | اہرمن شعلہ زاد سجدہ کند خاک را

اخیر شعر مین یہ اشارہ ہے کہ اگر حضرت آدمؑ صرف مرکز خیر یعنی جنت ہی مین رہتے تو نہ تسخیر فطرت کر سکتے، نہ ان کی خودی تکمیل ہوتی، ابلیس نے ان کو سجدہ کرنے سے اس لیے انکار کیا تھا کہ ان کی خودی ناتمام تھی، لیکن دنیا مین آکر جب انسان اپنی خودی کو تکمیل کر لیتا ہے تو شیطان بھی اس کے سامنے سربسجود ہو جاتا ہے،

۲- **رومانیت**، شعر و ادب کی یہ وہ قسم ہے جس مین تخیل اور جذبات کا زور ہوتا ہے، اور چونکہ تخیل اور جذبات کی کوئی انتہا نہین اس لیے شاعری کی یہ قسم اپنے اندر غیر محدود وسعت رکھتی ہے، اور شعر و ادب کا قالب جذبہ و تخیل کی آمیزش کے بغیر شاعرانہ روح سے بالکل خالی ہوتا ہے، ایک بار والٹیر نے ایک مشہور المیہ اداکار کی اداکاری کو دیکھ کر کہا کہ وہ بہت غیر جذباتی قسم کی ہے، اس نے جب یہ تنقید سنی تو والٹیر سے شکایۃً کہا کہ "آپ جس لب و لہجہ کی مجھ سے توقع رکھتے ہین اسکے لئے ضروری ہے کہ انسان کے جسم مین شیطان ہو، والٹیر نے جواب دیا کہ "اس مین کیا شک ہے کہ ہر آرٹ مین کمال پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آرٹسٹ کے جسم مین شیطان ہو"، والٹیر کی اس سے یہ مراد تھی کہ ہر تخلیقی آرٹ جذبہ کے تحت وجود مین آتا ہے، جو ایک شیطانی قوت ہے، قدیم مشرقی ادب مین شاعری کی یہ قسم بھی کوئی نئی چیز نہین، بلکہ غزل کی مستقل صنف اسی قسم کی شاعری کے لیے وقف ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اس قسم کی شاعری کے لیے جھوٹے، نقلی اور فرضی جذبات جیسا کہ غزل مین ظاہر کیے جاتے ہین کافی نہین، بلکہ خود شاعر کے اندر کوئی جذبہ ہونا چاہیے، اور بغیر اس جذبہ کے شعر بلکہ کسی فن لطیف مین اثر نہین پیدا ہو سکتا،

آیا کہان سے نالۂ نے مین سرور مے　　اصل اسکی نے نواز کا دل ہی کہ چوب نے

جس روز دل کی رمز مغنی سمجھ گیا　　سمجھو تمام مرحلہ ہاے ہنر ہین طے

صرف یہی کافی نہین بلکہ سننے والے کے دل مین بھی ایک جذبہ ہونا چاہیے، اس لیے وہ سامع سے کہتے ہین،

پیش من آئی دم سردے دل گرمے بیار　　جنبش اندر تست اندر نغمۂ داؤد نے

اور یہ یقینی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اشعار مین جو جذبات ظاہر کیے ہین وہ نقلی نہین ہین بلکہ خود ان کے اندر ایک جذبہ موجود تھا جو ان کی پوری شاعری کا محور تھا، اس لیے اس جذبہ کی تعیین ضروری ہے، فارسی غزل گو شعرا مین خواجہ حافظ کے کلام مین جو جذبات ظاہر کیے گئے ہین وہ زیادہ تر جذب و مستی سے تعلق رکھتے ہین اور ڈاکٹر صاحب کے شاعرانہ مقاصد کے لیے بھی یہی جذبہ موزون تھا، اس لیے انھون نے یہی مستانہ روش اختیار کی اور اس کے اظہار کے لیے ایک نہایت مختصر، معنی خیز اصطلاحی لفظ قلندر کا خطاب اپنے لیے پسند کیا،

کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر

زبرون درگذشتم، ز درون خانہ گفتم　　سخن نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم

خوش آگئی ہے جہان کو قلندری میری　　وگرنہ شعر مرا کیا ہے، شاعری کیا ہے

لیکن خواجہ حافظ کی مستی صرف شراب و کباب تک محدود تھی، اور ڈاکٹر صاحب کی مستی غیر محدود ہے، فرانسیسی شاعر بودلیر حقیقی شاعر کے لیے مستی اور جذب کو لوازمات فن مین سے تصور کرتا ہے، بقول اس کے "ہر وقت بدست و بیخود رہو سب کچھ اسی مین ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کس قسم کی مستی؟ یہ چاہے شراب کی ہو، شاعری کی ہو، یا نیک کرداری کی ہو، لیکن ہو ضرور ——— ہوا سے پوچھو کہ کیا وقت ہے؟ سمندر کی موجون سے پوچھو، ستارے سے پوچھو، طائر خوش الحان سے پوچھو،

گھڑی سے پوچھو، ہر اس چیز سے پوچھو جو رواں دواں ہے، جو نوحہ خواں ہے، جو گردش میں ہے، جو نغمہ طراز ہے، جو طاقتِ گویائی رکھتی ہے، اور تمھیں ان سبھوں سے یہی جواب ملے گا کہ وقت مست و بیخود ہونے کا ہے، اگر تم وقت کے مظلوم غلام نہیں ہونا چاہتے ہو تو مست ہو، چاہے وہ مستی شراب کی ہو، چاہے شاعری کی، چاہے نیک کرداری کی، یہ تمھاری رغبت و پسند پر منحصر ہے''

ڈاکٹر صاحب نے اسی جذب و مستی کی کیفیت کو قلندری کے لفظ سے ظاہر کیا ہے،

جذب و مستی کی حالت میں جو مضامین بیان کیے جاتے ہیں وہ عموماً نشاط انگیز اور ولولہ خیز ہوتے ہیں، اور ڈاکٹر صاحب کی پوری شاعری اس معیار پر ٹھیک اترتی ہے لیکن ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے مغربی رمزیت و رومانیت کے نمونے نہیں دکھلائے جس سے یہ معلوم ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب نے اس میں کیا کیا تصرفات کیے ہیں، تاہم یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ڈاکٹر صاحب نرے مقلد نہیں ہیں وہ ہر جگہ سے کچھ نہ کچھ چیزیں ضرور لیتے ہیں، لیکن ان میں تصرفات کر کے ایک نیا عالم پیدا کر دیتے ہیں، غالباً مغربی شاعری میں رمزیت اور رومانیت دونوں الگ الگ شاعرانہ مسلک کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب نے دونوں کی آمیزش کر کے ایک نیا عالم پیدا کر دیا، مثلاً خیر و شر کی آمیزش کے فلسفہ کو اپنی ایک دوسری نظم ''حور اور شاعر'' میں بھی انھوں نے بطور رمز کے بیان کیا ہے، لیکن اس میں ایسے لطیف عاشقانہ اور رندانہ جذبات شامل کر دیے ہیں کہ وہ جذبہ اور تخیل کا بھی نہایت عمدہ نمونہ بن گئی ہے، اس نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ اتفاق سے ایک شاعر بھولا بھٹکا جنت میں پہنچ گیا، لیکن وہ اپنے خیالات میں ایسا محو تھا کہ جنت کی دلکشی کی طرف اس نے کوئی توجہ نہ کی، حور اس سے کہتی ہے کہ تو عجیب و غریب مخلوق ہے کہ نہ تجھے شراب کا شوق ہے، نہ میری طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہے، تو راہ و رسم آشنائی سے بالکل بیگانہ معلوم ہوتا ہے، بس تجھے صرف یہ آتا ہے کہ اپنی شاعری سے ایک خیالی دنیا کا طلسم پیدا کر دے،

عجب این کہ تو ندانی رہ و رسم آشنائی	نہ بہ بادہ میل داری، نہ بمن نظر کشائی
کہ ارم بحیثیت آید چو طلسم سیمیائی	بنوائے آفریدی چہ جہان دل کشائے

شاعر اس کا جواب دیتا ہے کہ میں ایک جگہ قیام نہیں کر سکتا، آرزو کی کسک مجھے کہین چین سے نہین بیٹھنے دیتی، جب مین کسی خوبرو کو دیکھتا ہون تو بجائے اس کے کہ اس کے حسن سے لذت اندوز ہون میرے دل مین فوراً یہ خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ کاش اس سے بھی زیادہ خوبرو کو دیکھتا، جنت تو بڑی بے لطف جگہ ہے، یہان نہ نوائے دردمند سنائی دیتی ہے، نہ یہان غم ہے اور نہ غمگسار، یہان ہر کوئی مطمئن نظر آتا ہے، کسی کے دل مین داغ تمنا نہین،

دل ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے	چہ کنم کہ فطرت من بہ مقام در نسازد
تپد آن زمان دل من پے خوب تر نگارے	چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروے
سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے	ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
غزلے دگر سرایم بہ ہوائے نو بہارے	چو ز بادۂ بہاری قدحے کشیدہ خیزم
بنگاہ ناشکیبے بہ دل امید وارے	طلبم نہایتے آن کہ نہایتے ندارد
نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غمگسارے	دل عاشقان بمیرد بہ بہشت جاودانے

ان اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ جذبہ کی تسکین اسی وقت ہوتی ہے جب اس کو تسکین نہ ہو، وہ ایک حالت پر قانع نہین رہتا بلکہ ارتقائی منازل طے کرنا چاہتا ہے، اور ارتقاء کے لیے یہ ضروری ہے کہ پست و بلند، اور نیک و بد دونون کا وجود ہو، ممکن ہے کہ دنیا کی ہر چیز اپنی جگہ پر عمدہ ہو یا اس مین برائی اور بھلائی کچھ بھی نہ ہو، لیکن ارتقائی منازل مین جب انسان ایک زینہ کو طے کر کے دوسرے زینے پر قدم رکھتا ہے تو پہلا زینہ قدرتی طور پر پست ہو جاتا ہے، ایک حسین کو دیکھ کر انسان جب اس سے زیادہ حسین کی تلاش کرتا ہے تو خود بخود بدصورتی کا تخیل

پیدا ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض فلاسفہ کے نزدیک خیر و شر حقیقی چیز نہین ہیں، بلکہ اضافی ہین،
اب ان دقیق مسائل کو پیش نظر رکھکر دیکھو کہ ڈاکٹر صاحب نے ان کو کسقدر عاشقانہ رنگ مین حل کیا ہے،
ڈاکٹر یوسف حسین خان نے لکھا ہے کہ اسی مضمون کو غالب نے اپنی مثنوی "ابر گہر بار" مین

اس طرح بیان کیا ہے،

دران پاک میخانۂ بے خروش	چہ گنجایشِ شورشِ نائے و نوش
سیہ مستیِ ابر باران کجا	خزان چون نباشد بہاران کجا
اگر حور در دل جانش کہ چہ	غم و ہجر و ذوقِ وصالش کہ چہ
چہ منت نہد نا شناسا نگار	چہ لذت دہد وصل بے انتظار

ممکن ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ مضمون غالب ہی سے اخذ کیا ہو، لیکن ایشیائی رمزیت
اور مغربی رمزیت مین بڑا فرق ہے، ہر تشبیہ و استعارہ مغربی رمزیت مین داخل نہین ہے، بلکہ
مغرب مین رمزیت نے ایک ڈرامے کی شکل اختیار کر لی ہے، اور ڈاکٹر صاحب نے بھی یہی
طرز اختیار کیا ہے،

(۳) **کلاسکیت**، ادب اور آرٹ کی ایک قسم وہ ہے جس مین تخیل اور جذبات کا زور
نہین ہوتا، بلکہ طریق فن اور ظاہری شکل کا خیال زیادہ ملحوظ رہتا ہے، مغربی ادب اور آرٹ کی
تاریخ مین اس شاعرانہ مسلک کو کلاسکی کہتے ہین، اور اس مسلک کے مطابق انسانی فطرت
متعین ہے، صرف نظم و ترتیب اور مقررہ روایات کی پابندی سے آرٹسٹ کوئی دلپذیر چیز پیدا
کر سکتا ہے، اس مسلک کے حامی کہتے ہین کہ غیر محدودیت اور بلند پروازی کے عناصر آرٹ کیلیے
مہلک ہین، ان کے نزدیک انسانی زندگی کے امکانات بھی محدود ہین، یہ مسلک واقعہ نگاری
اور تاریخی مضامین کے لیے زیادہ موزون ہے، اور ڈاکٹر صاحب نے چونکہ بہت سی تاریخی نظمین بھی

لکھی ہین، اس لیے انھون نے اس طرز سے بھی کام لیا ہے، تاہم وہ بھی جذبات کی آمیزش سے خالی نہین، بلکہ انھون نے جس طرح رمزیت مین رومانیت کے اجزا شامل کردیے ہین اسی طرح کلاسکیت مین بھی رومانیت کے عناصر کا امتزاج کیا ہے، بال جبریل مین عبدالرحمٰن اول کے سرزمین اندلس مین پہلا کھجور کا درخت لگانے پر جو نظم ہے وہ اس طرز کی بہترین مثال ہے، اس نظم کو پڑھ کر انسان کے دل مین معاً وہ سب تاریخی تمنائین گذر جاتے ہین جو فاتح عربون کے ذوق عمل کے آئینہ دار تھے جس طرح وہ سرزمین اندلس مین اپنی تئیں اجنبی محسوس کرتے تھے، اسی طرح کھجور کا درخت بھی اس سرزمین کی آب و ہوا سے نا آشنا تھا، کھجور کے درخت کو دیکھکر ایک عرب کے دل پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے شاید ہم لوگ اس سے ناواقف ہون، عرب کا تخیل انہی نخلستانون مین پرورش پاتا اور اپنے ریگستان کی وسعت کی طرح پھیلتا اور بڑھتا ہے، یہ نظم تاریخ المقری سے ماخوذ ہے، اور جس طرح اس کا مضمون سادہ اور دلکش ہے، اسی طرح اسکی بحر اور زبان بھی سادہ اور دلکش ہے، عبدالرحمٰن اول کھجور کے درخت کو نہایت محبت آمیز الفاظ مین اس طرح مخاطب کرتا ہے،

میری آنکھون کا نور ہے تو | میرے دل کا سرور ہے تو
اپنی وادی سے دور ہون مین | میرے لیے نخل طور ہے تو
مغرب کی ہوا نے تجھکو پالا | صحرائے عرب کی حور ہے تو
پردیس مین ناصبور ہون مین | پردیس مین ناصبور ہے تو
غربت کی ہوا مین بارور ہو | ساقی تیرا نم سحر ہو

شاعر نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ عرب فاتح اندلس مین اپنے تئین اجنبی محسوس کرتے تھے، لیکن اس کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ انسان اپنے عمل کی قوت سے ہر ماحول پر قابو پا سکتا ہے اور ہر جگہ رس بس سکتا ہے، وہ کسی ایک سرزمین سے وابستہ نہین، انسان کی فضیلت خاک کی بدولت

نہین بلکہ اس کے سوز درون کی بدولت ہے، چنانچہ کہتا ہے،

عالم کا عجیب ہے نظارہ — دامانِ نگہ ہے پارہ پارہ

ہمت کو شناوری مبارک — پیدا نہین بحر کا کنارہ

ہے سوز درون سے زندگانی — اٹھتا نہین خاک سے شرارہ

صبح غربت مین اور چمکا — ٹوٹا ہوا شام کا ستارہ

مومن کے جہان کی حد نہین ہے — مومن کا مقام ہر کہین ہے،

بال جبریل کی متعدد نظمین بالخصوص مسجد قرطبہ والی نظم اس طرز کی بہترین مثال ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسرار خودی اور رموز بیخودی مین جو حکایتین لکھی ہین وہ بھی اس طرز مین داخل کی جاسکتی ہین، اسلیے ان کا رنگ واعظانہ نہین بلکہ اس مسلک کے مطابق شاعرانہ ہے، اور ڈاکٹر یوسف حسین خان نے ان کی نسبت بالکل سچ لکھا ہے کہ

وہ خشک طریقے پر وعظ و نصیحت نہین کرتے واعظانہ مقدمات ان کی شاعری مین شاذ ونادر ہین لیکن ان کی شوخ گفتاری اخلاقی موضوعون کو بھی ایسے لطیف اور دلکش انداز مین پیش کرتی ہے، کہ سامع کے دل کو سیری نہین ہوتی،

البتہ اس سے انکار نہین کیا جاسکتا کہ اس قسم کی نظمون مین شاعرانہ عناصر کم ہوتے ہین، ڈاکٹر یوسف حسین خان نے مغربی طرز تنقید کے ساتھ مشرقی طرز تنقید کے چند اجزا بھی اپنی تنقید مین شامل کر لیے ہین، اور ان کے علاوہ اور لوگون نے بھی اس طریقہ کے مطابق ڈاکٹر صاحب کے کلام کی بعض خصوصیات کی طرف اجمالی اشارات کیے ہین، لیکن ہمارے نزدیک اس مقصد کے لیے اس سے بہت زیادہ تفصیل و استقصار کی ضرورت ہے اور ہم اس ضرورت کو اپنے فہم و درایت کے مطابق پورا کرنے کی کوشش کرتے ہین، قدیم مشرقی طریقۂ تنقید اگرچہ معانی و مطالب کو

کلیۃً نظر انداز نہین کرتا تاہم اس کی نظر زیادہ تر الفاظ پر رہتی ہے، اور وہ مادہ سے زیادہ صورت کا پرستار ہے، اس لیے ہم پہلے اسی طرز کا اتباع کرتے ہین،

(۱) **حسن الفاظ**، ڈاکٹر صاحب نے اگرچہ اپنے اشعار مین گوناگون مضامین نظم کیے ہین لیکن ان مین کہین بھی مبتذل، عامیانہ اور سبک الفاظ نہین آئے ہین، ڈاکٹر صاحب کے ایک تنقید نگار نے ان کے کلام کی اس خصوصیت کی طرف ان الفاظ مین اشارہ کیا ہے

> اقبال کے پورے کلام مین کوئی چیز ایسی نظر نہین آسکتی جس مین کسی قسم کا ابتذال یا عامیانہ پن کا ذرا سا بھی رنگ جھلکتا ہو، اس کی بلند فطرت کسی مبتذل، ناپاک اور محدود چیز کو ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہین کر سکتی تھی، یہی وجہ ہے کہ اگرچہ اس نے حسن وعشق کے میدانون مین بھی جولانی دکھائی ہے، مگر کہین بھی ہم اسے کسی "بیسوا" کی زلف گرہ گیر مین پھنسا ہوا نہین دیکھتے[1]

الفاظ چونکہ معانی کے تابع ہوتے ہین، اس لیے وہ خیال کی پاکیزگی کے ساتھ ہمیشہ شستہ فصیح اور پاکیزہ الفاظ استعمال کرتے ہین، ان کے ساقی نامہ مین بے شبہہ ایک عامیانہ لفظ موجود ہے

تماشا دکھا کر مداری گیا　　گیا دور سرمایہ داری گیا

اسی طرح بانگ درا کے اخیر مین جو ظریفانہ کلام شامل ہے اس مین بھی چند مبتذل الفاظ ہین، مثلاً ڈینگ، ہینگ، سینگ، مٹکا، جھٹکا وغیرہ، لیکن ظریفانہ کلام مین اس قسم کے الفاظ کی کھپت ہو سکتی ہے، اس کے علاوہ ان کا سنجیدہ کلام اس قسم کے الفاظ سے بالکل پاک ہے،

ڈاکٹر صاحب کے کلام مین اگرچہ لفظی صناعیان بہت کم ہین، تاہم بعض موقعون پر الفاظ کی تکرار جو ایک لفظی صنعت ہے، عجیب حسن پیدا کر دیتی ہے، مثلاً

---

[1] سب رس اقبال نمبر ص ۸،

خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفان یم بہ یم ، دریا بدریا، جو بجو
مین کھٹکتا ہون دل یزدان مین کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو ، اللہ ہو ، اللہ ہو

پھول ہین صحرا مین یا پریان قطار اندر قطار — اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن
تیرے محیط مین کہین گوہر زندگی نہین — ڈھونڈھ چکا مین موج موج دیکھ چکا صدف صدف
نہ در حرم نہ بہ بتخانہ یابم آن ساقی — کہ شعلہ شعلہ بہ بخشد، شرر شرر بدہد
رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر — سبزہ جہان جہان بہ بین لالہ چمن چمن نگر
باد بہار موج موج مرغ بہار فوج فوج — صلصل و سار زوج زوج بر سر نارون نگر
لالہ ز خاک بر دمید موج بآبجو تپید — خاک شرر شرر بہ بین آب شکن شکن نگر
زخمہ بتار ساز زن بادہ بہ ساتگین بریز — قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر

بعض اور لفظی صنعتین بھی انکے کلام مین بے ساختگی کے ساتھ آگئی ہین، مثلاً

دگرگون کشور ہندوستان است — دگرگون آن زمین و آسمان است
مجو از ما نماز پنجگانہ — غلامان را صف آرائی گران است

اس قطعہ مین صنعت ایہام ہے۔ کیونکہ صف آرائی کے ایک معنی تو نماز کے لیے صف بندی کے ہین، لیکن صف آرائی کے دوسرے معنی جنگ کرنے کے بھی ہین اور اس قطعہ مین یہی معنی مراد ہین،

دختر کے برہمنے لالہ رخے سمن برے — چشم بروئے اوکشا باز بخویشتن نگر

"باز بخویشتن نگر" مین بھی صنعت ایہام ہے، اس کے ایک معنی تو یہ ہین کہ اس برہمن زادی کو دیکھکر اپنے دل کو بھی دیکھو کہ وہ اپنے آپ مین ہے یا نہین؟ یہ ایک عاشقانہ مضمون ہے جس مین

بیخودی پائی جاتی ہے. لیکن ڈاکٹر صاحب کے فلسفۂ خودی کے رو سے یہ معنی بھی ہو سکتے ہین کہ منظر کتنا ہی ہوشربا ہو لیکن اپنی خودی کو نہین کھونا چاہیے، بلکہ اپنے دل کو قابو مین رکھنا چاہیے،

دو گیتی را صلا از قرأت اوست ۔۔۔ مسلمان لایموت از رکعت اوست

نداند کشتۂ این عصر بے سوز ۔۔۔ قیامت ہا کہ در قد قامت اوست

قیامت اور قد قامت مین صنعتِ اشتقاق یا صنعتِ تجنیس ہے، ڈاکٹر صاحب کی شاعری اور فلسفہ کا جو خلاصہ ہے، اس کو انھون نے خود ایک مصرعہ مین بیان کر دیا ہے،

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

اور اس مقصد کے لیے شاہنامہ کی زبان درکار ہے، اور وہ انکے کلام مین موجود بھی ہے،

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولے ۔۔۔ ہو جس کی فقیری مین بوئے اسد اللہی

آئین جوان مردان حق گوئی و بیباکی ۔۔۔ اللہ کے شیرون کو آتی نہین روباہی

لیکن زیادہ تر اس قسم کے مضامین کو بھی وہ غزل ہی کی زبان مین نہایت لطافت کے ساتھ بیان کرتے ہین اور وہی الفاظ لاتے ہین جو غزل مین عام طور پر استعمال کیے جاتے ہین، مثلاً ان کو یہ کہنا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو خطرات مین مبتلا رکھنا پسند کرتے ہین، ان کے لیے امن وسکون اور عیش وعشرت کے مقامات موزون نہین ہین، اور وہ اس مضمون کو اس طرح بیان کرتے ہین،

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہین ۔۔۔ وہ گلستان کہ جہان گھات مین نہ ہو صیاد

وہ عیش وتنعم کی زندگی کے ترک کرنے کی تعلیم دیتے ہین، لیکن قوم اس کی مخالفت کرتی ہے، اس مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہین،

بگو اقبال را اے باغبان رخت از چمن بندد ۔۔۔ کہ این جادو نوا مارا ز گل بیگانہ میسازد

آزادی کی تعلیم اس طرح دیتے ہین،

تا کجا در تہِ بالِ دگران مے باشی در ہوائے چمن آزادہ پریدن آموز

زندگی حرکت و ارتقا کا نام ہے، اس لیے

بہ آشیان ننشینم ز لذتِ پرواز گہے بہ شاخِ گلم گاہ بر لبِ جویم

وہ معجزانہ انقلابی طاقت جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں تھی، اب باقی نہین ہے لیکن ڈاکٹر صاحب اپنی شاعری کے ذریعہ سے اس کو زندہ کرنا چاہتے ہین،

چراغِ خویش برافروختم کہ دستِ کلیم درین زمانہ نہان زیرِ آستین کردند

غرض وہ ایک انقلابی شاعر ہین جیسا کہ وہ خود کہتے ہین،

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن چون پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

گفتند جہانِ ما آیا بتو مے سازد؟ گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

لیکن وہ اس انقلاب انگیز شاعری کو غزل ہی کی زبان مین استعارۃً و کنایۃً نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتے ہین، اور اس پر خود ان کو فخر ہے اور بجا فخر ہے،

پردہ برگیرم و در پردہ سخن می گویم تیغِ خونریزم و خود را بہ نیامے دارم

اسی خصوصیت کی بنا پر مجنون گورکھپوری نے ڈاکٹر صاحب کے کلام کی نسبت یہ رائے قائم کی ہے۔

اگر ہم صحیح ذوق کے ساتھ اقبال کے کلام کا مطالعہ کرین تو کیا نظم مین کیا غزل مین جو کیفیت سب سے زیادہ نمایان اور موثر طور پر محسوس ہوتی ہے، وہ وہی ہے جس کو مبہم اور مجموعی طور پر تغزل کہا جا سکتا ہے، ہم کو تو کبھی کبھی ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اقبال فطرۃً غزل گو تھے، اور اتنے بڑے نظم نگار ہونے کے بعد اور اس کے باوجود بھی وہ غزلگو ہی رہے، نظمون مین بھی انھون نے ایک قسم کی غزلگوئی ہی کی ہے ...... جہان تک الفاظ اور ترکیبون کے حسن انتخاب

کا تعلق ہے، اقبال ہم کو جدید شعرائے اردو مین سب سے زیادہ ممتاز نظر آتے ہین، ان کا اسلوب بحیثیت مجموعی وہی ہے جس کو غزل کا روایتی اسلوب کہہ سکتے ہین اور جس کا جوہر رومانیت ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ہم اقبال کے اسلوب کو "کلاسیکی اسلوب" کہہ سکتے ہین، لیکن اقبال کا اصلی اجتہاد یہ ہے کہ انھون نے پرانے الفاظ و فقرات اور پرانے اسالیب و روایات کو بالکل نئے انداز سے استعمال کرکے ہماری زندگی کی نئی ضرورتون کے لیے کام مین لائے ہین۔[۱]

(۲) لب و لہجہ، جن شعرا نے کسی خاص مقصد کو پیش نظر رکھکر شاعری کی ہے اور وہ اپنے دل مین ایک پختہ جذبہ رکھتے تھے، ان کا ایک خاص لہجہ ہوتا ہے، خواجہ حافظ کا لہجہ مستانہ ہے۔ فردوسی کا لہجہ دلیرانہ ہے، اور مولانا روم کا لہجہ کہین فلسفیانہ، کہین صوفیانہ اور کہین متکلمانہ ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر صاحب کا بھی ایک خاص لہجہ ہے، جس کو ایک صاحب ذوق نے محسوس کیا ہے اور لکھا ہے کہ

اقبال کی جس خصوصیت نے مجھے حد سے زیادہ اس کا گرویدہ بنا دیا ہے وہ اس کا لہجہ Tone ہے،..... لہجہ کی تعریف کرنی اتنی ہی مشکل ہے جتنی شاعری کی، مین سمجھتا ہون کہ یہ چیز صرف محسوس کی جا سکتی ہے...... وہ کسی موضوع پر بھی اظہار خیال کرے اپنے مخصوص لہجے ہی مین کرتا ہے، جس سے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ یہان اقبال بول رہا ہے، اور ہمالیہ جیسی ابتدائی نظمون سے لے کر ضرب کلیم اور بال جبرئیل کی آخری نظمون تک اقبال کا لہجہ ہمیشہ برقرار رہتا ہے، ایک لمحے کے لیے بھی اس مین کوئی تبدیلی نظر نہین آتی، مین اس امر کو شاید تسلیم کر لون کہ اقبال نے بعض بعض نظمون مین دوسرون کے خیالات سے اکتساب فیض کیا ہے اور کہین کہین توارد خیال بھی نظر آجاتا ہے، لیکن کسی طرح یہ نہین مان سکتا کہ اقبال کا لہجہ کسی حد تک بھی کسی دوسرے شاعر کا رہین منت ہے۔ اقبال اپنے

[۱] اقبال از مجنون گورکھپوری ص ۸۹، ۹۰

لہجے مین شروع سے آخر تک اقبال ہے .... اقبال کا لہجہ کیا ہے؟ وہ شاعری کا ایک معجزہ ہے۔ وہ ایک ایسے شخص کی آواز ہے جو دلون پر حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ وہ ایک ایسے عظیم المرتبت انسان کی صدا ہے جو قومون کے باطن مین انقلاب پیدا کر سکتا ہے، مختصر یہ کہ وہ آسمانی آواز ہے، ربانی نغمہ ہے۔[۱]

ڈاکٹر صاحب نے بعض اشعار مین خود بھی اپنے لہجہ کی طرف اشارے کیے ہین:

چمن مین تلخ نوائی مری گوارا کر | کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

یہ زور دست و ضربت کاری کا ہے مقام | میدان جنگ مین نہ طلب کر نوائے چنگ

عطا ہوا خس و خاشاک ایشیا مجھکو | کہ میرے شعلے مین ہے سرکشی و بیباکی

یعنی انکا لہجہ نہایت تند و تیز اور انقلاب انگیز ہے، مثلاً

اٹھو مری دنیا کے غریبون کو جگا دو | کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلامون کا لہو سوزِ یقین سے | کنجشکِ فرومایہ کو شاہین سے لڑا دو

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ | جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہین روٹی | اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

نشان یہی ہے زمانے مین زندہ قومون کا | کہ صبح و شام بدلتی ہین ان کی تقدیرین

قلندرانہ ادائین سکندرانہ جلال | یہ امتین ہین جہان مین برہنہ شمشیرین

خودی سے مرد خود آگاہ کا جمال و جلال | کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیرین

شکوہ عید کا منکر نہین ہون مین لیکن | قبول حق ہے فقط مرد حر کی تکبیرین

لیکن انقلاب انگیز ہونے کے ساتھ وہ ایک مرد قلندر بھی ہین، اور ان مین درویشانہ اد

---

[۱] سب رس حیدر آباد اقبال نمبر ص ۸۰

فقیرانہ شان بھی پائی جاتی ہے، اس لیے کہین کہین ان کا لہجہ قلندرانہ، درویشانہ اور فقیرانہ ہو جاتا ہے، مثلاً

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی   گھر میرا نہ دلی نہ صفاہان نہ سمرقند
ہون آتش نمرود کے شعلون مین بھی خاموش   مین بندۂ مومن ہون نہین دانۂ اسپند

اپنے من مین ڈوب کر پا جا سراغ زندگی   تو اگر میرا نہین بنتا نہ بن اپنا تو بن
من کی دنیا، من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق   تن کی دنیا، تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہین   تن کی دولت چھاؤن ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن
من کی دنیا مین نہ پایا مین نے افرنگی کا راج   من کی دنیا مین نہ دیکھے مین نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھکو قلندر کی یہ بات   تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

خودی کا سر نہان لا الہ الا اللہ   خودی ہے تیغ فسان لا الہ الا اللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش مین ہے   صنم کدہ ہے جہان لا الہ الا اللہ
کیا ہے تو نے متاع غرور کا سودا   فریب سود و زیان لا الہ الا اللہ
یہ مال و دولت دنیا یہ رشتہ و پیوند   بتان وہم و گمان لا الہ الا اللہ
خرد ہوئی ہے زمان و مکان کی زناری   نہ ہے زمین نہ مکان لا الہ الا اللہ
یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہین پابند   بہار ہو کہ خزان لا الہ الا اللہ

جہان دل جہان رنگ و بو نیست   درو پست و بلند و کاخ و کو نیست
زمین و آسمان و چار سو نیست   درین عالم بجز اللہ ہو نیست

لیکن وہ اس نکتہ سے واقف ہین کہ ہر مضمون کیلیے ایک ہی لہجہ موزون نہین ہے بلکہ مضمون کے بدل جانے سے لب و لہجہ بھی بدل جاتا ہے، مثلاً جہان سوز و گداز کا موقع آتا ہے وہان انکا لب و لہجہ نہایت دردمندانہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

وہ لذتِ آشوب نہیں بحرِ عرب میں
پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے

ہرچند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد
اس کوہ و بیابان سے حدی خوان کدھر جائے

اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمد
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

ان کا ناصحانہ لہجہ بھی نہایت نرم و موثر ہوتا ہے اور اس میں جوش و خروش بالکل نہیں پایا جاتا، ایک نظم میں انھوں نے جاوید سلّمہٗ کو چند نصیحتیں کی ہیں، لیکن انداز چونکہ ناصحانہ ہے اس لیے لہجہ نہایت نرم ہو گیا ہے، اس کے چند شعر یہ ہیں:-

اے جانِ پدر نہیں ہے ممکن
شاہیں سے تدرو کی غلامی

نایاب نہیں متاعِ گفتار
صد انوری و ہزار جامی

ہے میری بساط کیا جہاں میں
بس ایک فغانِ زیر بامی

اک صدقِ مقال ہے کہ جس سے
میں چشمِ جہاں میں ہوں گرامی

اللہ کی دین ہے جسے دے
میراث نہیں بلند نامی

اپنے نورِ نظر سے کیا خوب
فرماتے ہیں حضرتِ نظامی

"جائے کہ بزرگ بایدت بود
فرزندیِ من ندارت سود"

(۳) حسنِ قافیہ و ردیف، ڈاکٹر صاحب غزل، مثنوی، نظم غرض ہر صنف کلام کیلیے قافیہ کو ضروری سمجھتے ہیں، اور انکے یہاں قافیہ کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں، عام طور پر چند متداول قافیے ہیں جو غزلوں میں عموماً مستعمل ہیں، اور ڈاکٹر صاحب نے بھی ان کو استعمال کیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ان کے کلام میں بہت سے غیر معروف قافیے بھی پائے جاتے ہیں، جن سے جدت اور تازہ کاری کا لطف حاصل ہوتا ہے، مثلاً تیز، رستاخیز، خونریز، تبریز، زرخیز، پرویز کے قافیے اس غزل میں

دگرگون ہے جہان تارون کی گردش تیز ہے ساقی

جنون، خوار وزبون، گوناگون، افلاطون، گردون، کن فیکون، فسون، جیحون کے قافیے اس غزل مین

وہ حرف راز کہ مجھکو سکھا گیا ہے جنون
خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہون

درویشی، خویشی، ناخوش اندیشی، بیشی، بے نیشی کے قافیے اس غزل مین

این رازہے مردان حر کی درویشی — کہ جبرئیل سے ہے اس کو نسبت خویشی

رفیق، طریق، خلیق، دقیق، توفیق، عتیق، تصدیق، زندیق کے قافیے اس غزل مین،

ہزار خوف ہو لیکن زبان ہو دل کی رفیق — یہی رہا ہے ازل سے قلندرون کا طریق

صف، ہدف، صدف، تلف، شرف، سربکف، لاتخف، نجف کے قافیے اس غزل مین

میر سپاہ ناسزا لشکریان شکستہ صف — آہ وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

استعمال ہوئے ہین اور اپنی جدت و تازگی کی وجہ سے نہایت پرلطف معلوم ہوتے ہین،

جدت قافیہ کی یہ چند مثالین ہم نے سرسری طور پر صرف بال جبرئیل سے چن لی ہین، ورنہ اگر اس حیثیت سے ان کی تمام غزلون، مثنویون اور نظمون کا مطالعہ کیا جائے تو جدید قافیون کی ایک دنیا نظر آئے گی،

سجع ایک صنعت ہے، جو خاص طور پر قافیے سے تعلق رکھتی ہے، یعنی شعر مین پے درپے متعدد قافیے آتے ہین جن مین اگر تکلف و آورد نہ ہو تو کلام مین نہایت روانی، برجستگی اور خوشنوائی پیدا ہوجاتی ہے، اور ڈاکٹر صاحب کے کلام مین جابجا اسکی نہایت عمدہ مثالین ملتی ہین: مثلاً

نہ سلیقہ مجھ مین کلیم کا، نہ قرینہ تجھ مین خلیل کا — مین ہلاک جادوے سامری، تو قتیل شیوۂ آذری

مین نوائے سوختہ در گلو، تو پریدہ رنگ، رمیدہ بو — مین حکایت غم آرزو، تو حدیث ماتم دلبری

مرا عیش غم، مرا شہد سم، مری بود ہم نفس عدم	ترا دل حرم، گرو عجم، ترا دین خریدۂ کافری
دم زندگی، رم زندگی، غمِ زندگی، سمِ زندگی	غم رم نہ کر، سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری
تری خاک مین ہے اگر شرر، تو خیالِ فقر و غنا نہ کر	کہ جہان مین نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری
کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہین منتظرِ کرم	وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنھین دماغِ سکندری
یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم	جہادِ زندگانی مین ہین یہ مردون کی شمشیرین

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ردیف اگرچہ ضروری نہین ہے، تاہم اس سے کلام مین حسن ضرور پیدا ہو جاتا ہے، لیکن اس کے لیے بھی جدت ضروری ہے۔ عام اور آسان ردیفون مثلاً "ہے" "ہو" "ہوا" "نہین" وغیرہ مین کوئی لطف نہین، اور عام طور پر شعرا اسی قسم کی آسان ردیفین استعمال کرتے ہین، اور ڈاکٹر صاحب کے کلام مین بھی اس قسم کی ردیفین ہین، اس کے برخلاف بعض شعرا نے نہایت مشکل ردیفین اختیار کی ہین اور ان مین زورِ طبع دکھایا ہے، اردو شاعری کی تاریخ مین اس حیثیت سے شاہ نصیر کا زمانہ خاص طور پر ممتاز ہے، لیکن اس قسم کے اشعار مین ردیف کے سوا اور کچھ نہین ہوتا، لیکن اب ان دونون کے بین بین ڈاکٹر صاحب نے بہت سی ردیفین ایسی اختیار کی ہین جو نہ بہت عام و آسان ہین اور نہ بہت سخت و مشکل، اس لیے ان مین ایک طرف تو جدت و تازگی پائی جاتی ہے، دوسری طرف مضمون کا سررشتہ بھی ہاتھ سے جانے نہین پاتا، مثلاً

اپنی جولان گاہ زیرِ آسمان سمجھا تھا مین	آب و گِل کے کھیل کو اپنا جہان سمجھا تھا مین
بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہون کا طلسم	اک ردائے نیلگون کو آسمان سمجھا تھا مین
عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام	اس زمین و آسمان کو بیکران سمجھا تھا مین
کاروان تھک کر فضا کے پیچ و خم مین رہ گیا	مہر و ماہ و مشتری کو ہم عنان سمجھا تھا مین
کہہ گئین رازِ محبت پردہ داریہاے شوق	تھی فغان وہ بھی جسے ضبطِ فغان سمجھا تھا مین

تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کاروان سمجھا تھا مین

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہین
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہین

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیاتِ ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہین

گران بہا ہی تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ
گہر مین آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہین

رگون مین گردشِ خون ہی اگر تو کیا حاصل
حیات سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہین

عروسِ لالہ! مناسب نہین ہی مجھ سے حجاب
کہ مین نسیمِ سحر کے سوا کچھ اور نہین

جسے کساد سمجھتے ہین تاجرانِ فرنگ
وہ شے متاعِ ہنر کے سوا کچھ اور نہین

بڑا کریم ہے اقبالِ بے نوا لیکن
عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہین

تو اے اسیرِ مکان لامکان سے دور نہین
وہ جلوہ گاہ ترے خاکدان سے دور نہین

وہ مرغزار کہ بیمِ خزان نہین جس مین
غمین نہ ہو کہ ترے آشیان سے دور نہین

یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری کہ حیات
خدنگِ جستہ ہے لیکن کمان سے دور نہین

فضا تری مہ و پروین سے ہی ذرا آگے
قدم اٹھا یہ مقام آسمان سے دور نہین

کہے نہ راہ نما سے کہ چھوڑ دے مجھکو
یہ بات راہروِ نکتہ دان سے دور نہین

ستارون کے آگے جہان اور بھی ہین
ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہین

تہی زندگی سے نہین یہ فضائین
یہان سیکڑون کاروان اور بھی ہین

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیان اور بھی ہین

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغان اور بھی ہین

تو شاہین ہی پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسمان اور بھی ہین

اسی روز و شب مین الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکان اور بھی ہین

یہ حکمت ملکوتی یہ علم لاہوتی — حرم کے درد کا درمان نہین تو کچھ بھی نہین

یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور — تری خودی کے نگہبان نہین تو کچھ بھی نہین

یہ عقل جو مہ و پروین کا کھیلتی ہے شکار — شریکِ شورشِ پنہان نہین تو کچھ بھی نہین

خرد نے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل — دل و نگاہ مسلمان نہین تو کچھ بھی نہین

عجب نہین کہ پریشان ہے گفتگو میری — فروغِ صبح پریشان نہین تو کچھ بھی نہین

بیان مین نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے — ترے دماغ مین بتخانہ ہو تو کیا کہیے

یہ رمز شوق کہ پوشیدہ لاالہ مین ہے — طریقِ شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیے

سرور جو حق و باطل کی کارزار مین ہے — تو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیے

جہان مین بندۂ حر کے مشاہدات ہین کیا — تری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہیے

مقام فقر ہے کتنا بلند شاہی سے — روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہیے

جہان اگرچہ دگرگون ہے قم باذن اللہ — وہی زمین وہی گردون ہے قم باذن اللہ

کیا نوائے انا الحق کو آتشین جس نے — تری رگون مین وہی خون ہے قم باذن اللہ

غمین نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور ترا — فرنگیون کا یہ افسون ہے قم باذن اللہ

اس قسم کی ردیفین جہان سوالیہ جملے کی صورت اختیار کر لیتی ہین وہان اور بھی لطافت پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً

اگر کج رو ہین انجم آسمان تیرا ہے یا میرا؟ — مجھے فکر جہان کیون ہو جہان تیرا ہے یا میرا؟

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکان خالی — خطا کسکی ہے یارب! لامکان تیرا ہے یا میرا؟

اسے صبح ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر — مجھے معلوم کیا وہ رازدان تیرا ہے یا میرا؟

محمد بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا — مگر یہ حرف شیرین ترجمان تیرا ہے یا میرا؟

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہان روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیان تیرا ہے یا میرا؟

عالم آب و خاک و باد سرِ عیان ہے تو کہ مین؟
وہ جو نظر سے ہے نہان اسکا جہان ہے تو کہ مین؟

وہ شب درد و سوز و غم کہتے ہین زندگی جسے
اسکی سحر ہے تو کہ مین؟ اسکی اذان ہے تو کہ مین؟

کس کی نمود کیلیے شام و سحر ہین گرم سیر
شانۂ روزگار پر بار گران ہے تو کہ مین؟

تو کفِ خاک و بے بصر مین کفِ خاک و خود نگر
کشتِ وجود کے لیے آب روان ہے تو کہ مین؟

وشاعر نالۂ مستانہ در محشر چہ میخواہی؟
تو خود ہنگامۂ، ہنگامۂ دیگر چہ میخواہی؟

بہ بحرِ نغمہ کردی آشنا طبع روانم را
زچاک سینہ ام دریا طلب گہر چہ میخواہی؟

نماز بے حضور از من نمی آید
دلے آوردہ ام دیگر ازین کافر چہ میخواہی؟

(۴) **تشبیہ و استعارہ**، ڈاکٹر صاحب اکثر مضامین کو تشبیہ و استعارہ کے ذریعہ سے ادا کرتے ہین، اس بنا پر ان کے کلام مین تشبیہات و استعارات کی کثرت ہے، اور ان مین تشبیہ و استعارہ کی تمام خوبیان پائی جاتی ہین، تشبیہ و استعارہ کا عام اور معمولی وصف یہ ہے کہ قریب الماخذ ہون، محسوس ہون اور اس کے ساتھ ان مین جدت و تازگی پائی جائے، اور ڈاکٹر صاحب کی تشبیہون مین یہ تمام خوبیان پائی جاتی ہین، انھون نے ایک نظم "جگنو" کے عنوان سے لکھی ہے اور اس مین اس قسم کی تشبیہون کا ڈھیر لگا دیا ہے،

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن مین
یا شمع جل رہی ہے پھولون کی انجمن مین

آیا ہے آسمان سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن مین

یا شب کی سلطنت مین دن کا سفیر آیا
غربت مین آکے چمکا گمنام تھا وطن مین

تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یا نمایان سورج کے پیرہن مین

جگنو کی دم مین جو روشنی ہوتی ہے وہ کبھی چمک اٹھتی ہے اور کبھی بجھ جاتی ہے، اس حالت کو

اس طرح بیان کیا ہے،

چھوٹے سے چاند مین ہی ظلمت بھی روشنی بھی نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن مین

ڈاکٹر یوسف حسین خان نے صرف انھی چند مثالون پر قناعت کی ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب کے کلام مین اس سے بہتر تشبیہات مل سکتی ہین۔

سیر کرتا ہوا جس دم لب جو آتا ہون مین بالیان نہر کو گرداب کی پہناتا ہون مین

چرخ نے بال چرالی ہے عروس شام کی نیل کے پانی مین یا مچھلی ہے سیم خام کی

ماہ نو کی تشبیہ سیم خام کی مچھلی سے کس قدر مکمل ہے، ماہ نو مین چمک کے ساتھ طول بھی پایا جاتا ہے اور یہ دونون وصف سیم خام کی مچھلی مین موجود ہین!

بلند تر ز سپہر است منزل من و تو براہ قافلہ خورشید میل فرسنگ است

شہید ناز او بزم وجود است نیاز اندر نہاد ہست و بود است

نمی بینی کہ از مہر فلک تاب بسیمائے سحر داغ سجود است

زمین از بہاران چو بال تدروے

تو گیتی؟ ز کجائی؟ کہ آسمان کبود ہزار چشم براہ تو از ستارہ کشود

تو آن نہ کہ مصلّے ز کہکشان میکرد شراب صوفی و شاعر تراز خویش ربود

غذائے مرغزارش آسمانے خورد آبے ز جوئے کہکشانے

کہکشان ستارون کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو دور تک پھیلا ہوا ہوتا ہے، اس لیے اس کی تشبیہ مصلی اور نہر سے کس قدر موزون ہے،

حلقہ حلقہ چون پر تیہو غمام

تشبیہ کی دو قسمین ہین، مفرد اور مرکب، مفرد تشبیہ مین چندان جدت نہین ہو سکتی، اولاً تو اسوجہ سے کم

مفرد چیزون کی طرف ہر شخص کا خیال منتقل ہو سکتا ہے، ثانیاً مدت سے شعرا، اور اہل قلم اس قسم کی تشبیہ سے کام لے رہے ہین، البتہ مرکب تشبیہ مین ہر وقت جدت پیدا ہو سکتی ہے، کیونکہ اولاً تو ترکیب کی ہزارون صورتین ہین، دوسرے یہ کہ چند اشیار کی ترکیب سے جو مجموعی ہیئت پیدا ہوتی ہے اس کی طرف ہر شخص کا خیال منتقل نہین ہو سکتا،[1]

اگرچہ ڈاکٹر صاحب کی مفرد تشبیہین بھی اس قسم کی ہین جن کی طرف ہر شخص کا خیال منتقل نہین ہو سکتا، اور شعرا، اور اہل قلم نے ان سے بہت کم کام لیا ہے، لیکن ان کے یہان مرکب تشبیہون کی بھی کمی نہین، اور ترکیب اس قدر لطیف ہے کہ ہر شخص کا خیال اس کی طرف منتقل نہین ہو سکتا، مثلاً

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر

اس مین ہمالیہ کی چوٹی کو سر سے اور برف کو دستارِ فضیلت سے تشبیہ دی ہے، اور چونکہ برف تہ بہ تہ جمتی ہے اس لیے بھی اس کو دستارِ فضیلت کے پیچ و خم سے مشابہت ہے، لیکن چوٹی کی تشبیہ سر سے اور برف کی تشبیہ دستارِ فضیلت سے الگ الگ مقصود نہین بلکہ دونون کے جمع ہونے سے جو مجموعی ہیئت پیدا ہوئی ہے وہی مقصود تشبیہ ہے،

پتیان پھولون کی گرتی ہین خزان مین اس طرح　　دستِ طفلِ خفتہ سے رنگین کھلونے جس طرح

بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پھولون کی پتیون کو رنگین کھلونے سے تشبیہ دی گئی ہے، جو ایک مفرد تشبیہ ہے لیکن درحقیقت ایسا نہین ہے، بلکہ اسی کے ساتھ خزان کے موسم کو دستِ طفلِ خفتہ کے ساتھ بھی تشبیہ دی گئی ہے، کیونکہ جس طرح سوئے ہوئے لڑکے کے ہاتھ مین حرکت نہین ہوتی، اسی طرح خزان کے موسم مین زمین کی قوت نشو و نما مین بھی کوئی حرکت باقی نہین رہتی، اور ان دونون تشبیہون کی ترکیب سے جو مجموعی کیفیت پیدا ہوئی ہے اسی سے تشبیہ دی گئی ہے،

---

[1] موازنۂ انیس و دبیر ص ۶۶،

تو خورشیدی و من سیارۂ تو | سراپا نورم از نظارۂ تو
ز آغوشش تو دورم ناتمامم | تو قرآنی و من سیپارۂ تو

جس طرح سیپارہ قرآن سے الگ ہوکر ناتمام رہتا ہے، اسی طرح ایک انسان خدا سے الگ ہوکر ناتمام رہتا ہے، لیکن خدا کی تشبیہ صرف قرآن سے اور انسان کی تشبیہ صرف سیپارہ سے مقصود نہین بلکہ قرآن سے علیحدگی کے بعد سیپارہ مین جو کمی پیدا ہو جاتی ہے، وہی مجموعی حالت مراد ہے،

پردہ از چہرہ برافگن کہ چو خورشید سحر | بہر دیدار تو لبریز نگہ آمدہ ایم

سورج کو آنکھ سے اور اسکی شعاعون کو نگاہ سے جو مشابہت ہے ان دونون کو ملا کر تشبیہ پیدا کی گئی ہے،

تنے پیدا کن از مشت غبارے | تنے محکم تر از سنگین حصارے
درون او دل درد آشنائے | چو جوئے در کنارے کوہسارے

پہاڑ کے دامن مین جو نہرین بہتی ہین ان کا پانی نرم لیکن پہاڑ بذات خود سخت ہوتا ہے، ان دونون کی ترکیب سے ایک ایسا جسم پیدا کیا گیا ہے جو باہر سے سخت اور اندر سے نرم ہے،

اہل ادب نے لکھا ہے کہ جن تشبیہون مین حرکت پائی جاتی ہے، ان مین خاص لطافت ہوتی ہے، کیونکہ تشبیہ کا مقصد کسی چیز کی حالت کا نمایان کرنا ہوتا ہے، اور حرکت کی حالت مین ایک چیز کی حالت زیادہ نمایان ہوتی ہے، ڈاکٹر صاحب کے کلام مین بھی اس قسم کی متعدد تشبیہین موجود ہین، مثلاً

ہائے کیا فرط طرب مین جھومتا جاتا ہے ابر | فیل بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر
ہے ترا ان نجم سحر جیسے عبادت خانے سے | سب سے پیچھے جائے کوئی عابد شب زندہ دار

کیا سماں ہے جس طرح آہستہ آہستہ کوئی ــــ کھینچتا ہو میان کی ظلمت سے تیغ آبدار

بہ بلند و پست عالم تپش حیات پیدا ــــ چہ دمن، چہ تل، چہ صحرا، رم این غزالہ دیدم

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک زندگی ایک تیز رفتار حرکت کا نام ہے، اس لیے اس کی تشبیہ ہرن کی چوکڑی سے کسقدر موزون ہے، دمن، تل، صحرا کے الفاظ نے اس تشبیہ کو اور زیادہ رنگین کر دیا ہے، کیونکہ ہرن انہی مقامات مین رہتا ہے،

از ان فکر فلک پیما چہ حاصل ــــ کہ گرد ثابت و سیارہ گردد

مثال پارۂ ابرے کہ از باد ــــ بہ پہنائے فضا آوارہ گردد

اس قسم کی تشبیہون کے ذریعہ سے ایک غیر ذی روح چیز مین جان آجاتی ہے، اور وہ چلتی پھرتی نظر آتی ہے، زندگی، فکر فلک پیما سب غیر ذی روح چیزین ہین، لیکن ان تشبیہات نے ان مین جان ڈال دی ہے اور وہ چلتی پھرتی نظر آتی ہین، ڈاکٹر صاحب نے اپنی نظم "بزم انجم" مین اس قسم کی متعدد تشبیہون کو جمع کر کے ایک سمان باندھ دیا ہے،

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو ــــ طشت افق سے لیکر لالے کے پھول مارے

پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور ــــ قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے

گویا سورج اور شام بے تکلف دوست ہین جن مین ایک دوست رخصت ہونے کے وقت دوسرے پر پھول مار رہا ہے اور قدرت ایک عروس رعنا ہے، جس نے چاندی کے تمام زیورات اتار دیے ہین اور شفق نے جو اس کی مشاطہ ہے، اس کو سونے کے زیورات پہنا دیے ہین، اور ان تمام حالتون مین حرکت پائی جاتی ہے،

ڈاکٹر صاحب کی بعض تشبیہات مین تشبیہات عرب کا انداز ہے، مثلاً

تیری بنا پائدار، تیرے ستون بے شمار ــــ شام کے صحرا مین ہو جیسے ہجوم نخیل

مسجد قرطبہ کے بے شمار ستونون کی تشبیہ کھجورون کے جھنڈ سے عربی شان نمایان کرتی ہے،

جس طرح ڈوبتی ہے کشتی سیمین قمر | نور خورشید کے طوفان مین ہنگام سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا لے کر آنچل | چاندنی رات مین مہتاب کا ہم رنگ کنول
جلوۂ طور مین جیسے ید بیضاے کلیم | موجۂ نکہت گلزار مین غنچہ کی شمیم

ہے ترے سیل محبت مین یونہی دل میرا

ممکن ہے کہ اس مین بھی عربی انداز ہو، کیونکہ شعراے عرب کے کلام مین بھی اس قسم کی تشبیہات پائی جاتی ہین، نظامی نے بھی اس قسم کی ایک تشبیہ دی ہے، اور سکندر نے جب ایک حبشی سردار پر حملہ کیا ہے تو حملہ کی تیزی اور زور کو اس طرح ادا کیا ہے،

بہ کبک دری چون؟ درآید عقاب | چگونہ؟ جہد بر زمین آفتاب
ازان تیز تر خسرو پیلتن | بہ تندی درآمد بہ آن اہرمن

پہلے مخاطب کے ذہن مین یہ سمان قائم کر لیا ہے، کہ عقاب، چکور پر کیونکر گرتا ہے، اور دھوپ کس طرح زمین پر دفعۃً چھا جاتی ہے، پھر کہتے ہین کہ اس سے بھی زیادہ تیزی اور زور کے ساتھ سکندر نے اس دیو پر حملہ کیا، ممکن ہے ڈاکٹر صاحب کی یہ تشبیہ بھی اس تشبیہ سے ماخوذ ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ اس تشبیہ مین مغربی شعرار کی تشبیہات کا تتبع کیا گیا ہو، لیکن بہرحال اردو شاعری مین اس قسم کی تشبیہین ایک جدید اضافہ ہین،

یہ تشبیہین بھی

پھرتی ہے وادیون مین کیا دختر خوش خرام ابر

صبح یعنی دختر دوشیزۂ لیل و نہار

غالباً مغربی شعرار کی خوشہ چینی ہین،

ڈاکٹر یوسف حسین خان نے لکھا ہے کہ "اقبال کے وجدان اور جذبات شعری کو جو چیز سب سے زیادہ متحرک کرتی ہے وہ "مظہر قوت" ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ بلبل اور قمری کی تشبیہون کے بجائے باز اور شاہین کو ترجیح دیتا ہے، اس قسم کی تشبیہین اردو شاعری مین بالکل موجود نہین تھین، ڈاکٹر صاحب نے فارسی شاعری سے اخذ کرکے اردو شاعری مین ان کا اضافہ کیا،

اسی قسم کی تشبیہون کو پیش نظر رکھکر مجنون گورکھپوری نے ان پر یہ اعتراض کیا ہے کہ

جس طرح اقبال کے تصور مین حجاز نے اپنا تسلط جمالیا تھا، اسی طرح عقاب، شاہین، شہباز اور چیتے جیسے سفاک جانورون نے بھی ان کی فکر و بصیرت مین ایک مرکزی حیثیت اختیار کرلی تھی، وہ انسان مین بھی بالخصوص "مرد مومن" مین انھین پھاڑ کھانے والے جانورون کی خصلت دیکھنا چاہتے ہین، سنیے کتنی لذت لیکر کہتے ہین،

جو کبوتر پر جھپٹنے مین مزا ہے اے پسر　　　وہ مزا شاید کبوتر کے لہو مین بھی نہین

ذرا ہم آپ تھوڑی دیر کے لیے سوچین کہ اگر یہ غارتگرانہ میلان عام ہوجائے اور زبردستون کو زیر دستون پر یونہی جھپٹنے کا معاشرتی اور قانونی حق دیدیا جائے تو ہماری دنیا کا کیا حال ہوگا؟ اور وہ رہنے کے لیے کیسی جگہ ہوگی؟ اقبال نے یہ بھی نہ سوچا کہ اگر تہذیب انسانی کی آخری تخیل یہی ہوتی تو اس کو ہلاکو اور چنگیز کے دور سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہین تھی، [ا]

لیکن مشبہ اور مشبہ بہ مین کامل مطابقت ضروری نہین ہے، صرف ایک وصف یا چند اوصاف کی مشارکت کافی ہے، ڈاکٹر صاحب نے ان جانورون کے صرف ایک وصف یعنی قوت کو لیا ہے، اور قوت حاصل کرنے کی تعلیم خود اسلام نے دی ہے، چنانچہ صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے

المومن القوی خیر و احب الی اللّٰہ من المومن الضعیف [۲]　　　طاقتور مسلمان، کمزور مسلمان سے خدا کے نزدیک بہتر اور زیادہ محبوب ہے،

ا اقبال صفحہ ۵۸، ۵۹، ۶۰ ۔ ۲ صحیح مسلم مطبوعہ مصر ج ۲ صفحہ ۱۵۰

کبوتر پر جھپٹنے سے اسی قوت کا اظہار ہوتا ہے، البتہ خونخواری ایک قابلِ نفرت چیز ہے، اس لیے کبوتر کے لہو مین ان کو مزا نہین آتا، اس کے علاوہ ان پرندون مین اور بھی بہت سے اوصاف ہین جو اسلامی اخلاق کے مطابق ہین، اور انہی اوصاف کی بناپر انھون نے ان کا انتخاب کیا ہے۔ انھون نے دو شعر "چیونٹی اور عقاب" کے عنوان سے لکھے ہین، جس مین چیونٹی عقاب سے پوچھتی ہے،

مین پائمال و خوار و پریشان و دردمند　　تیرا مقام کیون ہی ستارون سی بھی بلند

عقاب اس کے جواب مین کہتا ہے،

تو رزق اپنا ڈھونڈھتی ہی خاک راہ مین　　مین نہ سپہر کو نہین لاتا نگاہ مین

اس قسم کے اوصاف شاہین مین زیادہ پائے جاتے ہین، اس لیے وہ ان کا محبوب پرند ہے، اور اس کی شان مین انھون نے ایک مستقل نظم لکھی ہے، جس مین ان اوصاف کو نمایان کیا ہے،

کیا مین نے اس خاکدان سی کنارا　　جہان رزق کا نام ہی آب و دانہ

بیابان کی خلوت خوش آتی ہی مجھکو　　ازل سے ہی فطرت مری راہبانہ

نہ باد بہاری نہ گلچین نہ بلبل　　نہ بیماری نغمۂ عاشقانہ

خیابانیون سے ہے پرہیز لازم　　ادائین ہین ان کی بہت دلبرانہ

ہوائے بیابان سی ہوتی ہی کاری　　جوانمرد کی ضربتِ غازیانہ

حمام و کبوتر کا بھوکا نہین مین　　کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا　　لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

یہ پورب یہ پچھم چکورون کی دنیا　　مرا نیلگون آسمان بیکرانہ

پرندون کی دنیا کا درویش ہون مین　　کہ شاہین بناتا نہین آشیانہ

یہ نظم ڈاکٹر صاحب کی شاعری اور فلسفہ کا خلاصہ ہے، اور اس مین انھون نے مجنون گورکھپوری کے اعتراض کا تسکین بخش جواب دیدیا ہے ایک اور شخص نے بھی ڈاکٹر صاحب پر یہ الزام لگایا تھا کہ

اس دور ترقی مین بھی ہین جنگ کے حامی — سچ پوچھو تو یہ ان کے تخیل کی ہے خامی

اس کا جواب ان کے ایک معتقد نے یہ دیا کہ

اشعار مین آتی ہے جو شاہین کی حکایت — ہے از رہ تمثیل نہ از راہ حقیقت

مطلب یہ ہے سرگرم عمل تیری خودی ہو — لیکن یہ ضروری نہین مسلک بھی وہی ہو

یہ اعتراض اور جواب ایک مستقل نظم کی صورت مین لکھکر انھون نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت مین بھیج دیا، اور ڈاکٹر صاحب نے اس کا نہایت مفصل جواب دیا، لیکن اس خط کا جو ٹکڑا شاہین کی تشبیہ سے تعلق رکھتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تشبیہ کا جنگ و خونریزی سے کوئی تعلق نہین بلکہ اسلامی فقر سے ہے، چنانچہ اس خط مین لکھتے ہین:

شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہین ہے، اس جانور مین اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہین، (۱) خود دار اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہین کھاتا، (۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہین بناتا، (۳) بلند پرواز ہے، (۴) خلوت پسند ہے، (۵) تیز نگاہ ہے۔[۱]

شاہین کی انھی خصوصیات کو پیش نظر رکھکر انھون نے نہایت لطیف اور بلند ایمانی مضامین پیدا کیے ہین،

تنش از سایۂ بال تدروے لرزہ می گیرد — چو شاہین زادۂ اندر قفس با دانہ می سازد

شاہین بچہ سے مسلمان، قفس سے غلامی، اور دانہ سے روزی اور ملازمت مراد ہے جس سے

---

[۱] علی گڈھ میگزین اقبال نمبر ص ۱۰۴

بزدلی پیدا ہوتی ہے۔

درون سینۂ ہنوز آرزوے تو خام است | گرفتم اینکہ چو شاہین بلند پروازی
توان گرفت ز چشم ستارہ مردم را | خرد بدستِ تو شاہین تند و چالاک است
جرہ شاہینی بمرغانِ سرا صحبت مگیر | خیزد بال و پر کشا پرواز تو کوتاہ نیست
تو اے شاہین نشیمن در چمن کردی ازان ترسم | ہواے او بہ بالِ تو دہد پرواز کوتاہے

یعنی عیش پرستی سے قوت عمل کم ہو جاتی ہے،

(۵) **تلمیحات**، تلمیح یعنی کسی قصہ طلب واقعہ سے مضمون پیدا کرنا ایک صنعت ہے جسکے ذریعہ سے ایک بڑے سے بڑا مضمون نہایت مختصر لفظون مین ادا ہو جاتا ہے، ڈاکٹر صاحب کے کلام مین بھی بکثرت تلمیحات ہین، جو ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ مقاصد سے نہایت گہرا تعلق رکھتی ہین، یعنی ان سے عزم و استقلال، اطاعت، ایثار، قربانی، شہادت، جانبازی، انقلاب انگیزی اور جفاکشی کی تعلیم ہوتی ہے، جو ڈاکٹر صاحب کے فلسفہ اور شاعری کا اصلی مقصود ہین،

اس سلسلے مین انھون نے جن واقعات کی طرف اشارے کیے ہین، ان مین سب سے اہم واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے، جن کو نمرود نے آگ مین ڈال دیا تھا، اور انھون نے نہایت جرأت و استقلال کے ساتھ اس آزمائش کا خیر مقدم کیا تھا، ڈاکٹر صاحب نے متعدد اشعار مین اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے،

بے خطر کود پڑا آتش نمرود مین عشق | عقل ہے محو تماشاے لب بام ابھی
شبے بہ میکدہ خوش گفت پیر زندہ دلے | بہ ہر زمانہ خلیل است و آتشِ نمرود

خودی کی تکمیل کے لیے اس قسم کی آزمائشین ضروری ہین،

شعلہ ہاے او صد ابراہیم سوخت | تا چراغِ یک محمد برفروخت

بت شکنی بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیغمبرانہ زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے، اور اس زمانے کے بتون کے توڑنے کے لیے بھی ایک ابراہیم کی ضرورت ہے،

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش مین ہے　　　صنم کدہ ہے جہان لا الہ الا اللہ

ان کے فرزند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے واقعہ سے بھی صبر، ایثار، اور اطاعت کی ایک بلند مثال قائم ہوتی ہے، جنھون نے قربانی کے لیے نہایت خوشی کے ساتھ باپ کے سامنے گردن جھکا دی تھی، ڈاکٹر صاحب اس کی طرف ان اشعار مین اشارہ کرتے ہین،

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم　　　نہایت اسکی حسینؓ ابتدا ہے اسماعیلؑ

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی　　　سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

ان کے بعد ڈاکٹر صاحب کو اپنے فلسفیانہ اور شاعرانہ مقاصد کے لیے بکثرت مواد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت مین ملتا ہے، جنکی نبوت کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے، کہ انھون نے حضرت شعیبؑ کی دو لڑکیون کی بکریون کو جو مردون کی بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے ان کو پانی نہین پلاسکتی تھین، پانی پلادیا، لڑکیون پر اس احسان کا اثر ہوا، اور انھون نے اپنے باپ کو اس کی اطلاع دی، باپ نے ان کو پانی پلانے کی اجرت دینے کے لیے طلب کیا، اور لڑکیون نے ان کے جسمانی اور اخلاقی فضائل کی بنا پر باپ سے درخواست کی کہ ان کو ملازم رکھ لیجیے، باپ نے اس سے بھی بڑھ کر ان سے ایک لڑکی کا نکاح اس شرط پر کر دیا کہ وہ آٹھ یا دس سال تک ان کی بکریان چرایا کرین، وہ یہ مدت پوری کر کے اپنی بی بی کو ساتھ لے کر ان سے رخصت ہوئے، تو طور کی جانب آگ دیکھی اور تاپنے کے لیے آگ لینے کو بڑھے، آگ کے قریب پہنچے تو میدان کے ایک درخت سے آواز آئی، کہ مین خدائے پروردگار عالم ہون تم اپنا عصا زمین پر پھینک دو، انھون نے اس کو پھینکا تو وہ سانپ بن گیا، اپنے گریبان مین ہاتھ ڈالو تو وہ سفید روشن نکل آئے گا، اور وہ ان دونون نشانیون

کو لے کر فرعون کے پاس آئے اور اس کو دعوت توحید دی، اس قصے مین ڈاکٹر صاحب کے کام کی باتین حسب ذیل ہین:۔

(۱) صحرا کی بدویانہ زندگی خودی کی تکمیل وتربیت کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی ہے، اس لیے انھون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے اس واقعہ کو نہایت اہمیت دی ہے،

نظر آئی نہ مجھے قافلہ سالارون مین | وہ شبانی کہ ہے تمہید کلیم اللّٰہی
دم عارف نسیم صبح دم ہے | اسی سے ریشۂ معنی مین نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسر | شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

(۲) انقلاب کے لیے تشدد ضروری ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا ہی کی معجزانہ طاقت سے فرعون اور اس کے جادوگرون پر غلبہ حاصل کیا تھا، اس لیے وہ مہاتما گاندھی کے برت کا اس طرح مضحکہ اڑاتے ہین،

رشی کے فاقون سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم | عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد
تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحر قدیم | گذر اس عہد مین ممکن نہین بے چوب کلیم

خاموش اور ساکن انقلاب پیغمبرون مثلاً حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت ایوب، حضرت یعقوب اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی پرسکون زندگی کی ان کی ہنگامہ خیز شاعری مین گنجایش نہین، بلکہ انھون نے تو شاعرانہ جوش مین یہان تک کہہ دیا ہے،

وہ نبوت ہے مسلمان کیلیے برگ حشیش | جس نبوت مین نہین قوت و شوکت کا پیام

البتہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات زندگی مین ان کو اپنے کام کی باتین ملتی ہین،

اگر یک یوسف از زندان فرعونے برون آید | بغارت می توان دادن متاعِ کاروانے را

خون زلیخا کی گرمی بھی انکی گرم شاعری سے مناسبت رکھتی ہے،

دگر از یوسفِ گم گشتہ سخن نتوان گفت　　　　تپش خون زلیخا نہ تو داری و نہ من

حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس کی وجہ سے ان کو شاہانہ جاہ و اقتدار حاصل تھا، اس کو شیطان نے بلطائف الحیل اڑا لیا، اور وہ مفلس و قلاش ہو گئے ڈاکٹر صاحب نے اس شعر میں اسی اسرائیلی روایت کی طرف اشارہ کیا ہے :-

آن نگینے کہ تو با اہرمنان باختۂ　　　　ہم بجبرئیل امینے نتوان کرد گرد

اور اس سے یہ مضمون پیدا کیا ہے کہ تم نے اپنی ضمیر و ایمان اور قلب و دماغ کو جو اس دور کے شیطانوں کے ہاتھ بیچ دیا ہے، وہ اس قدر قیمتی ہے کہ جبرئیل کے ہاتھ بھی گرو نہیں کیا جا سکتا،

اس میں تو اختلاف ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام پیغمبر تھے یا نہیں ؟ لیکن بہرحال وہ خدا کے خاص الخاص بندے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام جب ان کی معیت میں حصول علم کیلیے چلے تو تین عجیب و غریب واقعے پیش آئے، جب دونوں کشتی میں سوار ہوئے، تو حضرت خضر علیہ السلام نے اس میں سوراخ کر دیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر اعتراض کیا، تو اس کا یہ جواب دیا، کہ کشتی ایک غریب آدمی کی تھی، اور ایک بادشاہ کشتیوں کو زبردستی پکڑ لیتا تھا، اس لیے میں نے اس کو عیب دار کر دیا تاکہ وہ محفوظ رہے،

آگے بڑھے تو انھوں نے ایک لڑکے کو بلا وجہ قتل کر دیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر بھی اعتراض کیا، تو جواب دیا کہ اس کے ماں باپ مسلمان تھے اور مجھکو خوف پیدا ہوا کہ وہ کہیں سرکشی اور کفر نہ اختیار کر لے،

ایک گاؤں میں آئے تو ایک دیوار کو دیکھا کہ گرنا چاہتی ہے، اس کو کھڑا کر دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر آپ چاہتے تو اس کی اجرت لے سکتے تھے، انھوں نے کہا کہ یہ دیوار دو یتیم بچوں کی تھی، اور اس کے نیچے ان کا خزانہ گڑا ہوا تھا اس لیے خدا نے چاہا کہ وہ خزانہ

محفوظ ہو جائے، اور وہ جوان ہو کر اس کو نکال لین،

اتنے لمبے قصے کو ڈاکٹر صاحب نے خضر راہ مین، صرف ایک شعر مین ادا کر دیا ہے،

کشتی مسکین" و "جان پاک" و "دیوار یتیم" علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

صحابۂ کرام مین حضرت حسین علیہ السلام کی شہادت کا واقعہ ڈاکٹر صاحب کی شاعری کے ساتھ

خاص مناسبت رکھتا ہے، اس لیے انھون نے بار بار اس کی طرف اشارہ کیا ہے،

ریگ عراق منتظر کشت حجاز تشنہ کام خون حسین باز دہ کوفہ و شام خویش را

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست با من بیا کہ مسلک شبیرم آرزوست

صحابۂ کرام مین حضرت ابو ذر رض کا فقیرانہ مسلک جو روپیہ پیسہ کا جمع کرنا ناجائز سمجھتے تھے، اور حضرت

سلمان رض کی آزادانہ شان جو ملک و قوم کے انتساب کے بجائے اپنے آپ کو اسلام کا بیٹا کہتے تھے،

حضرت علی رض کا زور بازو جنھون نے خیبر کا علم فتح اپنے ہاتھ مین لیا تھا، ڈاکٹر صاحب کے فلسفہ و شاعری

سے بہت مطابقت رکھتے ہین، اس لیے انھون نے اکثر اشعار مین ان کا نام لیا ہے،

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جسنے وہ کیا تھا؟ زور حیدر، فقر بو ذر، صدق سلمانی

عیسائی درویشون کی بعض خصوصیات کی طرف بھی انھون نے اشارہ کیا ہے، عرب کے میدانون

مین عیسائی راہب ایک بلند مینارے پر چراغ جلاتے تھے، کہ بھولے بھٹکے مسافر اس کی روشنی

مین راستہ پا جائین، اس شعر مین اسی کی طرف اشارہ ہے،

گمان آباد ہستی مین یقین مرد مسلمان کا بیابان کی شب تاریک مین قندیل رہبانی

ان کے کلام مین قومون کی خصوصیات کی طرف بھی تلمیحی اشارے ہین،

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

عام و متداول شاعرانہ تلمیحات بھی جو عاشقانہ غزلون مین زیادہ تر مستعمل تھین، ان کے کلام

مین موجود ہین، لیکن ان کو انھون نے اپنے خاص قالب مین ڈھال لیا ہے،

طریق کوہکن مین بھی وہی حیلے ہین پرویزی | زمام کار اگر مزدور کے ہاتھون مین ہو پھر کیا
عشق بدوش می کشد این ہمہ کوہسار را | تیشہ اگر بسنگ زد این چہ مقام گفتگو است
آن تیشۂ فرہادے، این حیلۂ پرویزے | در عشق و ہوسناکی دانی کہ تفاوت چیست
گرمیٔ بتخانہ بے ہنگامۂ محمود نے | کافری را پختہ تر ساز د شکست سومنات

لیکن فرہاد کے ساتھ انھون نے کہین شیرین کا نام نہین لیا ہے، کہ وہ ان کے مقاصد شاعرانہ کے لیے موزون نہ تھی، البتہ وہ لیلی اور سلیمی کا ذکر بڑے ذوق وشوق سے کرتے ہین کہ اس سے ان کے عربی رجحان کا پتہ چلتا ہے، اور بدویانہ زندگی کی پسندیدگی کا اظہار ہوتا ہے،

جگر گرمیٔ صحرا نہ تو داری و نہ من | ہوس منزل لیلی نہ تو داری و نہ من
آتش شوق سلیمی نہ تو داری و نہ من | دل و دین در گرو زہرہ وشان عجمی

ڈاکٹر صاحب کے کلام مین اور بھی بہت سی تلمیحات ہین اور ان کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہین کہ ان کا کلام اسلام کے اہم مذہبی، سیاسی، علمی اور تمدنی تاریخ کا خلاصہ ہے، لیکن بخوف طوالت ہم ان کو قلم انداز کرتے ہین،

(۶) **تضمینات**، کسی شاعر کے کسی شعر یا مصرع یا قرآن کی کسی آیت اور حدیث کے کسی ٹکڑے کو اپنے کلام مین شامل کر لینے کا نام تضمین ہے، اور اس کے لیے ایک تو حسن انتخاب کی ضرورت ہے کہ جو شعر یا مصرع لیا جائے وہ نہایت برجستہ، نادر اور پسندیدہ ہو، دوسرے یہ کہ اس کو اپنے اشعار کے ساتھ اسقدر مربوط کر لیا جائے کہ وہ اپنے کلام کا ایک جزو ہو جائے، ڈاکٹر صاحب کے کلام مین بکثرت تضمینین موجود ہین، اور ان مین یہ دونون خوبیان پائی جاتی ہین، مثلاً

وہ یہ مضمون بیان کرتے ہین کہ مسلمان مذہب اور عربی تہذیب کو چھوڑکر مغربی تہذیب مین جذب ہو رہے ہین

تجھے معلوم ہے غافل کہ تیری زندگی کیا ہے ‌ ‌ ‌ کنشتی ساز و معمور نواہاے کلیسائی
ہوئی ہے تربیت آغوش بیت اللہ مین تیری ‌ ‌ ‌ دل شوریدہ ہے لیکن صنم خانے کا سودائی
"وفا آموختی از ما بکار دیگران کردی ‌ ‌ ‌ ربودی گوہرے از ما نثار دیگران کردی"

اخیر شعر انیسی شاملو کا ہے، جو اوپر کے اشعار سے کس قدر مربوط وچسپان ہے، دوسری جگہ لکھتی ہین کہ اس روش کو چھوڑکر پھر وہی قدیم آبائی اور مذہبی روش اختیار کرنی چاہیے،

غافل اپنے آشیان کو آکے پھر آباد کر ‌ ‌ ‌ نغمہ زن ہے طور معنی پر کلیم نکتہ بین
"سرکشی با ہر کہ کردی رام او باید شدن ‌ ‌ ‌ شعلہ سان از ہر کجا برخاستی آنجا نشین"

اخیر شعر ابوطالب کلیم کا ہے،
ان کو شکایت ہے کہ ہندوستان مین ان کے اشعار اثر نہین کرتے لیکن بااینہمہ وہ شعرگوئی سے باز نہین آتے اس لیے اپنے آپ کو مخاطب کرکے کہتے ہین،

نہین ضبط نوا ممکن تو اڑ جا اس گلستان سے ‌ ‌ ‌ کہ اس محفل سے خوشتر ہے کسی صحرا کی تنہائی
"ہمان بہتر کہ لیلی در بیابان جلوہ گر باشد ‌ ‌ ‌ ندارد تنگنائے شہر تاب حسن صحرائی"

اخیر شعر مرزا صائب کا ہے جو اس مضمون پر کس قدر چسپان ہے، مسلمانون کی قدیم کتابین یورپ کے کتب خانون کا چشم وچراغ بنی ہوئی ہین، اس پر ان کا دل جلتا ہے اور کہتے ہین،

مگر وہ علم کے موتی کتابین اپنے آبا کی ‌ ‌ ‌ جو دیکھین انکو یورپ مین تو دل ہوتا ہے سیپارا
غنی روز سیاہ پیر کنعان را تماشا کن ‌ ‌ ‌ کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

انھون نے عرفی کی قبر سے شکایت کی کہ اس زمانے مین لوگ غافل ہین اور شاعر کی بات

نہین سنتے تو

صدا تربت سے آئی شکوۂ اہلِ جہان کم گو

"نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کمیابی | حدی را تیز تر میخوان چو محمل را گران بینی"

یہ شعر عرفی کا ہے،

بہ آن قوم از تو می خواہم کشادے | فقیہش بے یقینے کم سوادے
بسے نادیدنی را دیدہ ام من | "مرا اے کاشکے مادر نہ زادے"

اخیر مصرع شیخ سعدی کا ہے۔

"الا یا خیمگی خیمہ فرو ہل | کہ پیش آہنگ بیرون شد زمنزل"
خرد از راندنِ محمل فرو ماند | زمامِ خویش دادم در کفِ دل

پہلا شعر منوچہری کا ہے،

بروئے عقل و دل بکشائے ہر در | بگیر از پیر ہر میخانہ ساغر
"نوران کوش از نیازِ سینہ پرور | کہ دامن پاک داری آستین تر"

اخیر شعر امیر خسرو کا ہے۔

بعض جگہ کسی شعر کے مضمون سے پیدا کیا ہے، لیکن اس کے الفاظ باقی رکھے ہین

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش | اے گرفتار ابوبکر و علی ہشیار باش

یہ مولانا روم کے اس شعر سے ماخوذ ہے،

سر حق کے بہ تو گردد منجلی | اے گرفتار ابوبکر و علی

چہ عجب اگر دو سلطان بہ ولایتے نگنجند | عجب اینکہ می نگنجد بدو عالمے فقیرے

یہ شعر سعدی کے اس مشہور فقرہ سے ماخوذ ہے،" دو پادشاہ در اقلیمے نگنجند"

بعض جگہ عربی اشعار کی بھی تضمین کی ہے،

صبنتِ الکاس عنا ام عمرو | وکان الکاس مجراھا الیمینا

اگر این است رسم دوستداری | بدیوار حرم زن جام و مینا

عربی شعر عمرو بن کلثوم کے مشہور قصیدہ کا ہے۔ ایک آدھ جگہ عربی ضرب المثل کا ترجمہ کر لیا ہے،

شتر را بچۂ او گفت در دشت | نمی بینم خدا اے چار سو را

پدر گفت اے پسر چون پا بہ لغزد | شتر ہم خویش را بیند ہم او را

اس مین عربی کی اس ضرب المثل کی طرف اشارہ ہے،

"الجمل لا یعرف الحق الا عند لزلق"

جا بجا قرآن مجید کی آیتون کے ٹکڑے لے لیے ہین،

آہ اے مرد مسلمان تجھے کیا یاد نہین | حرف لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا آخَر

اے مسلمان ہر گھڑی پیش نظر | آیۂ لَا تخلف المیعاد رکھ

یہ لسان العصر کا پیغام ہے | ان وعد اللّٰہ حق یاد رکھ

آ بتاؤن تجھکو رمز آیۂ ان الملوک | سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری

یعنی "ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا"

بعض جگہ کسی آیت کا ترجمہ کر لیا ہے،

میانِ امتان والا مقام است | کہ آن امت دو گیتی را امام است

نیا ساید ز کار آفرینش | کہ خواب و خستگی بروے حرام است

اس مین اس آیت کی طرف اشارہ ہے لا تاخذہٗ سنۃ ولا نوم...... وما مسنا من لغوب

کہین کہین حدیثون کے ٹکڑے لے لیے ہین،

بچشم من نگہ آدردہ ئست　　فروغِ لالہ آوردہ ئست
دو چارم کن بہ صبح من رانی　　شبم را تاب مہ آوردہ ئست

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے، اور اس حدیث کی طرف اشارہ ہے
من رانی فقد رای اللہ" یعنی جس نے مجھے دیکھا خدا کو دیکھا،

صاحب مثل السائر لکھتے ہیں کہ" وہ تضمین جس سے کلام میں حسن پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ آیتوں اور حدیثوں کی تضمین کبھی اس طرح کی جائے کہ پوری آیتیں اور حدیثیں لے لی جائیں اور کبھی ان کے ٹکڑے لے لیے جائیں[1]"، اور ڈاکٹر صاحب نے یہی دوسرا طریقہ اختیار کیا ہے،

(۷) روانی و برجستگی۔ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں سخت روانی پائی جاتی تھی جسکی وجہ یہ تھی کہ وہ بغیر کسی جذباتی تحریک کے شعر نہیں کہتے تھے، اسی لیے وہ فرمائشی اشعار کہنے پر قادر نہ تھے، لیکن جب وہ از خود شعر کہنے کی طرف مائل ہوتے تو غضب کی آمد ہوتی، اور ایک ایک نشست میں بیشمار شعر کہہ ڈالتے۔ ان کے دوست اور بعض طالب العلم جو پاس ہوتے پنسل کاغذ لے کر لکھتے جاتے اور اپنی دھن میں کہتے جاتے۔ خود انکے ہاتھ میں کاغذ اور قلم نہیں ہوتا تھا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ موزون الفاظ کا ایک دریا بہتا یا ایک چشمہ ابلتا ہوا چلا آرہا ہے[2]" سید نذیر نیازی نے لکھا ہے کہ" انکا مشغلۂ سخن ہمیشہ جاری رہتا تھا وہ اگر چاہتے بھی تو اسے بند نہیں کر سکتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے خود مجھ سے ارشاد فرمایا کہ" آمد شعر کی مثال تحریک جنسی کی ہے، ہم اسے چاہیں بھی تو نہیں روک سکتے"۔ کہنے لگے" میں بلا ارادہ بھی شعر کہہ سکتا ہوں"، اور بعض دفعہ ایک ہی شب میں اشعار کی تعداد تین تین سو تک پہنچ گئی، ایک دفعہ سو کر اٹھے تو یہ شعر زبان پر تھا،

دوزخ کے کسی طاق میں افسردہ پڑی ہے　　خاکسترِ اسکندر و چنگیز و ہلاکو

---

[1] مثل السائر صفحہ ۴۲۹، [2] مقدمۂ بانگ درا از شیخ عبد القادر

اور فرمایا "اس کا کچھ مطلب سمجھ مین نہین آتا" بہر کیف ان واقعات سے ان کی رواتی طبیعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے[1]"

اس بنا پر ان کے کلام کا ایک عام وصف رواتی و برجستگی ہے، اگرچہ اس کے لیے کسی خاص مثال کی ضرورت نہین، بلکہ ان کا کلام عموماً برجستہ و روان ہوتا ہے، تاہم جریاً للعادۃ ہم چند مثالین درج کرتے ہین،

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہین ہے
پھر اس مین عجب کیا کہ تو بیباک نہین ہے

ہے ذوق تجلی بھی اسی خاک مین پنہان
غافل! تو نرا صاحب ادراک نہین ہے

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پرکار و سخن ساز ہے نمناک نہین ہے

کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنون کی
ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہین ہے

کبتک رہے محکومیٔ انجم مین مری خاک
یا مین نہین یا گردشِ افلاک نہین ہے

بجلی ہون نظر کوہ و بیابان پہ ہے میری
میرے لیے شایان خس و خاشاک نہین ہے

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہین جو صاحب لولاک نہین ہے

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار مین کردار مین اللہ کی بربان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہون تو بنتا ہے مسلمان

ہمسایۂ جبرئیل امین بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان

یہ راز کسی کو نہین معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت مین ہے قرآن

قدرت کے مقاصد کا عیار اسکے ارادے
دنیا مین بھی میزان قیامت مین بھی میزان

جس سے جگر لالہ مین ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤن کے دل جس سے دہل جائین وہ طوفان

---

[1] اقبال کا مطالعہ ص ۱۳۹

فطرت کا سرود ازل اسکے شب و روز — آہنگ مین یکتا صفت سورۂ رحمن

بنتے ہین مری کارگہ فکر مین انجم — لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

ذرہ ذرہ شوق ہے منزل نہ کر قبول — لیلی بھی ہم نشین ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب بڑھکے ہو دریائے تند و تیز — ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات مین — محفل گداز گرمی محفل نہ کر قبول

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے — جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے — شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

مولانا شبلی موازنہ انیس و دبیر مین لکھتے ہین کہ "نظم کا درحقیقت سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ اس کو نثر کرنا چاہین تو نہ ہو سکے، اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب شعر مین الفاظ کی وہی ترتیب باقی رہے جو نثر مین معمولاً ہوا کرتی ہے، جس قدر اس کا لحاظ رکھا جائے گا اسی قدر شعر زیادہ صاف، برجستہ رواں اور ڈھلا ہوا ہوگا"[ا] لیکن اس کا لحاظ رکھنا بجائے خود ایک قسم کی آورد ہے، بلکہ ہمارے نزدیک کلام مین یہ وصف اس وقت سب سے زیادہ پیدا ہوتا ہے جب شاعر ایک نیم شعوری کیفیت طاری ہو، اور وہ بلا قصد و ارادہ شعر موزون کرتا چلا جائے، ڈاکٹر صاحب پر یہ کیفیت اکثر طاری رہتی تھی، اور وہ اسی مدہوشی کے عالم مین شعر کہتے تھے، شیخ عبد القادر نے مقدمۂ بانگ درا مین لکھا ہے کہ "ایک خاص کیفیت رقت کی عموماً ان پر طاری ہوجاتی تھی، اپنے اشعار سریلی آواز مین ترنم سے پڑھتے تھے، خود وجد کرتے دوسرون کو وجد مین لاتے تھے"، اسی کیفیت کا نام مدہوشی ہے اور اسی عالم مین ڈاکٹر صاحب کے نغمہ ہائے داؤدی موزون ہوئے ہین،

الفاظ کی طرح ان کے معانی مین بھی یہی بیساختگی اور برجستگی قائم رہتی ہے، ان کا عام طریقہ

ا؎ موازنہ انیس و دبیر ص ۲۸

یہ ہے کہ بغیر کسی تمہید و مقدمہ کے اصلی مطلب شروع کر دیتے ہیں، یہاں تک کہ اگر ان کی نظموں کو ان نظموں کے عنوان سے الگ کر لیا جائے تو یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ فاعل کون ہے اور مفعول کون؟ انھوں نے ایک نظم شاہین پر لکھی ہے جسکا پہلا شعر یہ ہے،

کیا میں نے اس خاکدان سے کنارا جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ

اس کا عنوان "شاہین" ہے، لیکن اگر اس عنوان کو حذف کر دیا جائے تو یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ کس نے اس خاکدان سے کنارا کیا ہے۔ ان کی ایک نظم کا عنوان ہے "فرمان خدا فرشتوں سے"، اور یہ نظم اس شعر سے شروع ہوتی ہے،

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

لیکن اگر اس نظم کو اس عنوان سے الگ کر لیا جائے تو یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ یہ حکم کون دے رہا ہے اور کس کو دے رہا ہے؟

اب ہم ان لفظی خصوصیتوں کو چھوڑ کر ڈاکٹر صاحب کے کلام کی معنوی خوبیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں،

(۸) مدح و ذم، اقبال کی شاعری قصیدہ اور ہجو دونوں سے پاک ہے، اقبال نے کبھی صاحبانِ زر و اربابِ اثر کی مدح سرائی نہیں کی، نہ کبھی ہجو گوئی سے اپنے کلکِ اعجاز رقم کے وقار کو گھٹایا؛[1] اگر کوئی شخص درحقیقت مدح و ستایش کا مستحق ہے تو اسکی مدح گوئی کوئی عیب نہیں ہے لیکن ہمارے ایشیائی شعراء نے مستحق اور غیر مستحق کی تمیز اٹھا دی اور حصول زر کے لیے اپنے ممدوحین کے ایسے مبالغہ آمیز اور غیر حقیقی اوصاف بیان کیے کہ مدحیہ شاعری ایشیائی شاعری کے دامن کا ایک بدنما داغ بن گئی، ڈاکٹر صاحب نے اولاً تو سرے سے مدحیہ قصائد لکھے ہی نہیں، اسرار خودی اور پیام مشرق

[1] سب رس اقبال نمبر ص ۴۴

کو بے شبہہ سرعلی امام اور امیر امان اللہ خان کی خدمت مین بطور نذر عقیدت کے پیش کیا اور اس سلسلے مین ان کی مدح مین بھی چند اشعار لکھے، لیکن ان مین کہین واقعیت سے تجاوز نہین کیا، وہ سر علی امام کو اس طرح مخاطب کرتے ہین،

اے امام اے سید والا نسب	دودمانت فخر اشراف عرب
سلطنت را دیدہ افروز آمدی	عقل کل را حکمت آموز آمدی
آشنائے معنیٔ بیگانہ	جلوہٗ شمع مرا پروانہٗ
این گل از تار رگ جان بستہ ام	تازہ تر در دست تو گلدستہ ام
ملت از جسم است شاعر چشم او	جسم را از چشم بینا آبروست
چشمم از نور محبت روشنم	اشکبار از درد اعضائے تنم
نذر اشک بیقرار از من پذیر	گریۂ بے اختیار از من پذیر

امیر امان اللہ خان کو اس طرح خطاب کرتے ہین۔

اے امیر کامگار اے شہریار	نوجوان و مثل پیران پختہ کار
چشم تو از پردگیہا محرم است	دل میان سینہ ات جام جم است
عزم تو پاینده چون کہسار تو	عزم تو آسان کند دشوار تو
ہمت تو چون خیال من بلند	ملت صد پارہ را شیرازہ بند
ہدیہ از شاہنشہان داری بسے	لعل و یاقوت گران داری بسے
اے امیر ابن امیر ابن امیر	ہدیۂ از بینوائے ہم پذیر

مدحیہ قصائد مین ممدوح کے ساتھ بعض موقعون پر خود اپنی مدح بھی کرنی پڑتی ہے، ڈاکٹر صاحب نے بھی اس نظم مین امیر امان اللہ خان سے زیادہ اپنی ہی مدح کی ہے، لیکن

طرز اور لہجہ ایسا اختیار کیا ہے کہ خود ستائی کے بجائے ان کی حالت زیادہ قابل رحم معلوم ہوتی ہے، پہلے تو چند اشعار مین یہ ظاہر کیا ہے کہ پیام مشرق جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے سلام مغرب کا جواب ہے، پھر اپنا اور اس کا مقابلہ کیا ہے، اور اسی سلسلے مین اپنی مدح بھی کرتے گئے ہین،

او چمن زادے چمن پروردۂ — من دمیدم از زمین مردۂ

او چو بلبل در چمن فردوس گوش — من بصحرا چون جرس گرم خروش

ہر دو دانائے ضمیر کائنات — ہر دو پیغام حیات اندر ممات

ہر دو خنجر صبح خند، آئینہ فام — او برہنہ من ہنوز اندر نیام

ہر دو گوہر ارجمند و تاب دار — زادۂ دریائے ناپیدا کنار

او ز شوخی در تہ قلزم تپید — تا گریبان صدف را بر درید

من بآغوش صدف تابم ہنوز — در ضمیر بحر نایابم ہنوز

شیخ سعدی مدح کے ساتھ ممدوح کو نصیحتین بھی کرتے جاتے ہین، اور ڈاکٹر صاحب نے بھی یہی طرز اختیار کیا ہے، وہ امیر امان اللہ خان کو مخاطب کر کے کہتے ہین،

اے ترا فطرت ضمیر پاک داد — از غم دین سینۂ صد چاک داد

تازہ کن آئین صدیق و عمر — چون صبا بر لالۂ صحرا گذر

ملت آوارۂ کوہ و دمن — در رگ او خون شیران موج زن

زیرک و رو ئین تن و روشن جبین — چشم او چون جرہ بازان تیز بین

قسمت خود از جہان نا یافتہ — کوکب تقدیر او نا تافتہ

در قہستان خلوتے ورزیدۂ — رستخیز زندگی نا دیدۂ

جان تو بر محنت پیہم صبور — کوش در تہذیب افغان غیور

تا ز صد بقا ان این است شوی | بهر وین سرمایۂ قوت شوی
سروری در دین ما خدمت گری است | عدل فاروقی و فقر حیدری است
در ہجوم کارہاے ملک و دین | با دل خود یک نفس خلوت گزین
در قباے خسروی درویش زی | دیدۂ بیدار و خدا اندیش زی
سوز صدیق و علی از حق طلب | ذرۂ عشق نبی از حق طلب
خیز و اندر گردش آور جام عشق | در قہستان تازہ کن پیغام عشق

اپنی مثنوی مسافر مین انھون نے شاہ نادر اور شاہ ظاہر کی جو مدح کی ہے اس کا بھی یہی انداز ہے،

مدح کی تو ایک خاص حد ہے جس مین وہ بعض حالات مین جائز اور بعض حالات مین واجب ہے، البتہ ہجو کسی حالت مین بھی جائز نہین لیکن بدقسمتی سے وہ ایشیائی شاعری کی ایک مستقل صنف قرار پا گئی ہے، اور اہل تنقید نے اس کے اصول و قواعد مقرر کیے ہین، ڈاکٹر صاحب ایک زبان آور شاعر تھے، اور ان کی شاعری نے ان کے لیے ہجو کا ایک وسیع میدان تیار کر دیا تھا، صوفی و ملا کے ساتھ ان کی جنگ محض شاعرانہ نہین تھی، بلکہ واقعی تھی، وہ خود کہتے ہین،

حریف اپنا سمجھ رہے ہین مجھے خدایان خانقاہی | انھین یہ ڈر ہے کہ میرے نالون سے شق نہ ہو سنگ آستانہ

لیکن با اینہمہ انھون نے ان کی ہجو سے اپنی زبان کو آلودہ نہین کیا، البتہ ہجو کی ایک لطیف قسم یعنی طنز و ظرافت جو موجودہ دور مین ادب و انشا کی ایک مستقل صنف قرار دی گئی ہے، ڈاکٹر صاحب کے کلام مین موجود ہے،

چنانچہ انھون نے اسی لطیف انداز مین یورپ کی ہجو کی ہے اور ایک حکایت لکھی ہے کہ

ایران مین ایک برگزیدہ شخص نے نزع کے وقت جانکنی کی سخت تکلیف اٹھائی، مرگیا تو خدا سے فریاد کی کہ موت باوجودیکہ یک فنی ہے اور جان لینے کے سوا اس کا کوئی دوسرا کام نہین، باینہمہ اس فن مین اس کو کمال حاصل نہین ہوا، دنیا نئی ہوگئی اور اس کا طریقہ وہی پرانا ہے، اس کو یورپ بھجدیجیے، کہ فوری طور پر جان لینے کی تعلیم حاصل کرے، یورپ نے عجیب عجیب فن ایجاد کیے ہین، اور اس کی سائنس موت ہی کی خادم ہے، سمندر مین اس کی آبدوزین گھڑیال کی طرح چلتی ہین، اس کے ہوائی جہاز ہوا پر بمباری کرتے ہین، اس کی گیس سے دن ہی کو سورج کی آنکھ اندھی ہوجاتی ہے، وہ بالکل نئے طریقے سے بدن سے جان نکال لیتا ہے کہ جان تو نکل جاتی ہے لیکن بدن اپنے آپ کو زندہ سمجھتا ہے، اس لیے اگر موت یورپ مین تعلیم حاصل کرے تو جان لینے کے لیے اس کا چنگل اور تیز ہوجائے،

به طرز نوی برکشد جان ز تن ٭ که خود را بخود زنده داند بدن
خورد گر ادب پیک مرگ از فرنگ ٭ بتاراج جانها شود تیز چنگ؟

(۹) **تکرار معانی**. عقل و عشق کا معرکہ، صوفی و ملا کی جنگ، فقر و درویشی، خودی و نانیست اسی قسم کے چند مضامین ہین جن کو ڈاکٹر صاحب بار بار بیان کرتے ہین، لیکن ان کے پیرایہ بیان نے ان محدود مضامین کو غیر محدود بنا دیا ہے، وہ ایک ہی مضمون کو سیکڑون پیرایے سے بیان کرتے ہین، اور ہر پیرایہ نیا شاعرانہ اور رنگین ہوتا ہے، گویا میر انیس نے اپنے ساتھ ان کے لیے بھی یہ شعر کہا ہے،

اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھون ٭ گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھون

خود ہی ان کا ایک نہایت پامال مضمون ہے، لیکن انھون نے سیکڑون شاعرانہ طریقون سے اس مضمون کو ادا کیا ہے، ہم صرف چند مثالین درج کرتے ہین،

نظر بخویش فروبستہ رانشان این است　　　دگر سخن نہ سراید ز غائب و موجود

نتوان ز چشم شوق رمید اے ہلال عید　　　از صد نگہ براہ تو دامے نہادہ اند

برخود نظر کشا ز تہی دامنی مرنج　　　در سینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

ز انجم تا بہ انجم صد جہان بود　　　خرد ہر جا کہ پر زد آسمان بود

ولیکن چون بخود نگریستم من　　　کران بیکران در من نہان بود

جوان مردیکہ خود را فاش بیند　　　جہان کہنہ را باز آفریند

ہزاران انجمن اندر طوافش　　　کہ او با خویشتن خلوت گزیند

فتادی از مقام کبریائی　　　حضور دون نہادان جبہ سائی

تو شاہینی ولیکن خویشتن را　　　نگیری تا بدام خود نہ آئی

اسی طرح وہ اور تمام مضامین کو سیکڑون طریقے سے ادا کرتے ہین لیکن ہم اختصار کیوجہ سے ان کی مثالین قلم انداز کرتے ہین،

رفعت تخیل

(۱۰) صوفیہ عجز و انکسار، فروتنی و خاکساری حلم و بردباری اور توکل و قناعت کی تعلیم دیتے ہین، لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان کے بجائے عزم و استقلال، خودداری، عزت نفس اور بلند ہمتی کی تعلیم دی ہے، وہ خود کہتے ہین،

در دیر مغان آئی مضمون بلند آور　　　در خانقہ صوفی افسانہ و افسون؟

اس بنا پر جسقدر بلند مضامین انکے کلام مین مل سکتے ہین اُردو فارسی شاعری مین اسکی مثالین کم مل سکتی ہین ہم بطور نمونہ کے صرف چند مثالون پر قناعت کرتے ہین، ورنہ ان کا تمام کلام اس قسم کے مضامین سے بھرا ہوا ہے،

غلام ہمت بیدار آن سوارانم　　　ستارہ را بسنان سفتہ در گرہ بستند

من نہ انم نور یا نار است اندر سینہ ام　　　این قدر دانم بیاض او بہ مہتابے زند

از خود اندیش و ازین بادیه ترسان مگذر — که تو هستی و وجود دو جهان چیزی نیست

بلند بال چنانم که بر سپهر برین — هزار بار مرا نوریان کمین کردند

درین میخانه هر مینا ز بیم محتسب لرزد — مگر یک شیشهٔ عاشق که از وے لرزه بر سنگ است

بده آن دل که مستی های او از بادهٔ خویش است — بگیر این دل که از خود رفته و بیگانه اندیش است

بده آن دل، بده آن دل که گیتی را فرا گیرد — بگیر این دل، بگیر این دل که در بند کم و بیش است

دگر دو زندگانی خسته از کار جهانگیری — جهانے در گره بستم جهانے دیگرے پیش است

نه از خرابهٔ ما کس خراج می خواهد — فقیر راه نشینیم و شهریار خودیم

خاک ما خیزد که سازد آسمانے دیگرے — ذرهٔ ناچیز و تعمیر بیابانے نگر

غلام زنده دلانم که عاشق سره اند — نه خانقاه نشینان که دل بکس ندهند

نگاه از مه و پروین بلند تر دارند — که آشیان بگریبان کهکشان ننهند

ولے بے نیازے که در سینه دارم — گدا را دهد شیوهٔ پادشاهے

چو پروین فرو ناید اندیشهٔ من — بدریوزهٔ پرتو مهر و ماهے

اگر آفتابے سوے من خرامد — بشوخی بگردانم او را ز راهے

عاشق آن نیست که لب گرم فغانے دارد — عاشق آنست که بر کف دو جهانے دارد

عاشق آنست که تعمیر کند عالم خویش — در نسازد به جهانے که کرانے دارد

یہ چند مثالیں ہم نے صرف زبور عجم سے چنی ہیں، ورنہ اس قسم کی مثالیں ان کے کلام میں ہر جگہ مل سکتی ہیں،

موازنہ و مقابلہ

ڈاکٹر صاحب کی شاعری پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں جابجا حالی، شبلی، آزاد، اکبر اور ٹیگور کا نام آیا ہے، اور ایک صاحب نے دنیائے اسلام کے دوسرے ممتاز شعرا سے ان کا مقابلہ بھی کیا ہے، اور اس سلسلے میں ترکی شاعر نامق کمال اور مصری شاعر شیخ الاسلامہ حجازی کا نام لیا ہے، جنھوں نے نہایت پرجوش لہجے میں حب وطن کا ترانہ گایا ہے[1]۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ قدیم و جدید شعرا میں ڈاکٹر صاحب کا موازنہ کسی شاعر سے نہیں کیا جا سکتا، موازنہ کے لیے اشتراکِ موضوع اور اشتراکِ خیال ضروری ہیں، اور ڈاکٹر صاحب دنیائے اسلام کے منفرد شاعر ہیں جن کا کوئی اسکول نہیں، اس لیے

> یہ بحث فضول ہے کہ اقبال شاعری کے کس "درس" سے تعلق رکھتے ہیں، ہندوستان یا ایران کی شاعری کا کوئی "درس" بھی اقبال کا درس نہیں ہے، صہبا وہ خم خانہ قدیم سے لائے، صہبا بھی انگوری نہیں بلکہ عرب کی کھجور کا، فشردہ، جام و مینا انھوں نے اپنے لیے خود ہی بنایا، داغ و حالی و شبلی سے الگ انھوں نے اپنی دنیا آباد کی، اب نہ داغ ہیں، نہ حالی ہیں، نہ شبلی، اقبال بجائے خود اقبال ہے[2]،

ڈاکٹر صاحب نے مرد بزرگ کے عنوان سے ضرب کلیم میں جو نظم لکھی ہے وہ غالباً انہی کی ذات سے تعلق رکھتی ہے، یا کم از کم ان کی ذات پر منطبق ہو سکتی ہے،

---

[1] نیرنگ خیال اقبال نمبر ص ۹۱ [2] ایضاً ص ۹۹

اس کی نفرت بھی عمیق، اسکی محبت بھی عمیق	قہر بھی اسکا ہے اللہ کے بندونپہ شفیق
پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی مین	ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق
انجمن مین بھی میسر رہی خلوت اسکو	شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق
مثل خورشید سحر فکر کی تابانی مین	بات مین سادہ و آزادہ، معانی مین دقیق
اس کا انداز نظر اپنے زمانے سے جدا	اسکے احوال سے محرم نہین پیران طریق

تقلید کی آغوش مین پرورش پانے کا نتیجہ یہ ہے کہ انھون نے قدماء کی روش سے سر مو تجاوز نہین کیا، اس لیے اگرچہ

فارسی زبان مین اقبال نے اپنے زمانہ کی ضروریات سے متعلق بہت سی اہم اصطلاحات، الفاظ اور ترکیبون کا اضافہ کیا لیکن اس زمانے مین جب کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران مین بھی شاعری قدماء کے معیار سے بالکل مختلف اور جدید الفاظ اور ترکیبون کا مجموعہ بنگئی ہے۔ اقبال نے قدماء کے معیار زبان ہی کو ہر جگہ برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے، اس بنا پر ان کے کلام کو پڑھکر اکثر جگہ کسی قدیم شاعر کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے،[۱]

وہ خود کہتے ہین،

کہن شاخے کہ زیر سایۂ او پرورآوردی   چو پرگیش ریخت از وے آشیان برداشتن ننگ است

اس لیے وہ دور جدید کے تمام شعراء سے الگ ہوگئے ہین اور ہندوستان و ایران کے کسی شاعر سے ان کا موازنہ نہین کیا جاسکتا، مولانا حالی اور مولانا شبلی بھی اگرچہ قدیم روش کے پابند ہین لیکن ایجاد و اختراع کی قوت نے ڈاکٹر صاحب کو ان سے بھی الگ کر دیا ہے اور

اردو اور فارسی دونون زبانون مین کوئی شاعر تنوع افکار اور ثروت تصورات

---

[۱] آثار اقبال ص ۱۴۵

مین اقبال کا مقابلہ نہین کر سکتا. فلسفۂ قدیم اور فلسفۂ جدید تصوف اسلامی اور غیر اسلامی کے تمام انواع، مذاہب عالم کے گوناگون تصورات، معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی مسائل فکر اور عمل کی تمام قدیم اور جدید تحریکات ان تمام چیزون کو اقبال نے اپنی شاعری کے خم مین غوطہ دیکر انسانون کے سامنے پیش کیا ہے،[۱]

اس لیے وہ قدیم شعرا سے بھی الگ ہو گئے ہین اور اس خصوصیت کی بنا پر وہ ہم کو ہمارے عہد کے شاعر نظر آتے ہین، وہی ناقابل برداشت مصائب، وہی شکوک و شبہات، وہی زندگی کے اہم اور پیچیدہ مسائل جن سے آجکل ہم دوچار ہین اقبال بھی ان سے دوچار ہو چکے ہین، سعدی اور حافظ، خیام اور امیر خسرو، نظیری اور عرفی، میر تقی اور میر درد، حکیم مومن خان اور غالب کا کلام بھی اگرچہ ہم کو متاثر کرتا ہے، لیکن ہم یہ محسوس کیے بغیر نہین رہ سکتے کہ یہ تمام شعرا ہمارے دور کے نہین ہین، ان کے زمانہ مین زندگی کے مسائل اس سے بہت مختلف تھے، جن سے آجکل ہم دوچار ہین، زندگی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر اگر بالکل نہین تو کسی نہ کسی حد تک ہمارے نقطۂ نظر سے ضرور مختلف ہوگا، تشکیک و ارتیابیت جو دور مادیت کا ایک تلخ ثمر ہے اس کو انھون نے کبھی چکھا ہی نہین تھا، ان کے دلون مین شکوک و شبہات کی کوئی گنجایش ہی نہین تھی، مذہب اور اخلاق کے بنیادی اصولون کی نسبت انھون نے جرح و قدح کرنی سیکھی ہی نہین تھی، انکے دلون مین کبھی یہ خیال پیدا ہی نہین ہوا تھا کہ تصوف، وجدان اور عشق پر کوئی بحث و مباحثہ بھی ہو سکتا ہے،[۲]

اب لے دے کے صرف ایک ٹیگور رہ جاتے ہین، لیکن ان کا موضوع شاعری ڈاکٹر صاحب سے اس قدر مختلف ہے کہ دونون کا موازنہ نہین ہو سکتا، ٹیگور کی تگ و تاز اس کے ایک خاص

---

[۱] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۸۰، [۲] سب رس اقبال نمبر ص ۸۰، ۹۰

موضوع تک محدود ہے، یعنی اس نے قدرت کے وہ دلفریب مناظر جن مین سکون وخاموشی کی شان پائی جاتی ہے، نہایت دلکش و موثر پیرایہ مین دکھائے ہین اور بس، چونکہ یورپ ایک عرصہ ہوا اس نعمت کو اپنی پرہیجان زندگی کے نذر کر چکا تھا، اس لیے اس نے تسلیم کیا کہ یہ وہی چیز ہے جو کبھی ہماری زندگی کا سامان تھی، اور ٹیگور ہماری اس حالت کا ترجمان ہے[۱] لیکن "اقبال دراصل ایک اسلامی صوفی شاعر تھا، وہ منفی تصوف کا نہین بلکہ اثباتی تصوف کا حامل تھا، منفی تصوف وہ ہندی عجمی تصوف ہے جو انسان کو اس دنیا سے بے تعلق کر کے صرف روحانیت مین گم کر دے، اثباتی تصوف اسلامی تصوف ہے جو انسان ان کا روحانیت سے اسطرح تعلق باقی رکھے کہ وہ اس دنیا مین زیادہ سے زیادہ انفرادی اور اجتماعی فرائض انجام دے...... برکلے کی طرح وہ دنیا کو محض وہم وخیال تصور نہین کرتا تھا، بلکہ اسکو ایک ٹھوس حقیقت مانتا تھا، شاعرانہ بلندی مین اسکا مقابلہ ہندوستان مین صرف ٹیگور کر سکتا ہے، دونون صوفی منش شعرا ہین مگر ایک منفی تصوف کا حامل ہے تو دوسرا اثباتی تصوف کا، ٹیگور خاموش اور پرسکون زندگی گذارنا چاہتا ہے، اقبال پرجوش وخطرناک، ٹیگور تخیل کی دنیا مین انسانی مشکلات بھول جانا چاہتا ہے، اقبال مشکلات کو دعوت دیتا ہے اور پھر ان پر حاوی ہونا چاہتا ہے،

ٹیگور خدا کے سامنے سر نیاز خم کر دیتا ہے، اقبال خدا کے حضور مین بھی اپنی انسانی خودی کو فراموش نہین کرتا، ٹیگور کی شاعری کی جان سب کچھ ہستی کی نفی مین ہے، اقبال کے یہان اثبات ہستی کا تصور سب سے زیادہ نمایان ہے، ٹیگور ویدانت کے ذہنی فلسفے کا علمبردار اور ہندو قومیت کا ترجمان ہے، اقبال اسلام کے عملی فلسفۂ زندگی کا حامل مسلم قوم کا شاعر ہے[۲] خود ڈاکٹر صاحب کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ انکا موازنہ کسی ہندوستانی یا ایرانی شاعر سے نہین کیا جا سکتا۔

منسنج معنی من در عیار ہند وعجم کہ اصل این گہر از گریہ ہای نیم شبی است

---

[۱] نیرنگ خیال اقبال نمبر ص ۱۸۲، ۱۸۳، [۲] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۹۵۹، ۹۶۰

کلام اقبال کی مقبولیت

ڈاکٹر صاحب نے اپنے اور گوئٹے کا موازنہ ایک شعر مین اس طرح کیا ہے:

او چمن زادے چمن پروردۂ — من دمیدم از زمینِ مردۂ

لیکن ہم کو اس سے اتفاق نہین ہے، ہندوستان کے اور خطے مردہ ہون تو ہون، لیکن زندہ ولان پنجاب کی سرزمین مردہ نہین ہے، اس نے ابتدا ہی سے ڈاکٹر صاحب کے نام کو اچھالا اور ابتک اچھال رہی ہے، اول اول حمایت اسلام کے جلسہ مین ان کی نظم پڑھی جاتی تھی، تو دس دس ہزار آدمی ایک وقت مین جمع ہو جاتے تھے، اور جب تک نظم ختم نہ ہو جائے دم بخود بیٹھے رہتے تھے[1] پروفیسر خواجہ عبدالحمید نے لکھا ہے کہ "انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے مین ڈاکٹر صاحب تشریف لاتے تو ہر شخص کی زبان پر ہوتا آج ڈاکٹر اقبال نے آنا ہے؛ ہر کس و ناکس وہان موجود ہوتا، اسکول اور کالج کے زمانہ مین ہر مسلمان طالب العلم کو ڈاکٹر صاحب کے کچھ نہ کچھ اشعار (اور لاہور مین تو ہر ملت کے طلبہ کو) یاد ہوتے تھے، اور مجلسین ان اشعار کے ترنم سے گرمائی جاتی تھین"[2]

اپنی شاعری کے پہلے دور مین وطنی نظمون کی بنا پر انھون نے مسلمانون کی طرح ہندوون مین بھی حسن قبول حاصل کیا تھا، اور ان کا ترانہ ہندی بچے بچے کی زبان پر تھا، چنانچہ ایک تعلیم یافتہ ہندو مضمون نگار لکھتا ہے کہ "اقبال کو قدرت نے تغزل کی دولت عطا کرنے مین

---

[1] مقدمہ بانگ درا۔ [2] آثار اقبال ص ۵۳، ۵۴

بہت فیاضی سے کام لیا ہے، چنانچہ "ہمالیہ" کو محض متغزلانہ انداز بیان کی وجہ سے یہ قبول عام حاصل ہوا، اور ان کی بعض دوسری نظمون خصوصاً "ہندوستان ہمارا" کی طرح (جسے ہندوستان کے قومی گیت کی حیثیت حاصل ہے) یہ نظم ہندوستان کے طول وعرض مین بگولے کی تیزی اور تندی کے ساتھ پھیل گئی، ہر شہر، قصبے، اور گاؤن کے گلی کوچون مین لڑکون اور لڑکیون کی زبان سے یہی نغمہ سنائی دینے لگا، اور سارے ملک نے اقبال کو قومی بیداری کا پیمبر تسلیم کر لیا، میرے نزدیک وہ اپنے ابتدائی کلام مین جس بام رفعت پر جلوہ گر نظر آتے ہین ان کی نظیر زمانہ مابعد کی فارسی نظمون کے سوا اور کہین نہین مل سکتی۔[۱]

اس دور کے بعد وہ ہندوستان مین اپنی شاعری کا غلغلہ بلند کر کے یورپ چلے گئے اور وہان چند دنون تک خاموشی کے عالم مین رہے، لیکن وہان سے پلٹنے کے بعد جنگ طرابلس کے زمانہ مین انھون نے چند نہایت پرزور اور پرجوش نظمین لکھین اور ان نظمون نے ان کی شاعری کا غلغلہ اور بلند کر دیا، مولانا ظفر علی خان نے لکھا ہے کہ "جنگ طرابلس کے زمانے مین اقبال کا کلام مسلمانان عالم پر عربون کی رجز خوانی کا اثر رکھتا تھا، ہندوستان افلاس کی وجہ سے توپ و تفنگ اور سامان حرب نہین رکھتا، لیکن اقبال کا کلام رکھتا ہے"۔[۲]

یہی دور ہے جس سے ڈاکٹر صاحب کی اسلامی شاعری کا آغاز ہوا، اور انھون نے ترانہ ہندی کے بجائے ترانہ ملی لکھا،

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا — مسلم ہین ہم وطن ہے سارا جہان ہمارا

اس پر ہندو وطن پرستون کو قدرتاً شکوہ پیدا ہوا اور اس کا اظہار پنڈت آنند نرائن ملا ایم، اے، ایل، ایل، بی نے ایک نظم مین کیا۔

---

[۱] نیرنگ خیال اقبال نمبر ص ۷۹، ۸۰، [۲] سب رس اقبال نمبر ص ۸۶

ہندی ہونے پر نازجسے کل تک تھا حجازی بن بیٹھا　　　اپنی محفل کا رند پرانا آج نمازی بن بیٹھا

محمل میں چھپا ہے قیس حزیں دیوانہ کوئی صحرا میں نہیں　　　پیغام جنون جو لایا تھا اقبال ز دنیا میں نہیں

اے مطرب تیری تانوں میں اگلی سی اب وہ بات نہیں　　　وہ تازگی تخیل نہیں، بے ساختگی جذبات نہیں

لیکن اسلامی ممالک میں ان کی شاعری نے خاص طور پر شہرت حاصل کی، چنانچہ مئی ۱۹۲۴ء میں جب کہ شاہ امان اللہ خان اپنی حکومت کے انتہائی عروج کی منزلیں طے کر رہے تھے، ڈاکٹر صاحب کا کلام کابل کی ایک عظیم الشان مجلس میں پڑھا گیا، جس میں شاہ ممدوح، سفرائے دول خارجہ، عمائدین شہر اور وزیر تعلیم اور دوسرے وزرا بھی شامل تھے، یہ جلسہ طلبہ کے تقسیم انعامات کا تھا، اس میں ہمارے ملک الشعرائے ہند کا مشہور قومی ترانہ "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" بچوں نے اپنے پیارے اور سادے لہجہ میں سنایا، پھر جب فوجی باجہ نے اسے دہرایا تو حاضرین پر رقت طاری ہو گئی جس طرح ہندوستان کی ہر قومی و ملکی محفل میں "ہندوستان کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا" کا ترانہ گایا جاتا ہے، اسی طرح ہندوستان کی ہر اسلامی مجلس میں "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" ایک جزو لاینفک ہو گیا ہے۔[1]

ڈاکٹر صاحب کے فارسی کلام کی مقبولیت سب سے زیادہ ایران میں ہوئی۔ البتہ ان کو یہ افسوس رہا کہ یہ نغمۂ شوق اہل عرب کے کانوں تک نہ پہونچ سکا۔

نوائے من بہ عجم آتش کہن افروخت　　　عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بے خبر است

لیکن ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ "اسلامی ترانہ کا ترجمہ عربی کی نظم میں بھی ہو گیا ہے"[2] اور یہ ترجمہ مولوی عبد الحق صاحب حقی بغدادی مرحوم سابق پروفیسر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے کیا" اور وہ مصر وغیرہ کے عربی اخبارات میں شائع ہوا ہے۔

---

[1] نیرنگ خیال، اقبال نمبر ص ۴۳، ۴۴۔ [2] ایضاً ص ۴۴

مصر کے مشہور و معروف سیاح جناب احمد رفعت اپنی سیاحت کے دوران مین جب شملہ و لاہور آئے تو انھون نے بھی ڈاکٹر صاحب کی بہت سی نظمون کا عربی مین ترجمہ کیا، اور یہ ترجمے مصر کے مشہور اخبار الاہرام مین شائع ہوئے[۱]

ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے جو جامعہ مصریہ قاہرہ مین فارسی ادب اور تاریخ اسلام کے پروفیسر تھے، ڈاکٹر صاحب کی مشہور نظم "نغمۂ ساربان حجاز" کا عربی مین ترجمہ کیا، اور ڈاکٹر صاحب پر متعدد مضامین عربی رسائل مین شائع کیے، اس ترجمہ کا نمونہ یہ ہے:-

یا ناقتی الخطارہ　　ناقۂ سیار من

وظبیتی المعطارہ　　آہوے تاتار من

وعدتی والشارہ　　درہم و دینار من

والمال والتجارہ　　اندک و بسیار من

یا دولتی السیارہ　　دولت بیدار من

حثی الخطا قلیلا منزلنا قریب

تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست[۲]

جوہر اقبال مین پوری نظم کا ترجمہ درج کیا گیا ہے، لیکن ہم نے اختصار کی غرض سے بقیہ بندون کو نظرانداز کر دیا ہے،

ترکی زبان بھی ڈاکٹر صاحب کے رشحات فیض سے محروم نہین رہی، اور ترکی فاضل حسین دانش نے ترکی مین ڈاکٹر صاحب کی بہت سی نظمون کا ترجمہ کیا، اور پیام مشرق پر تبصرہ لکھا، اور ڈاکٹر صاحب کے نظریات کی نہایت وضاحت کے ساتھ تشریح کی، ڈاکٹر توفیق بے نے جو اس روایت کے

---

[۱] نیرنگ خیال اقبال نمبر ص ۲۴۴، [۲] جوہر اقبال ص ۱۶۷

راوی ہین، دوران گفتگو مین کہا کہ اگر اقبال کبھی قسطنطنیہ تشریف لائین تو ان کا شاہانہ استقبال کیا جائے[1]
ان قصر بجا ست کی بنا پر ہندوستان، افغانستان، ایران، ترکی اور عرب تمام اسلامی ممالک
ڈاکٹر صاحب کے حدود اثر مین داخل ہین، ہندوستان سے سب سے زیادہ قریبی تعلق انگلستان کو ہے
اور انگلستان نے ڈاکٹر صاحب کی پوری قدردانی کی، چنانچہ ڈاکٹر سیوز آنجہانی نے
شکوہ کا ترجمہ انگریزی مین کیا، جو انڈین ریویو مین شائع ہوا، وہ پیام مشرق کا انگریزی مین بھی ترجمہ کرنا
چاہتے تھے، یورپ و امریکہ مین ڈاکٹر صاحب کی سب سے زیادہ شہرت ڈاکٹر نکلسن پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی
کے انگریزی ترجمہ اسرار خودی سے ہوئی، ڈاکٹر براؤن آنجہانی نے اس ترجمہ پر رائل ایشیاٹک سوسائٹی
کے مجلہ ۱۹۲۱ء مین تبصرہ لکھا اور اپنی تازہ ترین تالیف تاریخ ادبیات فارسی کی چوتھی جلد مین
ڈاکٹر صاحب کا تذکرہ کیا، رسالہ اتھینیم ۱۹۲۱ء مین مسٹر فارسٹر نے بھی اس ترجمہ پر تبصرہ لکھا[2]، اور
اس ترجمہ اور ان تبصرون کا امریکہ پر یہ اثر ہوا کہ ایک بار ۱۹۲۲ء یا ۱۹۲۷ء مین آغا شاعر قزلباش
دہلوی جو مہاراجہ جھالرا پاٹن آنجہانی کے مصاحب اور درباری شاعر تھے، کلکتہ کے گرانڈ ہوٹل مین
مقیم تھے، جہان امریکن سیاحون کی ایک پارٹی بھی قیام پذیر تھی، ان مین ایک سیاح نے ان سے
پوچھا کہ آپ کون ہین، اور کیا کام کرتے ہین؟ انھون نے جواب دیا کہ مین ایک مہاراجہ کا مصاحب
اور اس کا ایک مشہور شاعر ہون، امریکن سیاح بیساختہ بول اٹھا "تو کیا آپ اقبال ہین مسٹر اقبال"
اس پر وہ متحیر ہوگئے اور ڈاکٹر صاحب کی اس عظیم الشان مقبولیت اور لافانی شخصیت کا ان کو
دل سے اعتراف کرنا پڑا[3]۔

جرمنی سے ڈاکٹر صاحب کو خاص تعلق ہے، وہ وہین کے پی، ایچ، ڈی ہین، اور ان کا
کلام جرمن فلسفیون کے فلسفیانہ نظریات سے بہت کچھ متاثر ہے، اس لیے جرمنی نے ان کی خاص

[1] نیرنگ خیال اقبال نمبر ص ۱۸، [2] ایضاً ص ۱۴۱، ۱۴۴، [3] ایضاً ص ۳۴، ۳۵

قدردانی کی اور وہاں ڈاکٹر صاحب کے نام سے ایک سوسائٹی قائم ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی تعلیمات اور کلام کی اشاعت کرے، ڈانسوروشو نے پیام مشرق کے مقدمہ کو جرمن زبان کے لباس کا جامہ پہنا کر پیام مشرق کی غرض وغایت کو واضح کیا،

ڈاکٹر فشر پروفیسر لیپزگ یونیورسٹی اڈیٹر اسلامیکا نے جرمن زبان مین پیام مشرق پر تبصرہ لکھا اور ڈاکٹر نکلسن سے بھی زیادہ بہتر طریق پر ڈاکٹر صاحب کا گوئٹے سے مقابلہ کیا،

جرمنی کے مستشرق ڈاکٹر ہانس مائنکے نے جو وہان کا ایک مشہور فلسفی شاعر ہے، نہایت حسن عقیدت اور فرط محبت سے پیام مشرق کے ایک خاص حصہ کا ترجمہ جرمن زبان مین کیا، پھر اس کو چمڑے کے کاغذ پر جس پر عموماً انجیل وغیرہ مقدس کتابین لکھی جاتی ہین اپنے ہاتھ سے خوشخط لکھ کر اور مشرقی انداز مین نقش ونگار بنا کر ڈاکٹر صاحب کی خدمت مین ہدیۃً روانہ کیا،

جرمنی مین ایک بیاض ہندوستانی علم وادب کے متعلق شائع ہوئی اور اس مین مختلف شعرا کے کلام کا انتخاب بصورت تراجم جمع کیا گیا، اس مجموعہ مین ڈاکٹر صاحب کی پانچ نظمین ہین اور ٹیگور کی صرف ایک نظم[1]،

روس اگرچہ ہندوستان سے بیگانہ ملک ہے لیکن ایک روسی سیاح محض ڈاکٹر صاحب سے ملنے کی غرض سے لاہور آیا، اور اسرار خودی کے نظریات کو روسی زبان مین قلمبند کیا[2]،

ہندوستان کے بعض مسلمانون نے ازراہ قدردانی یا اور کسی غرض سے ان کے کلام کا انگریزی زبان مین ترجمہ کرنا چاہا، اور ڈاکٹر صاحب نے ان کو نظمون کے انتخاب کے متعلق مفید مشورے دیے، ڈاکٹر صاحب کی اصلی خواہش یہ تھی کہ جاوید نامہ کا تمام وکمال ترجمہ کیا جائے[3]،

ڈاکٹر صوفی غلام محی الدین صاحب اور اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر تاثیر نے بھی ڈاکٹر صاحب

---

[1] نیرنگ خیال اقبال نمبر ص ۲۴، ۳۴، [2] ایضاً ص ۴۴، [3] اقبال نامہ ص ۲۹۹، ۳۰۰

کی چند رباعیات کا ترجمہ کیا جس کا تذکرہ اقبال نامہ کے صفحہ ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳ مین ہے،

ایک صاحب مسٹر ضرار احمد کاظمی نے اس سے زیادہ محسوس صورت مین ڈاکٹر صاحب کی قدردانی کی اور انکی مشہور نظم شکوہ اور جواب شکوہ کو مصور کر کے مولانا حالی مرحوم کی برسی کے موقع پر ڈاکٹر صاحب کی خدمت مین پیش کیا جس کو انھون نے بہت پسند کیا، چنانچہ ان کو ایک خط مین لکھتے ہین،

مین اور علامہ یوسف علی صاحب نے آپکا آرٹ بابت شکوہ اور جواب شکوہ مولانا حالی کی برسی پر دیکھا تھا، میرا اور مبصر زمانہ علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب کا یہ خیال ہے کہ اگر آپ نے کافی مشق و مہارت کے بعد اس فن مین کمال حاصل کر کے شکوہ اور جواب شکوہ کو دنیائے اسلام کے سامنے پیش کر دیا تو آپ فن مصوری مین ایک نیا اضافہ کر کے اپنے فن کا ایک نیا اسکول قائم کر رہے ہین اور مین سمجھتا ہون کہ جب یہ چیز ایسی شان کیساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیگی تو دنیا یقینی طور سے اسکو "کاظمی اسکول" کے نام سے موسوم کریگی، آپ محض فن مصوری مین اضافہ نہین کر رہے ہے، بلکہ دنیائے اسلام مین بحیثیت "مصور اقبال" ایک زبردست خدمت انجام دے رہے ہین، جو کہ شاید قدرت آپ ہی سے لینا چاہتی ہے، پوری مہارت فن کے بعد اگر آپ نے جاوید نامہ پر خامہ فرسائی کی تو ہمیشہ زندہ رہو گے، [۵]

ڈاکٹر صاحب کی عزت افزائی کے لیے یہ جو کچھ کیا گیا اگرچہ وہ اس سے زیادہ قدر و منزلت کے مستحق تھے لیکن بااینہمہ ہمارے نزدیک یہ دور جدید کی رسمی چیزین ہین جنکے ذریعہ سے ڈاکٹر صاحب کو صرف دیکھا جا سکتا ہے، سنا جا سکتا ہے، پڑھا جا سکتا ہے، سمجھا نہین جا سکتا، اصلی قدردانی یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے کلام کو اس سے زیادہ سمجھا جائے جتنا سمجھا جا چکا ہے، تاکہ ان کی یہ شکایت دور ہو جائے،

چو رخت خویش بر بستم ازین خاک	ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست این مسافر	چہ گفت؟ و با کہ گفت؟ واز کجا بود؟

---

[۵] اقبال نامہ ص ۳۰۶

اغلاط

"جب ہم کسی مصنف کا ایک شاعر کی حیثیت سے مطالعہ کریں تو ہمیں اپنی توجہ صرف اسکے افکار و خیالات ہی تک محدود نہیں رکھنی چاہیے، شاعر محض خیالات ہی کی تخلیق نہیں کرتا، بلکہ وہ حسن کی تخلیق بھی کرتا ہے، اس کا کام صرف یہی نہیں کہ وہ اچھوتے مضامین تلاش کرے بلکہ اس کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ ان کو ایک خوبصورت لباس سے مزین کرے"[1]

"شاعری ایک فن ہے، اور فن کا تقاضا ہے کہ اس کے اصول و قواعد کی متابعت نہایت پابندی سے کی جائے، لہٰذا اقبال کے محاسن شعر یا کمال فن کی تشریح بھی فن ہی کے نقطۂ نظر سے کی جائے گی یعنی اس کے جملہ خصائص اور لوازم کا خیال رکھتے ہوئے اس کی زبان اردو اور فارسی سے بحث کرنی ہوگی"[2]

ان تنقیدی تصریحات کی بنا پر اصول و قواعد کے مطابق ڈاکٹر صاحب کے کلام کا مطالعہ کیا جاتا ہے، تو بہت سی لفظی غلطیاں نظر آتی ہیں، لیکن تعجب ہے کہ کسی نے ان غلطیوں کا استقصا نہیں کیا یا یہ کہ وہ مضامین ہماری نظر سے نہیں گذرے جن میں ان غلطیوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، سید آل احمد سرور نے "اقبال اور اس کے نکتہ چیں" کے عنوان سے جو مضمون رسالہ اردو اقبال نمبر میں لکھا ہے اس میں صرف ایک غلط لفظ پرہیز سے تعرض کیا ہے جو مذکر ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس کو مونث استعمال کیا ہے،

اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز

---

[1] اقبال اور اس کا پیغام ص ، [2] اقبال کا مطالعہ ص ۱۸

بعض اور مصنفین نے چند الفاظ نقل کیے ہین، جو درحقیقت غلط نہین تھے، اس لیے انھون نے آسانی کے ساتھ ان کا جواب بھی دیدیا ہے، تاہم اتنا تسلیم کرلیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے کلام مین ادب و انشا، کی خامیان ضرور ہین لیکن چونکہ کسی نے ان غلطیون اور خامیون کو تفصیل کے ساتھ نہین دکھایا ہے، اس لیے ہم خود اس ناگوار فرض کو ادا کرتے ہین،

آنکھ وقفِ دید تھی لب مائلِ گفتار تھا
دل نہ تھا میرا سراپا ذوقِ استفسار تھا

"لب مائل گفتار تھے" ہونا چاہیے، لب چونکہ دو ہوتے ہین اس لیے شعرا، اس کے لیے ہمیشہ جمع کا صیغہ لاتے ہین،

دکھے ہوئے دلون کی فریاد یہ صدا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہون نہ سننے والے

دکھے بہ تشدید کاف صحیح نہین، بہ تخفیف کاف ہونا چاہیے،

کیا تماشا ہے رَدی کاغذ سے من جاتا ہے تو
جب کسی شے پر بگڑ کر مجھ سے چلاتا ہی تو

"ردی" بہ تشدید دال ہونا چاہیے، نہ کہ بہ تخفیف دال، "چلاتا ہے" بھی پنجابی محاورہ ہے،

چاندنی ہے نور تیرا، عشق میرا نور ہے
تو طلب خو ہے تو میرا بھی یہی دستور ہے

"طلب خو" بدنما اور غیر مستعمل ترکیب ہے،

ملت ختم رسل شعلہ بہ پیراہن ہے
اس نئی آگ کا اقوامِ کہن ایندھن ہے

اقوام قوم کی جمع ہے، اس لیے" اقوام کہن ایندھن ہین" ہونا چاہیے،

غیر یک بانگ درا کچھ نہین سامان تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویران تیرا

قافلہ کا ویران ہونا، اردو کا محاورہ نہین، قافلہ لٹنا محاورہ ہے،

مزا تو جب ہے کہ گرتون کو تھام لے ساقی
نشا پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے

"نشا پلانا" لکھنؤ کا محاورہ نہین، غالباً پنجابی محاورہ ہوگا،

خوش تو ہین ہم بھی جوانون کی ترقی سے مگر　　　لبِ خندان سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ

"ساتھ ہی" ہونا چاہیے،

خوگرِ پروانہ کو پرواز مین کچھ ڈر نہین　　　موت اس گلشن مین جز سنجیدن پر کچھ نہین

پر تولنا اردو کا محاورہ ہے، فارسی کا محاورہ نہین، اور ایک زبان مین دوسرے زبان کے محاورات کا ترجمہ کرنا صحیح نہین،

یہ غلطیان بانگ درا سے ماخوذ ہین لیکن بانگ درا کے چھپنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے اس قسم کی غلطیون کے ازالہ کے لیے اس پر نظر ثانی کر لی تھی[1] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مین اس سے زیادہ غلطیان رہی ہون گی،

بال جبریل اور ضرب کلیم مین لفظی غلطیان کم ہین، ایک تو وہی لفظ "پرہیز" ہے جس کو ڈاکٹر صاحب نے بال جبریل مین مؤنث استعمال کیا ہے، دوسرا لفظ "جوہر عورت" ہے جو ضرب کلیم کے اس شعر مین آیا ہے،

جوہر مرد عیان ہوتا ہے بے منتِ غیر　　　غیر کے ہاتھ مین ہے جوہر عورت کی نمود

کیونکہ عورت کا لفظ جس معنی مین اردو زبان مین مستعمل ہے، فارسی اور عربی مین مستعمل نہین، اسلیے اس کی طرف جوہر کی اضافت غلط ہے،

لفظی غلطیون کے ساتھ کہین کہین معنوی غلطیان بھی ہین مثلاً

چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیال ہے　　　دامنِ موجِ ہوا جسکے لیے رُمال ہے

کوہ ہمالیہ سے خطاب ہے، لیکن چشمۂ دامن ہو یا آئینۂ سیال ہو، دونون کے لیے رومال ایک غیر ضروری اور غیر متعلق چیز ہے،

---

[1] اقبال نامہ ص ۱۰۱

دیدۂ بینا ہین داغِ غم چراغِ سینہ ہے — روح کو سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہے

آہ کو آئینہ سے کوئی مشابہت نہین، اس لیے یہ تشبیہ غلط ہے، آہ کو سیاہ چیز سے تشبیہ دیجاتی ہے،

رو کون نہ دودِ آہ دلِ بیقرار کو — کملی اوڑھاؤن آج شبِ ہجر یار کو

اور آئینہ ایک روشن چیز ہے

تو کوئی چھوٹی سی بجلی ہے کہ جسکو آسمان — کر رہا ہے خرمنِ اقوام کی خاطر جوان

بجلی کو جوان کرنا بہت نامانوس استعارہ ہے،

فضائے عشق پہ تحریر کی اس نے نوا ایسی — میسر جس سے ہین آنکھون کو اتبک اشکِ عنابی

فضائے عشق پر نوا کا تحریر کرنا بالکل بے معنی استعارہ ہے، نوا تحریر کرنے کی کوئی چیز نہین، اور نہ اس کو تحریر سے کوئی مناسبت ہے،

بعض الفاظ غلط تو نہین ہوتے لیکن سبک، مبتذل اور بازاری ہوتے ہین، اس لیے سنجیدہ اور باوقار شعرا، ان کو استعمال نہین کرتے، اور ڈاکٹر صاحب کے کلام مین بھی اس قسم کے الفاظ شاذ و نادر آگئے ہین

مین بھٹکتا ہون تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیون — ہین سبھی تہذیب کے اوزار تو چھلنی ہین چھاج

بعض لوگ لفظ کدو کو بھی جو ڈاکٹر صاحب کے اس شعر مین آیا ہے،

مرا سبو چہ غنیمت ہے اس زمانے مین — کہ خانقاہ مین خالی ہین صوفیون کے کدو

بازاری سمجھتے ہین، لیکن درحقیقت یہ لفظ بازاری نہین ہے، البتہ اس موقع پر غیر فصیح ہے، کیونکہ عربی اور فارسی کے بہت سے الفاظ ایسے ہین کہ جب وہ مفرد استعمال کیے جاتے ہین تو غیر فصیح ہو جاتے ہین، لیکن ترکیب و اضافت کے بعد غیر فصیح نہین رہتے، مثلاً مومن کے اس شعر مین

جا سکتے نہین جاتے ہین اُس کو ہین جو ناصح — چھٹ جائین گے قصہ سے کیا تو نے اگر بند

"کو" کا لفظ نہایت نامانوس اور غیر فصیح واقع ہوا ہے، لیکن یہی لفظ جب اضافت کے ساتھ آتا

ہے تو فصیح ہو جاتا ہے، مثلاً

اب ذرا جان وہی کوے بتان کی باتین ہو چکا تذکرۂ باغِ جنان اے واعظ

بعینہٖ اسی طرح ڈاکٹر صاحب کے شعر مین کدو کا لفظ چونکہ بلا اضافت آیا ہے اس لیے غیر فصیح معلوم ہوتا ہے، اگر کدوے شراب ہوتا تو فصیح ہو جاتا،

ڈاکٹر صاحب کے فارسی کلام پر جہان تک ہم کو معلوم ہے کسی نے اعتراضات نہین کیے اور چونکہ خود ہم کو اپنی فارسی دانی پر اعتماد نہین ہے اور اسی کے ساتھ یہ موضوع بھی ہمارے لیے غیر دلچسپ ہے اس لیے ہم نے بھی اس طرف توجہ نہین کی، البتہ رموزِ بیخودی پر مولانا سید سلیمان ندوی نے چند اعتراضات کیے ہین اور ڈاکٹر صاحب نے پرائیویٹ خطوط مین ان کے جوابات دیے ہین، اور یہ خطوط اقبال نامہ صفحہ ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷ مین اعتراضات وجوابات کے ساتھ چھپ گئے ہین، اور ان کے بعض اعتراضات کو ڈاکٹر صاحب نے نہایت کشادہ دلی کے ساتھ تسلیم بھی کیا ہے، چنانچہ ان کو ایک خط مین لکھتے ہین :-

میری خامیون سے مجھے ضرور آگاہ کیا کیجئے، آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن مجھ فائدہ ہوگا، بادۂ نارسا کے لیے مجھے کوئی سند یاد نہین، بادۂ نارس یا میوۂ نارس (بمعنی خام) لکھتے ہیں، لفظ مینار غلط ہے، صحیح لفظ منار (بغیر ی کے ہے)۔

پھر یہ معذرت کی ہے کہ "یہ الفاظ اس زمانہ کی نظمون مین واقع ہوئے ہین جس زمانہ مین مین سمجھتا تھا کہ لٹریچر مین ہر طرح کی آزادی لے سکتے ہین، یہانتک کہ بعض نظمون مین مین نے اصول نحو کا بھی خیال نہین کیا اور ارادۃً "[1]

ڈاکٹر صاحب کا اصولی جواب یہ ہے کہ ادب کی دو قسمین ہین "ادب برائے زندگی" اور "ادب

---

[1] اقبال نامہ ص ۱۰۱

برائے ادب" اور یہی ثانی الذکر ادب ہے جس میں ہر قسم کی تراش خراش کی جاتی ہے، لیکن یہ ادب کبھی ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر نہیں رہا، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں :-

شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا، کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس، اس بات کو مدنظر رکھکر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں، کیا عجب کہ آیندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں، اس واسطے کہ آرٹ (فن) غایت درجہ کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات موجودہ حالات میں میرے لیے ممکن نہیں۔[۱]

---

[۱] اقبال نامہ ص ۱۰۸

———:———
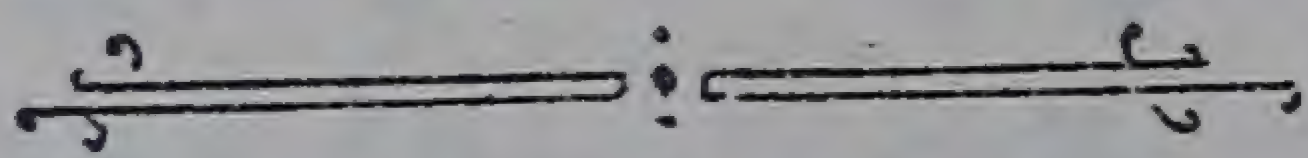
فلسفۂ خودی

دور جدید کے نقادون نے ڈاکٹر صاحب کی تین حیثیتین قائم کی ہین، شاعر اقبال، فلسفی اقبال، مسلمان اقبال، لیکن ان تینون حیثیتون مین سب سے مقدم حیثیت شاعر اقبال کی تھی، اس لیے ہم نے سب سے پہلے اسی حیثیت کو نمایان کیا ہے، اس کے بعد ایک فلسفی کی حیثیت سے ان کو منصۂ شہود پر لانا چاہتے ہین،

ڈاکٹر صاحب کے کلام مین اگرچہ ہر قسم کے فلسفیانہ خیالات بکثرت موجود ہین، لیکن ان کے نام اور ان کے کلام کو جس چیز سے شہرت ابدی حاصل ہوئی ہے وہ ان کا فلسفۂ خودی ہے لیکن خودی سے فخر و غرور مراد نہین، بلکہ اس سے وہ استقلال ذاتی مراد ہے، جو ہر مخلوق کے علم و عمل کو ایک مخصوص دائرے مین نمایان کرتا ہے، اس کی ذات و صفات کی بود و نمود کے مظاہر متعین کرتا ہے، اور اس کی نشو و نما اور پائندگی کے سامان فراہم کرتا ہے، اس لیے وہ جوہر ہے، عرض نہین، آفتاب ہے، آفتاب کا سایہ نہین، متحرک ہے، ساکن نہین، غرض وہ ایک حقیقی زندگی ہے اور زندگی کی تمام لذتین اس کے استحکام، اس کی توسیع اور اس کے اثبات سے وابستہ ہین، لیکن صوفیون نے اس شاندار خودی کو مختلف طریقون سے مٹایا تھا، مثلاً وحدۃ الوجود کا عقیدہ قائم کر کے ہر چیز کے وجود کی نفی کر دی تھی، اور دنیا کو صرف وجود الٰہی کا ایک پرتو قرار دے کر ہر چیز کو وہم و گمان قرار دیا تھا جس کا وجود صرف دماغ مین تو ہے لیکن خارج مین نہین، یہ تو صوفیون کے اس نظری عقیدہ کا نتیجہ تھا لیکن عملی حیثیت سے بھی انھون نے ایسے سلبی اخلاق اختیار

کیے تھے جو تمدنی ترقی کے بالکل منافی تھے، مثلاً تواضع وخاکساری، جو حد سے بڑھ کر عجز و ذلت کے مرادف ہوجاتے ہین، عیسائی راہبون کے مخصوص اوصاف ہین، اور انھون نے اس مین غلو پیدا کرکے انسانی آزادی اور خودداری کا خاتمہ کردیا تھا، چنانچہ لیکی تاریخ اخلاق یورپ کی دوسری جلد مین لکھتا ہے کہ "انکسار اور فروتنی کا وصف تمام تر مسیحیت کا پیدا کردہ ہے، اور گویہ وصف بھی ایک زمانہ تک نہایت موزون ومناسب رہا تاہم تمدن کی روز افزون ترقی کی رفتار کا آخر تک ساتھ نہ دے سکا، ترقی تمدن کے لیے لازمی ہے کہ قوم مین خودداری ہو اور حریت کے جذبات موجود ہون، اور انکسار وتواضع اس کے دشمن ہین، خانقاہانہ طرز زندگی کا مثل فوجی طرز زندگی کے اقتضا یہ ہے کہ استبدادی حکومت ہو، تاہم سپاہیون مین توپھر بھی فی الجملہ خودی وخودداری موجود ہوتی ہے لیکن اسے بالکل مٹا دینا جو خانقاہانہ زندگی کا مطمح نظر تھا کسی طرح ترقی تمدن کے حق مین مفید نہین پڑ سکتا، اور پھر بڑے بڑے زاہدون مین تو اس جذبہ سے اور فضائل پیدا ہو بھی جاتے ہین، لیکن عوام مین تجربہ سے معلوم ہوا کہ انکسار بالکل غلامانہ زندگی کے مرادف ہوجاتا ہے"۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے صوفیون نے بھی اسی قسم کے سلبی اخلاق اختیار کررکھے تھے، اور خانقاہانہ طرز زندگی نے ان کے مریدون کو بالکل ایک کرم خوردہ مردہ لاش بنا دیا تھا، اس لیے موجودہ زمانے مین اگر مسلمانون کو تمام قومون کے ساتھ تمدنی ترقی کے میدان مین دوش بدوش چلنا ہے تو ان کو نظری، عملی اور اخلاقی حیثیت سے ایک ایسی زندگی بسر کرنی پڑے گی جو خودی کے اقتضا کے موافق ہو، اور وہ تمدن کی رفتار ترقی کا ساتھ دے سکے، اسی غرض سے ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعرانہ قوت کو خودی کے اثبات کے لیے خاص طور پر وقف کردیا ہے، اور متعدد مقدمات کے ذریعہ اس کو ثابت کرنا چاہا ہے، اور اس دقیق فلسفہ کو جیسا کہ انھون نے مثنوی اسرار خودی کے دیباچہ مین لکھا ہے "فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیون سے آزاد کرکے تخیل کے رنگ مین

رنگین کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ اس کی حقیقت کے سمجھنے اور غور کرنے مین آسانی پیدا ہو"
لیکن اثبات خودی کے یہ تمام رنگین مقدمات مثنوی اسرار خودی مین جن سے ڈاکٹر صاحب کے
اس فلسفہ کی ابتدا ہوئی ہے، مذکور نہین ہین، اس لیے ہم ان کے تمام مجموعہائے کلام سے اخذ
کرکے ان کو اس موقع پر درج کرتے ہین،

اثبات خودی کے مقدمات

خودی اثبات خودی کے مقدمات مین پہلا مقدمہ خود خودی ہے، یعنی یہ کہ خود خودی کوئی
چیز ہے یا نہین؟ اگرچہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ مقدمہ بدیہی ہے، اور خود انسان کے اندر سے ایک
آواز آتی ہے کہ "مین ہون"

من از بود و نبود خود خموشم — اگر گویم کہ ہستم خود پرستم
ولیکن این نوائے سادہ کیست؟ — کسے در سینہ میگوید کہ ہستم

تاہم انھون نے خودی کے وجود پر ایک فلسفیانہ استدلال بھی کیا ہے جسکا خلاصہ یہ ہے کہ
دنیا کی ہر چیز مین شک کیا جاسکتا ہے.

توان گفتن جہانِ رنگ و بو نیست — زمین و آسمان کاخ و کو نیست
توان گفتن کہ خوابے یا فسون است — حجاب چہرۂ آن بیچگون است
توان گفتن ہمہ نیرنگ ہوش است — فریب پردہائے چشم و گوش است

لیکن باینہمہ جو چیز دنیا کی تمام چیزون مین شک کرتی ہے اسکا وجود یقینی ہے،

اگر گوئی کہ من وہم و گمان است — نمودش چون نمودِ این و آن است
بگو با من کہ دارائے گمان کیست؟ — یکے در خود نگر آن بے نشان کیست
خودی پنہان ز حجت بے نیاز است — یکے اندیش و دریاب این چہ راز است

خودی را حق بدان باطل مپندار — خودی را کشتِ بے حاصل مپندار[۵]

لیکن یہ خودی بذاتِ خود پیدا نہین ہوئی ہے، بلکہ اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہے،

خودی را از وجود حق وجودے — خودی را از نمود حق نمودے

نمیدانم کہ این تابندہ گوہر — کجا بودے اگر دریا نبودے

اس موقع پر خدا کی ذات کے لیے انھون نے وہی دریا کا لفظ استعمال کیا ہے جو صوفی شعراء عام طور پر استعمال کرتے ہین، لیکن صوفیون سے اس مسئلہ مین الگ ہو گئے ہین کہ انسان اس دریا کا ایک ناچیز قطرہ ہے بلکہ اس کو گوہر تابندہ قرار دیا ہے، تاکہ خدا کی عظمت وشان کے ساتھ انسان کی خودداری بھی قائم رہے، لیکن دریا اور گوہر دونون لازم و ملزوم ہین، اس لیے انسانی خودی کا وجود خدا کے بغیر ہو ہی نہین سکتا

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبت آشنا طلب — ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

کرا جوئی؟ چرا در پیچ و تابی؟ — کہ او پیداست تو زیر نقابی

تلاش او کنی جز خود نبینی — تلاش خود کنی جز او نیابی

لیکن باوجود اس احتیاج و ارتباط کے وہ مسئلۂ وحدت الوجود کے قائل نہین، بلکہ ان کے نزدیک انسانی خودی خدا کی ذات سے بالکل الگ ایک مستقل چیز ہے،

خودی روشن ز نور کبریائی است — رسائی ہاے او از نارسائی است

جدائی از مقاماتِ وصالش — وصالش از مقامات جدائی است

وصالِ ما وصال اندر فراق است — کشود این گرہ غیر از نظر نیست

گہر گم گشتہ، آغوش دریاست — ولیکن آب بحر آب گہر نیست

اور اس کو اسی انفرادی استقلال کے ساتھ قائم رہنا چاہیے، لیکن صوفیہ کہتے ہین کہ اسکو

---

[۵] ماخوذ از رموز اقبال ص ۹، ۱۰، ۱۱

ذات خداوندی مین جذب ہونا چاہیے، مگر ڈاکٹر صاحب ایک نہایت عمدہ شاعرانہ تشبیہ کے ذریعہ سے یہ ثابت کرتے ہین کہ خودی کو بذات خود قائم رہ کر اپنے فطری اقتضاآت کو پورا کرنا چاہیے، اگر وہ شبنم کا قطرہ ہے تو اس کو پھولون کی پنکھڑیون پر گرنا چاہیے، سمندر مین گر کر موتی نہین بننا چاہیے' اس مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہین کہ لوگون نے شبنم سے کہا،

گفتند فرود آئے زاوجِ مہ و پرویز　　　بر خود زن و با بحرِ پر آشوب بیامیز

با موج در آویز

نقشِ دگر انگیز

تابندہ گہر خیز

لیکن شبنم نے جواب دیا،

من عیشِ ہم آغوشیِ دریا نخریدم　　　آن بادہ کہ از خویش رباید نچشیدم

از خود نرمیدم

ز آفاق پریدم

بر لالہ چکیدم

انسانی خودی کے علاوہ کائنات کی بھی ایک خودی ہے،

ہر چیز ہے محوِ خودنمائی　　　ہر ذرہ شہیدِ کبریائی

اور اجزاے کائنات کی خودی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑھنا، ابھرنا، نشو و نما حاصل کرنا اور اپنی مخفی صلاحیتون کو روبہ کار لانا چاہتی ہے،

چہ لذت یارب اندر ہست و بود است　　　دلِ ہر ذرہ در جوشِ نمود است

شگافد شاخ را چون غنچۂ گل　　　تبسم ریزہ از ذوقِ وجود است

بگرددن فکر تو دارد رسائی | ولے از خویشتن ناآشنائی
یکے بر خود کشا چون دانہ چشمے | کہ از زیر زمین نخلے برآئی

ہر گہر نے صدف کو توڑ دیا | تو ہی آمادۂ ظہور نہیں

کائنات کی خودی کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کی چیزون کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے،

من بگل گفتم بگو اے سینہ چاک | چون بگیری رنگ و بو از باد و خاک
گفت گل اے ہوشمند رفتہ ہوش | چون پیامے گیری از برق خموش (یعنی تار و ریڈیو)
جان بتن ما را ز جذب این و آن | جذب تو پیدا و جاذب ما نہان

(۲) **شرف انسانی**، اثبات خودی کا یہ دوسرا مقدمہ ہے، اگرچہ ہمارے صوفیہ بھی انسان کی فضیلت کو تسلیم کرتے ہین، لیکن ان کے نزدیک نفس انسانیت اس فضیلت کا سبب نہین ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان خدا کا پرتو ہے،

راز دو جہان و مردہ و زندۂ آن | از خود بشنو کہ ترجمانی ہمہ را
ما پرتو نور پادشاہ ازلیم | فرزندۂ ایم آدم و حوا را

لیکن ڈاکٹر صاحب انسان کو خدا سے الگ، جیسا کہ ہم پہلے مقدمہ مین بیان کر چکے ہین ایک مستقل ہستی مانتے ہین، اس لیے ان کے نزدیک اس کو جو شرف حاصل ہے، وہ محض انسانیت ہی کیوجہ سے ہے، اور انسانی فضیلت کا یہی بلند درجہ ہے جس کو ڈاکٹر صاحب نے مختلف شاعرانہ انداز مین بیان کیا ہے،

۱- انسان کو تمام کائنات پر فضیلت حاصل ہے،

عالم آب و خاک و باد سر عیان ہے تو کہ مین | وہ جو نظر سے ہے نہان اسکا جہان ہے تو کہ مین

تو کفِ خاک و بے بصر ہیں کفِ خاک بخود نگر | کشتِ وجود کیلیے آب رواں ہی تو کہ ہیں

۲- وہ فرشتوں پر بھی فضیلت رکھتا ہے، فرشتے اگرچہ آسمان سے بھی پرے رہتے ہیں لیکن انکی نگاہ بھی انسان ہی کا نظارہ کرتی ہے،

فرشتہ گرچہ بروں از طلسمِ افلاک است | نگاہِ او بتماشاے این کفِ خاک است

لیکن انسان کو ان پر جو فضیلت ہے وہ خودی کی وجہ سے ہے،

بہ نوریان زمن پا بگل پیامے گوے | حذر ز مشتِ غبارے کہ خویشتن نگر است

۳- انسان خدا کا اصلی مطلوب ہے، اور وہ اس کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے، اس مضمون کو ڈاکٹر صاحب نے سادہ طور پر یوں بیان کیا تھا،

خدا ہم در تلاش آدمے ہست

لیکن ایک مسلسل غزل میں انھوں نے اس مضمون کو نہایت لطیف شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے، مثلاً صوفی کہتے ہیں کہ ہر چیز میں خدا کا نور جلوہ گر ہے، اور ہم کو ہر چیز میں اس کے جلوہ کو دیکھنا چاہیے، ڈاکٹر صاحب بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس کو الٹ کر کہتے ہیں کہ خدا ہر چیز میں اسلیے جلوہ گر ہوتا ہے کہ انسان کو اس میں تلاش کرے، انسان کو خدا نے کھو دیا ہے، اور اب گوشے گوشے میں اس کو ڈھونڈ رہا ہے،

ما از خداے گم شدہ ایم او بجستجو است | چون ما نیاز مند و گرفتارِ آرزو است

گاہے بہ برگِ لالہ نویسد پیامِ خویش | گاہے درونِ سینۂ مرغان بہاو ہو است

در نرگس آرمید کہ بیند جمالِ ما | چندان کرشمہ دان کہ نگاہش بگفتگو است

آہے سحر گہے کہ زند در فراقِ ما | بیرون و اندرون زبر و زیر و چار سو است

ہنگامہ بست از پئے دیدارِ خاکئے | نظارہ را بہانہ تماشاے رنگ و بو است

پنہان بذرہ ذرہ و ناآشنا ہنوز	پیدا چو ماہتاب و بآغوش کاخ و کو است
در خاکدانِ ما گہرِ زندگی گم است	این گوہرے کہ گم شدہ مائیم یا کہ اوست

(۳) **تسخیر فطرت**، اثبات خودی کا یہ تیسرا مقدمہ ہے، اور پہلے دونون مقدمات کا تتمہ بلکہ نتیجہ ہے، پہلے مقدمہ مین یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کائنات کی خودی اپنے گرد و پیش کی چیزون کو جذب کرتی ہے، اور انسان بھی چونکہ کائنات ہی کا ایک جزو ہے، اس لیے اس مین بھی قدرتی طور پر یہ قوت جاذبہ موجود ہے، لیکن چونکہ وہ کائنات مین، جیسا کہ دوسرے مقدمہ مین ثابت کیا گیا ہے، سب سے بلند تر ہستی ہے، اس لیے اس مین یہ قوت اور بھی کامل ترین طریقے سے پائی جاتی ہے، اور وہ صرف اپنے گرد و پیش کی چیزون ہی کو نہین بلکہ تمام دنیا کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتی ہے،

خودی کی جلوتون مین مصطفائی	خودی کی خلوتون مین کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش	خودی کی زد مین ہے ساری خدائی

جس بندۂ حق بین کی خودی ہو گئی بیدار	شمشیر کے مانند ہے برندہ و براق
اُس مرد خدا سے کوئی نسبت نہین تجھکو	تو بندۂ آفاق ہے وہ صاحب آفاق

دو گیتی را بہ خود باید کشیدن	نباید از حضور خود رمیدن

نگہ دیدہ و خرد پیمانہ آورد	کہ پیماید جہانِ چار سو را
مے آشامے کہ دل کردند نامش	بخویش اندر کشید این رنگ و بو را

کمالِ زندگی خواہی؟ بیاموز	کشادن چشم و جز بر خود نہ بستن
فرو بردن جہان را چون دم آب	طلسم زیر و بالا در شکستن

جہانِ رنگ و بو دانی ولے دل چیست میدانی	مے کز حلقۂ آفاق سازو گرد خود ہالہ

یہی ہمہ گیر خودی کفر و ایمان مین حد فاصل ہے،

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق مین گم ہے　　مومن کی یہ پہچان کہ گم اس مین ہین آفاق

اسی جاذبیت کا دوسرا نام تسخیر فطرت ہے اور اس کی مختلف صورتین ہین،

۱- ایک صورت تو وہ ہے جس مین انسان کی جد و جہد کو کوئی دخل نہین ہے، بلکہ خود خداوند تعالیٰ نے قدرت کی تمام بڑی بڑی طاقتون کو انسان کا مسخر اور فرمانبردار بنا دیا ہے، اور انکے ذریعہ سے انسان پر احسان جتایا ہے" سخر لکم مافی السمٰوٰت ومافی الارض جمیعاً" اور اس قسم کی دوسری آیتون مین تسخیر کی یہی صورت مذکور ہے، اور ڈاکٹر صاحب نے نہایت سادہ طور پر اس کی تشریح اس طرح کی ہے،

نہ تو زمین کے لیے ہے نہ آسمان کیلیے　　جہان ہے تیرے لیے تو نہین جہان کیلیے

لیکن اس مضمون کو ایک مستقل نظم مین نہایت پرجوش شاعرانہ انداز مین بیان کیا ہے،

کھول آنکھ زمین دیکھ، فلک دیکھ فضا دیکھ　　مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

اس جلوۂ بے پردہ کو پردون مین چھپا دیکھ　　ایام جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ

بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ

ہین تیرے تصرف مین یہ بادل یہ گھٹائین　　یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائین

یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر یہ ہوائین　　تھین پیش نظر کل تو فرشتون کی ادائین

آئینۂ ایام مین آج اپنی ادا دیکھ

۲- دوسری صورت وہ ہے جس مین انسان اپنی جسمانی قوت اور سعی و محنت کے ذریعہ سے فطرت کی قوتون کو مسخر کرتا ہے اور اس نظم کے آخری دو بندون مین اسی کی طرف اشارہ ہے،

خورشید جہان تاب کی ضو تیرے شرر مین　　آباد ہے اک تازہ جہان تیرے ہنر مین

پچھتے نہیں بخشو ہوئے فردوس نظر میں | جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ

۳- تیسری صورت وہ ہے جس میں انسان اپنی عقلی طاقت سے فطرت کو مسخر کرتا ہے،

عقل بدام آورد فطرت چالاک را | اہرمن شعلہ زاد سجدہ کند خاک را

اگرچہ ڈاکٹر صاحب نے اکثر مقامات پر عقل کی مذمت کی ہے لیکن اس سے وہ عقل مراد ہے جو محض خیالی پلاؤ پکا کر قوت عمل کو ضعیف کرتی ہے، لیکن جو عقل قوت عمل کو تیز کرتی ہے، وہ اس کے مخالف نہیں، بلکہ موید ہیں، یعنی وہ فلسفہ کے مخالف اور سائنس کے موید ہیں،

زندگی جہد است و استحقاق نیست | جز بعلم انفس و آفاق نیست
گفت حکمت را خدا خیر کثیر | ہر کجا این خیر را بینی بگیر
علم اشیا، علم الاسماستے | ہم عصا و ہم ید بیضاستے
علم اشیا، داد مغرب را فروغ | حکمت او ماست می بندد ز دوغ
جان ما را لذت احساس نیست | خاک رہ جز ریزۂ الماس نیست
علم و دولت نظم کار ملت است | علم و دولت اعتبار ملت است

۴- چوتھی صورت جس میں انسان روحانی طاقت سے فطرت کو مسخر کرتا ہے صرف اولیا و انبیا کے ساتھ مخصوص ہے، اور یہ صورت نہ جسمانی طاقت سے پیدا ہوتی، نہ عقل و علم سے حاصل ہوتی بلکہ صرف عشق سے پیدا ہوتی ہے،

از محبت چون خودی محکم شود | قوتش فرمانده عالم شود
پنجۂ او پنجۂ حق مے شود | ماہ از انگشت او شق مے شود

۵- مسئلۂ خیر و شر، اثبات خودی کا یہ چوتھا مقدمہ ہے، اور اس مسئلہ کے متعلق

حکماے اسلام کے نظریات یہ ہین :

۱- خیر ایجابی اور شر ایک سلبی چیز ہے ،

۲- خیر شر پر غالب ہے ، اور خیر کی تعداد و مقدار شر سے زیادہ ہے ، مثلاً دنیا مین اگرچہ مرض کا وجود ہے لیکن صحت اس سے زیادہ پائی جاتی ہے ، دنیا اگرچہ رنج وغم سے خالی نہین لیکن خوشی اور مسرت کا وجود ان سے زیادہ ہے ، لیکن اس کے بالکل برعکس محمد بن زکریا رازی کے نزدیک شر ایجابی اور خیر سلبی ہے ، یعنی لطف و مسرت کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہین ہے کہ رنج والم زائل ہوجائین ، کھانے پینے کی لذت کے معنی صرف یہ ہین کہ بھوک اور پیاس کی تکلیف سے نجات مل گئی ، یہی حال اور تمام لذتون کا ہے کہ وہ کسی نہ کسی تکلیف اور رنج والم کا ازالہ ہین ، اور شوپنہار کا فلسفہ بھی یہی ہے ، کہ دنیا مین واقعی جو چیزین موجود بالذات ہین وہ دکھ ، مصیبت اور حاجت ہین ، ان سے کبھی وقتی طور پر چھٹکارا مل جایا کرتا ہے ، تو اسی مہلت کا نام انسان نے خوشی یا مسرت رکھ چھوڑا ہے[1] یعنی وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ درد و الم ایجابی ہین ، اور لذت و مسرت محض سلبی ، مسرت یا لذت ہمیشہ کسی خواہش کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے ، خواہش یعنی احتیاج ہر لذت سے پہلے پائی جاتی ہے ، جون ہی خواہش کی تشفی ہوجاتی ہے ، لذت موقوف ہوجاتی ہے ، لہذا تشفی یا مسرت دراصل کسی احتیاج یا درد سے نجات پانی ہے[2] اس بنا پر کائنات کی انتہائی حقیقت کے قلب مین شر ہی شر پایا جاتا ہے ، زندگی کا مایہ خمیر ہی شر ہے ، تمام چیزین شر ہین یعنی جو بھی چیز وجود رکھتی ہے وہ شر ہے[3]

شرح اشارات مین امام رازی نے بھی زکریا رازی کی تائید کی ہے ، اور لکھا ہے کہ عام طور پر جو چیز دنیا مین پائی جاتی ہے وہ یا تو رنج والم ہے یا رنج والم کا ازالہ ہے ، ان مین بعض آلام تو نہایت

---

[1] شوپنہار از مجنون گورکھپوری ، ص ۱۰۲ [2] قنوطیت یعنی فلسفہ یاس از میر ولی الدین ص ۳ [3] ایضاً ص

قوی ہوتے ہین، مثلاً امراض، اور بعض ضعیف جن سے انسان کو کسی حالت مین نجات نہین مل سکتی مثلاً غم وفکر، خوف واندیشہ، غصہ وندامت، روزی اور کاروبار کی فکر، بدبو، ناگوار چیزون کا دیکھنا، مکھی، مچھر اور کھٹملون کی تکلیفین جن کا کوئی شمار نہین کیا جا سکتا، اس سے حکما کے دونون پہلے نظریے غلط ثابت ہوتے ہین، یعنی نہ خیر ایجابی ہے نہ خیر شر پر غالب ہے، بلکہ اس کے برخلاف رنج والم کو لذتون پر غلبہ حاصل ہے، اس لیے ایسی دنیا کا تصور ناممکن ہے جہان روحین ترقی وتکمیل پا کر شخصیت کا تحقق تو کر سکین، لیکن جہان نہ درد وغم ہو اور نہ رنج وتعب، نہ حزن و ابتلا ہو اور نہ آزمایش وبلا، غیر تشفی خواہشات، ان کی سوزش وتکلیف، امراض و قوائے فطری کی کورانہ بیرخی سے پیدا ہونے والی اذیتین، آسمانی بلائین وآفتین، یہ سب محرکات ہین جو انسان کے صبر وہمت کو آزماتے ہین، اس کو مصائب کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کرتے ہین، بھوک، جنسی محبت، پدری شفقت، اجتماعی واکتسابی جبلتون کے بغیر انسان نہ فطرت پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے، اور نہ شخصیت کا تحقق کر سکتا ہے، اس کی ابتدائی اشتہائیت اس کو محنت ومشقت پر آمادہ کرتی ہین، اور محنت ومشقت سے سائنس کے اور راحت کے سامان پیدا ہوتے ہین، اور یہ فطرت پر زیادہ غلبہ کا باعث ہوتے ہین، اور یہی فن، ادب، سائنس اور حیات معاشری کے لطیف اغراض وغایات کے نشو ونما وتشفی کا سبب بنتے ہین، اس کی خواہشات اس کو خاندان وجماعت کی تخلیق پر آمادہ کرتی ہین، بیماری اور خشکی، سمندر اور ہوا کی معاندانہ قوتون کا مقابلہ اس کی فکر، عمل اور معاشری اشتراک کی قوتون کو ترقی دیتا ہے، ہماری مشترکہ قسمت گو صبر وعمل کے دائرہ سے بھی باہر کیون نہ ہو، دوستی ومحبت کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے، اس طرح انسان ظاہرا شکست سے فتحمندی حاصل کرتا ہے، ان قوتون پر غلبہ وتسلط پاتا ہے، جو اسکے خلاف برسر جنگ نظر آتی ہین،[1]

[1] قنوطیت از میر ولی الدین ص ۱۰۰،

۱- اس بنا پر تخلیق انسانی کا مقصد حصول لذت نہین

مقام پرورش آہ و نالہ ہے یہ چمن | نہ سیر گل کیلیے ہے نہ آشیان کیلیے

ترا از خویشتن بیگانہ سازد | من آن آبِ طربناکے ندارم
بباز ارم مجو دیگر متاعے | چو گل جز سینۂ چاکے ندارم

۲- بلکہ خودی کا تحقق، کمال اور نشو و نما ہے، اور یہ تمام چیزین شر یعنی مصیبت اور رنج والم سے حاصل ہوتی ہین

اے لالہ، اے چراغ گلستان و باغ و راغ | درمن نگر کہ میدہم از زندگی سراغ
داغے بسینہ سوز کہ اندر شب وجود | خود را شناختن نتوان جز باین چراغ
اے موج شعلہ سینہ بباد صبا کشاے | شبنم مجو کہ میدہد از سوختن فراغ

درمان ز درد ساز اگر خستہ تن شوی | خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی

غزالے باغزالے دردِ دل گفت | ازین پس درحرم گیرم کنامے
بصحرا صید بندان در کمین اند | بکام آہوان صبحے نہ شامے
امان از فتنۂ صیاد خواہم | دلے ز اندیشہ ہا آزاد خواہم
رفیقش گفت اے یارِ خردمند | گر خواہی حیات اندر خطر زی
دمادم خویشتن را بر فسان زن | ز تیغ پاک گوہر تیز تر زی
خطر تاب و توان را امتحان است | عیارِ ممکناتِ جسم و جان است

لیکن با اینہمہ خدا پر یہ الزام عائد نہین ہوسکتا کہ اس نے شر کو پیدا کرکے انسان کو بتلاے آلام کیون کردیا، کیونکہ

۳- اصل فطرت اور مشیت الہی مین خیر و شر کچھ نہین ہے

چہ گویم نکتۂ زشت و نکو چیست | زبان لرزد کہ معنی پیچدار است
برون از شاخ بینی خار و گل را | درون او نہ گل پیدا نہ خار است

بلکہ عالم خارجی مین جب خودی تسخیر فطرت مین مصروف عمل ہوتی ہے تو خیر و شر کا امتیاز پیدا ہوتا ہے،

گہے خارنیش زن را ز گل امتیاز کردن | گہے جز یکے ندیدن بہ ہجوم لالہ زارے

کیونکہ جو چیزین تسخیر فطرت مین خودی کی معاون ہوتی ہین ان کو وہ خیر، اور جو چیزین مزاحم ہوتی ہین ان کو شر سمجھتی ہے، اس لیے خودی معیار خیر و شر ہے،

نمود جس کی فراز خودی سے ہو وہ جمیل | جو ہو نشیب مین پیدا قبیح و نا محبوب

۴- لیکن خیر و شر کا یہ امتیاز عقل سے ہوتا ہے، امام رازی نے لکھا ہے کہ اشاعرہ کے اصول کے مطابق خیر و شر کا مسئلہ پیدا ہی نہین ہوتا، کیونکہ ان کے نزدیک عقلاً کوئی چیز نہ بری ہے نہ بھلی، شریعت جس چیز کو اچھا کہدیتی ہے وہ اچھی اور جس چیز کو برا کہدیتی ہے وہ بری ہو جاتی ہے، لیکن معتزلہ حسن و قبح عقلی کے قائل ہین یعنی ان کے نزدیک خود عقل نیک و بد کا امتیاز کرتی ہے اسلیے ان کے نزدیک عقلاً خیر و شر کا وجود ہے، اور ڈاکٹر صاحب نے بھی معتزلہ کی رائے اختیار کی ہے، چنانچہ خدا کو مخاطب کر کے کہتے ہین

غلامم جز رضائے تو نجویم | جز آن راہے کہ فرمودی نپویم
ولیکن گر باین نادان بگوئی | خرے را اسپ تازی گو نگویم

۵- دنیا مین اصل وجود شر کا ہے اور اسی شر کے ازالہ کا نام خیر ہے، یعنی شر وجودی اور خیر سلبی چیز ہے،

مرغے ز آشیانہ بسیر چمن پرید | خارے ز شاخ گل بہ تن نازکش خلید
بدگفت فطرت چمن روزگار را | از درد خویش و ہم ز غم دیگران تپید

نالید تا بحوصلۂ آن نوا طراز — خون گشت نغمہ و ز دو چشمش فروچکید

یہ مرغ ستم زدہ شوپنہار ہے،

سوز فغان او بدل ہدہدی گرفت — با نوک خویش خار ز اندام او کشید

گفتش کہ سود خویش ز جیب زیان برآر — گل از شگافِ سینہ زر ناب آفرید

یہ ہدہد نطشے ہے،

۲- شوپنہار بھی لذت و راحت کا منکر نہین مگر وہ آنی چیز ہے، قیام و بقا صرف شر کو ہے،

سحر میگفت بلبل باغبان را — درین گل جز نہالِ غم نگیرد

بہ پیری می رسد خار بیابان — ولے گل چون جوان گردد بمیرد

اس لیے زود فنا لذت و مسرت اس کے نزدیک اس عالمگیر، قائم و ثابت فطرتی شر کا بدل نہین ہو سکتی، اور اس سے نجات کا ذریعہ صرف یہ ہے کہ اس میدان ہی سے پانون ہٹا لیا جائے، عیسائی راہبون اور ہمارے صوفیون کا نظریہ بھی یہی ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب اس کو شکست سمجھتے ہین،

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی مین — بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست

فقیہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور — کہ معرکے ہین شریعت کے جنگ دست بدست

گریز کشمکشِ زندگی سے مردون کی — اگر شکست نہین ہے تو اور کیا ہے شکست

اس لیے وہ مردانہ وار شر کا خیر مقدم کرتے ہین،

کجا این روزگارے شیشہ بازے — بہشت این گنبد گردان ندارد

ندیدہ درد زندان یوسف او — زلیخایش دلِ نالان ندارد

خلیلِ او حریف آتشے نیست — کلیمش یک شرر در جان ندارد

بصرصر در نیفتد زورق او — خطر از لطمۂ طوفان ندارد

یقین را در کمین بودِ دگر نیست — وصال اندیشۂ ہجران ندارد

کجا آن لذت عقل غلط سیر — اگر منزل رہ پیچان ندارد

مزی اندر جہان کور ذوقے — کہ یزدان دارد و شیطان ندارد

ہین عقدہ کشا بہ خار صحرا — کم کرگلۂ برہنہ پائی

کیونکہ اس سے خودی کی تکمیل ہوتی ہے،

(۵) روح و جسم کا اتحاد، اثبات خودی کا یہ پانچوان مقدمہ ہے، اور مسئلہ خیر و شر سے تعلق رکھتا ہے، چوتھے مقدمہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ دنیا خیر و شر کی ایک رزمگاہ ہے، اور ڈاکٹر صاحب اس رزمگاہ سے پانون پیچھے نہین ہٹاتے بلکہ اسی جنگ کو زندگی سمجھتے ہین،

سکندر با خضر خوش نکتۂ گفت — شریک سوز و ساز بحر و بر شو

تو این جنگ از کنار عرصہ بینی — بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا — نوائے زندگانی نرم خیز است

بدریا غلط و با موجش درآویز — حیات جاودان اندر ستیز است

لیکن جنگ کیلیے طاقت کی ضرورت ہے، اور نٹشے کے خیال مین طاقت ہی خیر و شر کا معیار ہے،

دوش رفتم بہ تماشاے خرابات فرنگ — شوخ گفتاری رندے ولم از دست ربود

گفت این نیست کلیسا کہ بیابی در وے — صحبت دخترک زہرہ وش و نائے و سرود

این خرابات فرنگ است و ز تاثیر مئش — انچہ مذموم شمارند نماید محمود

نیک و بد را بترازوے دگر سنجیدیم — چشمۂ داشت ترازوے نصاری و یہود

خوب زشت است اگر پنجۂ گیرات شکست — زشت خوب است اگر تاب و توان تو فزود

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اگرچہ خیر و شر کا معیار قوت نہیں بلکہ خودی ہے، جو قوت سے زیادہ وسیع اور عام چیز ہے، تاہم وہ بھی زندگی کے لیے جسمانی قوت کو ضروری سمجھتے ہیں، کیونکہ

چمن خوش است ولیکن چو غنچہ نتوان زیست
قبائے زندگیش از دم صبا چاک است

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساران زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

گفت با الماس در معدن زغال
اے امینِ جلوہ ہائے لازوال

ہمدمیم و ہست و بود ما یکیست
در جہان اصل وجود ما یکیست

من بکان میرم ز درد ناکسی
تو سرِ تاجِ شہنشاہان رسی

گفت الماس اے رفیق نکتہ بین
تیرہ خاک از پختگی گردد نگین

تا بہ پیرامون خود در جنگ شد
پختہ از پیکار مثلِ سنگ شد

خوار گشتی از وجودِ خامِ خویش
سوختی از نرمیٔ اندامِ خویش

فارغ از خوف و غم و وسواس باش
پختہ مثلِ سنگ شو الماس باش

در صلابت آبروئے زندگی است
ناتوانی، ناکسی، ناپختگی است

طائرے از تشنگی بیتاب بود
در تن او دم مثالِ موجِ دود

ریزۂ الماس در گلزار دید
تشنگی نظارۂ آب آفرید

تا یہ اندوز نم از گوہر نشد
ز و برو منقار و کامش تر نشد

گفت الماس اے گرفتارِ ہوس
تیز بر من کردہ منقارِ ہوس

قطرۂ آبے نیم ساقی نیم
من برائے دیگران باقی نیم

آب من منقارِ مرغان بشکند
آدمی را گوہرِ جان بشکند

طائر از الماس کامِ دل نیافت
روئے خویش از ریزۂ تابندہ تافت

قطرۂ شبنم سر شاخ گلے | تا فت مثل اشک چشم بلبلے
مرغ مضطر زیر شاخ گل رسید | در دہانش قطرۂ شبنم چکید
ایکہ میخواہی ز دشمن جان بری | از تو پرسم قطرۂ یا گوہری
چون ز سوز تشنگی طائر گداخت | از حیات دیگرے سرمایہ ساخت
قطرہ سخت اندام و گوہر خو نبود | ریزۂ الماس بود و او نبود
غافل از حفظ خودی یکدم مشو | ریزۂ الماس شو شبنم مشو
پختہ فطرت صورت کہسار باش | حامل صد ابر دریا بار باش
خویش را دریاب از ایجاب خویش | سیم شو از بستن سیماب خویش

لیکن انکے بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ روحانی قوت پر اعتقاد رکھتے ہین، لیکن اس تضاد کو اسطرح رفع کیا جاسکتا ہے کہ

۱- ڈاکٹر صاحب کے نزدیک جسمانی قوت سے روحانی قوت حاصل ہوتی ہے، صوفیون اور راہبون کا خیال ہے کہ جسم کو جسقدر ضعیف کیا جائے اسی قدر روح طاقتور ہوتی ہے، اسلیے وہ مجاہدہ، ریاضت، اور روزہ و گرسنگی سے جسم کی طاقت کو زائل کرتے ہین، لیکن اس کے برعکس ڈاکٹر صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ جسم کی طاقت سے خود روح طاقتور ہوتی ہے،

تو گوئی طائر ما زیر دام است | پریدن بر پر و بالش حرام است
ز تن بر جستہ تر شد معنیٔ جان | فسان خنجر ما از نیام است

۲- اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ روح و جسم دونون کو، جیسا کہ ہمارے متکلمین کا مذہب ہے، ایک تسلیم کرتے ہین، اور اس صورت مین جسمانی اور روحانی طاقت ایک ہوجاتی ہے، اگرچہ ڈاکٹر صاحب نے بعض موقعون پر اس کے خلاف بھی رائے ظاہر کی ہے،

ندانم بادہ ام یا ساغرم من | گہر در دامنم یا گوہرم من

چنان بنیم چو بر دل دیده بندم　　　کہ جانم دیگر است و دیگرم من

تاہم ان کا اصلی میلان اسی طرف ہے کہ روح و جسم مین مغایرت نہین، بلکہ اتحاد ہے،
چنانچہ مثنوی گلشن راز جدید مین اس کو نہایت صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے،

تن و جان را دو تا گفتن کلام است　　　تن و جان را دو تا دیدن حرام است

(۶) **مسئلۂ جبر و اختیار**، اثبات خودی کا یہ چھٹا مقدمہ ہے اور تمام مقدمات سے زیادہ
اہم ہے، کیونکہ خودی کے تحقق و نشو و نما کے لیے قدرت اور اختیار لازمی ہے، لیکن یہ مسئلہ جسقدر
اہم ہے اسی قدر پیچیدہ بھی ہے، اور اس پیچیدگی کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو دو نسبتین حاصل
ہین ایک نسبت تو اس کو خدا کے ساتھ ہے، اور اس حیثیت سے وہ خدا کے مقابل مین ایک
ہیچ، عاجز، درماندہ اور بے بس و مجبور ہستی ہے اور ڈاکٹر صاحب نے بھی اس حیثیت سے خدا کے سامنے
نہایت نیازمندی کے ساتھ اپنے عجز و مجبوری کا اعتراف کیا ہے، اور وہ خدا کو مخاطب کر کے کہتے ہین

مرغ خوش لہجہ و شاہین شکاری از تست　　　زندگی را روش نوری و ناری از تست

ہمہ افکار من از تست چہ در دل چہ بلب　　　گہر از بحر برآری و نہ برآری از تست

من ہمان مشت غبارم کہ بجائے نہ رسد　　　لالہ از تست و نم ابر بہاری از تست

نقش پردازِ توئی ما قلم افشا نیم　　　حاضر آرائی و آیندہ نگاری از تست

انسان کا نوشتۂ تقدیر خود خدا کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، "جف القلم بما ہو کائن" اور
انسان کو اسی راستے پر چلنے کی کوشش کرنی چاہیے، لیکن یہ کوشش بھی خدا ہی کے اختیار مین ہے،

تو بلوح سادۂ من ہمہ مدعا نوشتی　　　دگر آن چنان ادب کن کہ غلط نخوانم او را

لیکن دوسری نسبت اسکو خدا کے علاوہ تمام کائنات کے ساتھ ہے، اور اس حیثیت سے تمام کائنات کے مقابل مین بالکل خودمختار
اور آزاد نظر آتا ہے، سلسلۂ کائنات مین ایک ذرہ سے لیکر آفتاب و ماہتاب تک ایک خاص

قانون کے پابند ہیں، اور اس محدود دائرے سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے، لیکن ان کے مقابل میں انسان کی قدرت، اختیار اور ایجاد و اختراع کی کوئی حد ہی نہیں،

دم مرا صفت باد فرودین کردند　　گیاہ را ز سرشکم چو یاسمین کردند
نمود لالۂ صحرا نشین ز خونابم　　چنانکہ بادۂ لعلے بساتگین کردند
فروغ آدم خاکی ز تازہ کاری ہاست　　مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازین کردند

اسی تازہ کاری کا دوسرا نام تخلیق ہے اور ڈاکٹر صاحب نے اس میں اس قدر مبالغہ کیا ہے کہ انسان کو فعل تخلیق میں خود خدا کا شریک بنا دیا ہے،

جہان او آفرید، این خوبتر ساخت　　مگر با ایزد انباز است آدم

لیکن یہ شاعرانہ اپج ہے، ورنہ فلسفیانہ حیثیت سے انھوں نے جبر و اختیار کے درمیان ایک متوسط نظریہ اختیار کیا ہے، اور تخلیق کے دو حصے کر دیے ہیں، ایک تخلیق کا تعلق مادیات اور عالم جسمانی سے ہے، اور اس تخلیق میں انسان خدا کا شریک نہیں، آفتاب و ماہتاب، زمین و آسمان، کوہ و دریا، شجر و حجر، حیوانات، نباتات اور معدنیات سب خدا کے پیدا کیے ہوئے ہیں، اور انکی تخلیق میں انسان بالکل عاجز و مجبور ہے، وہ ایک ذرہ کو بھی نہیں پیدا کر سکتا، اس لیے اس کو مختار، قادر اور آزاد نہیں کہہ سکتے، لیکن مادیات و جسمانیات کا ذرہ ذرہ غیر منظم حالت میں بکھرا ہوا پڑا ہے، ہر جگہ انتشار، بے ترتیبی اور نشیب و فراز ہے، اور خود ان مادیات و جسمانیات میں ترتیب و تنظیم کی قدرت نہیں، یہ صرف انسان ہے جو ان میں ترتیب و تنظیم پیدا کرتا ہے، اسلیے عالم مادی اور عالم جسمانی اپنی ترتیب و تنظیم کے لیے انسان کی آغوش میں پناہ لیتا ہے،

جہان کز خود ندارد دستگاہے　　بکوے آرزوے جستہ راہے
ز آغوش عدم وزدیدہ بگریخت　　گرفت اندر دل آدم پناہے

اب اس کی حیثیت ایک طفلِ شیر خوار کی ہو جاتی ہے اور انسان اس کی پرورش کر کے اسکو ایک حسین وجمیل جوان بنا دیتا ہے، اور اسی تربیت وپرداخت کی بنا پر وہ خدا کے سامنے یہ دعویٰ کرتا ہے

تو شب آفریدی چراغ آفریدم | سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان وکہسار وراغ آفریدی | خیابان وگلزار وباغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم | من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

صرف اسی عالم کی تخصیص نہیں بلکہ عالم اخروی بھی انسان ہی کے اعمال وافعال کا پیدا کیا ہوا ہے، جنت ودوزخ کو صرف انسان کے کفر واسلام نے پیدا کیا ہے، اس لیے وہ نہایت بلند آہنگی کے ساتھ کہہ سکتا ہے،

این جہان چیست؟ صنم خانۂ پندارِ من است | جلوۂ او گرو دیدۂ بیدارِ من است
ہمہ آفاق کہ گیرم بنگاہے اورا | حلقۂ ہست کہ از گردشِ پرکارِ من است
ہستی ونیستی از دیدن ونادیدنِ من | چہ زمان وچہ مکان شوخیٔ افکارِ من است
از فسون کاریٔ دل، سیر وسکون غیب وحضور | این کہ غماز وکشایندۂ اسرارِ من است
آن جہانے کہ درو کاشتہ را می درو ند | نور ونارش ہمہ از سبحہ وزنارِ من است
ساز تقدیرم وصد نغمۂ پنہان دارم | ہر کجا زخمۂ اندیشہ رسد تارِ من است
اے من از فیض تو پایندہ نشانِ تو کجاست | این دو گیتی اثرِ ماست جہانِ تو کجاست

اب اس تخلیق کی بنا پر انسان کو مجبور بھی نہیں کہہ سکتے، اس لیے وہ نہ مجبور ہے نہ مختار، بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک متحرک زندہ طاقت ہے،

سراپا معنیٔ سربستہ ام من | نگاہ حرف بافان برنتابم
نہ مختارم توان گفتن نہ مجبور | کہ خاکِ زندہ ام در انقلابم

اسی متحرک اور زندہ طاقت ہونے کی وجہ سے انسان اپنے اعمال وافعال مین آزاد اور اس کا ذمہ دار ہے اور اسی عملی آزادی کی بنا پر انسانی خودی کی نشو و نما ہوتی ہے،

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہین رہتی ہو جس کے جوانون کی خودی صورتِ فولاد

ناچیز جہانِ مہ و پروین ترے آگے وہ عالم مجبور ہے تو عالمِ آزاد

(۷) **تخلیق مقاصد**، اثبات خودی کا یہ ساتوان مقدمہ ہے، جو لوگ ترک دنیا کی تعلیم دیتے ہین ان کے نزدیک دنیوی جھگڑون سے نجات پانے کی صورت صرف یہ ہے کہ خواہشات نفسانی کا خاتمہ کر دیا جائے، شوپنہار کے فلسفہ کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ "دنیا ایک خراب آباد" یا زندون کی دوزخ ہے، ہر طرف ایک ہلچل مچی ہوئی ہے، ہر چیز اپنی اپنی غرض پوری کرنے کی فکر مین لگی ہوئی ہے، اور ہاتھ پانون پھینک رہی ہے، انسان بھی اپنی نفسانیت کا غلام ہے، اس کے اندر بھی طرح طرح کی اندھی خواہشین ہنگامہ برپا کئے ہوئے ہین، زندگی کی بنیاد خودغرضی اور نفسانیت پر ہے، اور پھر ستم ظریفی یہ ہے کہ باوجود اس دوڑ دھوپ کے، باوجود اس جد و جہد کے ہم اپنی خواہشون مین آخر کار ناکام رہتے ہین، اس لیے ہمارے اندر زندگی کی جو خواہش ہے اسکو مٹا دینا چاہیے،[1]

بودھ کی تعلیم کا اصل الاصول بھی یہی ہے کہ انسان ہر خواہش سے پاک ہو جائے اور ہمارے صوفیہ کی تعلیم بھی یہی ہے کہ

از کار جہان تمام انکار خوش است این کار اگر کنی تو بسیار خوش است

خود را بہ کنار گیر دبگزر زہمہ در عالم تدبیر ہمین کار خوش است

اور اس مین کوئی شبہہ نہین کہ اگر خواہشاتِ نفسانی فنا ہو جائین تو زندگی بڑی پر سکون اور پرکیف ہو جاتی ہے، اسی بنا پر ایک شاعر کہتا ہے،

---

[1] ماخوذ از شوپنہار مصنفہ مجنون گورکھپوری،

ترکِ لذت بھی نہین لذت سو کم　　　کچھ مزا اس کا بھی چکھا چاہیے

خواہشاتِ نفسانی کے پورے ہونے سے جو لذت حاصل ہوتی ہے، وہ نہایت زود فنا، اور آنی ہوتی ہے، لیکن ترکِ خواہش یا ترکِ لذت سے جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ نہایت دیرپا بلکہ لازوال ہوتی ہے، انسان کو دنیا کی تکلیفون اور مصیبتون کا احساس نہین ہوتا، خیر و شر اور رنج و الم کا امتیاز اٹھ جاتا ہے، اور زہر بھی تریاق کا مزہ دینے لگتا ہے، تسلیم و رضا کا مسئلہ اسی ترک خواہش سے پیدا ہوتا ہے، یا تسلیم و رضا سے خواہشین اور آرزوئین رضاے الٰہی مین فنا ہوجاتی ہین، اس بنا پر جس شخص کی یہ حالت ہوجاتی ہے گویا دنیا کا تمام کاروبار اس کے اشارون پر چلنے لگتا ہے

سیل وجوہا بمراد او روند　　　اختران زان سان کہ او خواہد شوند

بے مراد او نجنبد ہیچ اگر　　　درجہان ز اوجِ ثریا تا سمک

اور ڈاکٹر صاحب بھی شخصی طور پر اس پر کیف زندگی سے لذت اندوز ہونا چاہتے ہین،

این دل کہ مراد اوہی لبریز یقین بادا　　　این جام جہان بینم روشن تر ازین بادا

تلخے کہ فرو ریزد گردون بسفال من　　　در کام کہن رندے آنہم شکرین بادا

اسلام نے اپنی جامعیت کی بنا پر اپنی تعلیمات مین سلب و ایجاب کے دونون پہلوون کو جمع کرلیا ہے، اور اس مسئلہ مین بھی اس کی تعلیم کی یہ خصوصیت موجود ہے، خواہشون کی ایک قسم ایسی ہے، جس سے خودی تباہ و برباد ہوجاتی ہے، اس سے دنیا کی تعمیر نہین ہوتی بلکہ تخریب ہوتی ہے، اسی قسم کی خواہشون کا نام "ہوی" ہے، اور اسلام نے اسی قسم کی بری خواہشون کے زائل کرنے کی تعلیم دی ہے،

ومن اضل ممن اتبع ھویٰہ　　　اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے، جس نے

بغیر ھدی من اللہ　　　خدا کی رہنمائی کے بغیر اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کی

افرایت من اتخذ الٰھہ ھویٰہ　　　اے پیغمبر کیا تو نے اسکو نہین دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنا رکھا ہے،

لیکن ان کے علاوہ بہت سی پاکیزہ، مفید اور بلند خواہشیں بھی ہیں جن سے تہذیب نفس ہوتی ہے، نظام عالم قائم رہتا ہے، اور ان کے ذریعہ سے خودی کو اپنی نشو و نما کے لیے ایک وسیع فضا مل جاتی ہے، اس لیے اسلام نے ان خواہشوں کے پیدا کرنے اور انکے پورا کرنے کا حکم دیا ہے، حدیث میں ہے،

ان اللہ یحب معالی الامور و یبغض سفسا فہا — بیشک خدا بلند کاموں کو پسند اور حقیر کاموں کو ناپسند کرتا ہے،

یہی خواہشیں ہیں جن سے انسان کی خودی کو نشو و نما ہوتی ہے، اس لیے ڈاکٹر صاحب نے ان کے پیدا کرنے کی تعلیم دی ہے،

زندگانی را بقا از مدعاست — کاروانش را درا از مدعاست
زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصل او در آرزو پوشیدہ است
آرزو ہنگامہ آرائے خودی — موج بیتابے ز دریائے خودی
آرزو صید مقاصد را کمند — دفتر افعال را شیرازہ بند
زندہ را نفی تمنا مردہ کرد — شعلہ را نقصان سوز افسردہ کرد
نے گرفت از نیستان آئین خویش — نغمہ زو از لذتِ تعیینِ خویش
اے ز راز زندگی بیگانہ خیز — از شراب مقصدے مستانہ خیز
مقصدے مثل سحر تابندۂ — ماسوی را آتشِ سوزندۂ
مقصدے از آسمان بالاترے — دلربائے، دلستانے، دلبرے
باطلِ دیرینہ را غارتگرے — فتنہ در جیبے سراپا محشرے
ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم — از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

آرزو را در دل خود زندہ دار　　تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار

(۸) **صحرائیت و بدویت**۔ اثباتِ خودی کا یہ آٹھواں مقدمہ ہے، لیکن اس سے وحشیانہ زندگی مقصود نہیں بلکہ تمدن و تہذیب کے مضر اثرات سے محفوظ رہ کر خودی کی تربیت مقصود ہے،

وحشت نہ سمجھ اس کو اے مردکِ میدانی　　کہسار کی خلوت ہے تعلیمِ خود آگاہی

یورپ میں روسو بھی تہذیب و تمدن کا سخت مخالف تھا، اور اس کے نزدیک انسان کی ابتدائی فطری حالت ہی بہتر تھی۔ ڈاکٹر صاحب بھی بعض معاملات میں اس کے ہم خیال ہیں، چنانچہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم لکھتے ہیں:

اقبال بعض معاملات میں روسو کے مانند ہے، وہ چاہتا ہے کہ پھر سے عہدِ نبوی کے شاندار شب و روز آجائیں، اس کے تمام خیالات اسی ایک خواب کی تعبیر ہیں، روسو فطرت کی طرف جانا چاہتا ہے، اقبال دشتِ حجاز پر مٹا ہوا ہے، اس کا دل دکھتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ مسلمان تہذیبِ حاضرہ کے تصنع اور چمک دمک سے متاثر ہوتے جا رہے ہیں، جس میں سطحیت اور تعیش کے سوا کچھ نہیں، اسلامی روایات عربی ہیں اس لیے انھیں اپنے شریفانہ جذبات اور قدرتی فطانت کو برقرار رکھنا چاہیے، یورپ کی نقل کسی طرح سود مند نہیں ہوسکتی، جیسا کہ ایرانی اوضاع و اطوار نے ماضی میں کچھ فائدہ نہیں پہنچایا، غیر ملکی خیالات کا مبالغہ آمیز اور غلامانہ تتبع ہر ایک قوم کے لیے مہلک ثابت ہوا ہے،[۵۱]

ایک دوسرا مضمون نگار لکھتا ہے:

اقبال ہر حال اور منزل پر وہی تیرہ سو برس پہلے کا حدی خوان، شتربان اور عرب بدو ہی

---

[۵۱] نیرنگِ خیال اقبال نمبر ص ۱۳۸، ۱۳۹

وہ اپنے اونٹ کی نکیل ہاتھ میں لے کر مغرب اور مشرق کے آسمانون کے نیچے سربلند گذرنا چاہتا ہی،
اور اپنی ملت کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا ہے[۵]

ڈاکٹر صاحب نے صحرائیت اور بدویت کی جو تعلیم دی ہے اسکے وجوہ حسب ذیل ہین،

۱- ایک تو یہ کہ مسلمانون کا اصلی مولد و منشا ہی صحرائے عرب ہے، اس لیے ان کو قدرتی طور پر صحرائیت کی طرف مائل ہونا چاہیے، زبورِ عجم مین انھون نے ابہام و اجمال کے ساتھ اس خیال کو اس طرح ظاہر کیا ہے،

لالۂ صحرایم از طرف خیابانم برید | در ہوائے دشت و کہسارِ بیابانم برید
روبہی آموختم از خویش دور افتادہ ام | چارہ پردازان بآغوشِ نیستانم برید

وہ اپنی غزلون مین عرب کے مشہور معشوقون کا نام جو نہایت دلچسپی سے لیتے ہین، اس سے اسی عرب و حجاز کے خطہ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے، انھون نے یورپ سے شیخ عبدالقادر کو جو پیغام دیا تھا؛

رختِ جان بتکدۂ چین سے اٹھالین اپنا | سب کو محوِ رخِ سعدی و سلیمیٰ کردین

اس سے یہی عرب و حجاز کا خط مقصود تھا، لیکن انھون نے صرف انھی تلمیحات و اشارات پر قناعت نہین کی ہے بلکہ نہایت وضاحت کے ساتھ بتلا دیا ہے کہ وہ قوم کو صحرائے عرب کی سادہ زندگی اور سادہ اخلاق کی دعوت دیتے ہین،

تا شعار مصطفےٰ از دست رفت | قوم را رمزِ بقا از دست رفت
آن نہالِ سربلند و استوار | سیرتِ صحرائی اشتر سوار
پائے تا در وادی بطحا گرفت | تربیت از حدتِ صحرا گرفت

---

[۵] نیرنگ خیال اقبال نمبر ص ۱۱۰

رخت ہستی از عرب برچیدۂ — در خمستان عجم خوابیدۂ

شل ز برفاب عجم اعضاے او — سرد تر از اشک او صہباے او

داستانے گفتم از یاران نجد — نکہتے آوردم از بستان نجد

محفل از شمع نوا افروختم — قوم را رمز حیات آموختم

ان اشعار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ محض اخلاقی وجوہ سے ان کا میلان عرب کی طرف ہے کیونکہ عرب کی سادہ، صحرائی اور بدویانہ زندگی ہی نے دور اول کے مسلمانون مین فاتحانہ اخلاق پیدا کیے تھے، اور در اخیر مین عجمی اثرات نے ان کو تعیش وترہب کی طرف مائل کرکے ان اخلاق کو فنا کر دیا، قومیت اور وطنیت کا محدود جذبہ اس کا محرک نہین ہے، جیسا کہ بعض لوگون نے غلط طور پر سمجھا ہے

۲- صحرائی زندگی بالکل نیچرل اور فطری ہوتی ہے، کسی چیز مین تکلف وتصنع کا شائبہ نہین ہوتا، اس لیے اخلاق، مذہب اور معاشرت سب اپنی اصلی حالت مین قائم رہتے ہین، اور فطرت کا جو منشا ہے وہ پورا ہوتا رہتا ہے، لیکن مہذب ومتمدن زندگی کی مصنوعی لطافت ونزاکت فطری قوتون کو ضعیف کر دیتی ہے، اس لیے ایک متمدن انسان مین وہ جوش وولولہ نہین ہوتا جو صحرانشینون مین عموماً پایا جاتا ہے،

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی — یا بندۂ صحرائی یا مرد کہستانی

دنیا مین محاسب ہے تہذیب فسونگر کا — ہے اسکی فقیری مین سرمایۂ سلطانی

یہ حسن ولطافت کیون؟ وہ قوت وشوکت کیون؟ — بلبل چمنستانی شہباز بیابانی

اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن — بنتی ہے بیابان مین فاروقی وسلمانی

اس لیے تہذیب وتمدن کی نازک، لطیف اور رنگین زندگی انسان کی ترقی کو روک دیتی ہے۔

تو اے شاہین نشیمن در چمن کردی ازان ترسم — ہواے او بیال تو دہد پرواز کوتاہے

۳- متمدن زندگی بظاہر نہایت مسرور معلوم ہوتی ہے، لیکن درحقیقت اس کا سرمایہ رنج و غم کے سوا اور کچھ نہین ہوتا، چنانچہ آجکل مہذب دنیا مین زندگی کی مصیبت اور تکان کا احساس ناقابل برداشت طور پر بڑھا ہوا ہے، لیکن اولاً تو ایک صحرانشین آدمی مین قوت برداشت بہت زیادہ ہوتی ہے، اور اس کی خواہشین اور حاجتین بہت کم ہوتی ہین، اس لیے وہ قدرتی طور پر مہذب آدمی سے زیادہ مسرور زندگی بسر کرتا ہے، اور اس کی خودی مین تکان کے بجائے نشاط زیادہ پایا جاتا ہے،

نغمہ پردازی ز جوے کوہسار آموختم　　　　در گلستان بودہ ام یک نالہ درد آلود نے

۴- صحرا کی اسی بے سروسامان، نشاط انگیز اور خوددار زندگی کا نام ڈاکٹر صاحب کی اصطلاح مین فقر ہے، اور اسی فقر کی بدولت صحرا سے مجدد، رفارمر اور پیغمبر پیدا ہوتے ہین،

ہوتا ہے کوہ و دشت مین پیدا کبھی کبھی　　　　وہ مرد جس کا فقر خزف کو کرے نگین

اسکول اور کالج علم و عرفان کا حقیقی ذریعہ نہین ہین بلکہ حقائق کا علم صرف کوہ و بیابان مین ہوتا ہے،

مدرسہ نے تری آنکھون سے چھپایا جنکو　　　　خلوت کوہ و بیابان مین وہ اسرار ہین فاش

اس لیے خودی کی تربیت صرف دشت و بیابان مین ہوتی ہے،

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف　　　　کہ مشت خاک مین پیدا ہو آتش ہمہ سوز

یہی ہے سر کلیمی ہر اک زمانے مین　　　　ہوائے دشت و شعیب و شبانی شب و روز

اسی تربیت یافتہ خودی کا نام نبوت ہے، اور اس کا ظہور صرف کوہ و بیابان سے ہوتا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر یہ شرف حاصل ہوا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غار حرا اور صحرائے عرب مین،

دران شب ہا خروشِ صبحِ فرداست | کہ روشن از تجلیہائے سیناست
تن و جان محکم از باد و رود دشت است | طلوعِ امتان از کوہ و صحراست

اس قطعہ مین ڈاکٹر صاحب نے نہایت واضح طور پر بتا دیا ہے کہ وہ صحرائیت اور بدویت کی ترغیب اس لیے دیتے ہین کہ اس سے روحانی اور جسمانی دونون قسم کی قوت حاصل ہوتی ہے، اور یہی قوت دین و دنیا کی سعادتون کا سنگ بنیاد ہے،

(۹) عقل و عشق، اثباتِ خودی کا یہ نوان مقدمہ ہے، اگرچہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک عقل و عشق دونون خودی کا جز و ترکیبی ہین،

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبرئیل | اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل

جہانِ توحید ڈاکٹر صاحب کی خودی کی سب سے آخری منزل ہے، وہ بھی عقل و عشق ہی کی آمیزش سے پیدا ہوتا ہے،

غربیان را زیرکی سازِ حیات | شرقیان را عشق رازِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس | کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چون با زیرکی ہمبر بود | نقشبندِ عالمِ دیگر شود
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ | عشق را با زیرکی آمیزدہ

پیامِ مشرق مین انھون نے "محاورۂ علم و عشق" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جس مین علم و عشق کا مناظرہ کروایا ہے، اور ہر ایک نے اپنے اپنے فضائل بیان کیے ہین، اور بالآخر اس رد و قدح کے بعد عشق عقل کو پیامِ صلح اور دعوتِ اتحاد دیتا ہے،

بیا این خاکدان را گلستان ساز | جہانِ پیر را دیگر جوان ساز
بیا یک ذرہ از دردِ دلم گیر | تہ گردون بہشتِ جاودان ساز

زرو ذرآفرینش ہمدم استیم ہمان یک نغمہ را زیر و بم استیم

ان اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ عقل کے کلیۃً مخالف نہیں، البتہ جب عقل عشق سے بالکل علیحدگی اختیار کر لیتی ہے، تو وہ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں، اور عشق کو ہر جگہ ترجیح دیتے ہیں، لیکن اس ترجیح کے وجوہ سے پہلے عشق کی حقیقت اور ماہیت پر غور کر لینا چاہیے،

عشق اگرچہ عربی زبان کا لفظ ہے لیکن قرآن، حدیث اور شعرائے جاہلیت کے کلام میں یہ لفظ نہیں آیا ہے، متاخرین شعرائے عرب نے بھی اس لفظ کا بہت کم استعمال کیا ہے، اور عشق کی وہ اہم خصوصیات جو فارسی شاعری میں نظر آتی ہیں، ان کا تو عربی شعراء کے کلام میں وجود ہی نہیں ہے، اس لیے ہم کو تاریخی حیثیت سے یہ پتہ لگانا چاہیے کہ فارسی شاعری نے عشق کو اس قدر اہمیت کیوں دی ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ سب سے پہلے عشق اور عشق کی تمام خصوصیات کو فلسفۂ اشراق نے نمایاں کیا، اور ان کو نہایت اہمیت دی، اشراقیون کے نزدیک نظام عالم "قہر و مہر" کی بنیاد پر قائم ہے، چنانچہ شیخ الاشراق حکمۃ الاشراق میں لکھتے ہیں کہ

ہر بلند نور کو نیچے کے نور پر غلبہ و اقتدار حاصل ہے اور نیچے کا نور بلند نور سے محبت رکھتا ہے، اور اسی قہر و مہر سے نظام عالم کا وجود وابستہ ہے، اور جب بہت سے انوار جمع ہو جاتے ہیں تو بلند نور نیچے کے نور پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے، اور نیچے کے نور کو بلند نور کا شوق، اور عشق ہوتا ہے، اس لیے نور الانوار (یعنی خدا) کو اپنے ماسوا تمام موجودات پر غلبہ حاصل ہے، اور وہ اپنی ذات کے سوا کسی اور کا عشق نہیں کرتا، کیونکہ وہ ہر چیز سے زیادہ خوبصورت اور مکمل ہے، اور اس کو خود اپنا کمال نظر آتا ہے، اس لیے وہ عاشق بھی ہے، اور معشوق بھی ہے، اور چونکہ خدا سے زیادہ کوئی چیز حسین اور مکمل نہیں اس لیے کسی چیز کو بھی دوسری چیز کے عشق میں وہ لطف نہیں حاصل ہوتا جو عشق الٰہی میں ہوتا ہے، غرض نظام عالم کا وجود مہر و قہر سے قائم ہے، اور انواد

مجردہ کی جس قدر کثرت ہوتی ہے، اور جس قدر ان مین علت و معلول کا سلسلہ بڑھتا جاتا ہے،

اسی قدر نظام عالم مکمل ہوتا ہے، اور کل عالم مل کر ایک عالم بن جاتے ہین[1]

مختلف حکمانے عشق و محبت پر جو بحثین کی ہین ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک فلسفیانہ

چیز ہے، سب سے زیادہ مفصل اور عام فہم مضمون اس پر ارباب رسائل اخوان الصفا نے لکھا ہے، جو

زیادہ تر فلسفۂ اشراق کی طرف مائل ہین، اور انھون نے عشق و محبت کے متعلق تمام نظریات جمع

کر دیے ہین، جن مین ایک نظریہ یہ ہے کہ

"عشق نام ہے معشوق کے ساتھ متحد ہونے کے سخت شوق کا، اسی لیے عاشق کو ایک

حالت پر قناعت نہین ہوتی، بلکہ وہ اس سے ترقی کرنا چاہتا ہے، چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے

کہ "مین معشوق کو گلے لگاتا ہون تب بھی دل اس کا مشتاق رہتا ہے، کیا گلے لگانے سے بھی زیادہ

معشوق کی قربت کا کوئی درجہ ہے؟ مین اس کے منہ کا بوسہ لیتا ہون تاکہ میرا عشق زائل ہو جائے،

لیکن اس سے تو میرا شوق اور بڑھ جاتا ہے، غالباً میرے دل کی پیاس بجز اس کے نہین بجھ سکتی

کہ عاشق و معشوق دونوں کی روحین باہم مل جائین،

اس نظریہ کو نقل کر کے ارباب رسائل اخوان الصفا لکھتے ہین کہ "عشق کے متعلق جو کچھ کہا

گیا ہے ان مین سب سے زیادہ راجح اور سب سے زیادہ لطیف یہی نظریہ ہے"، اس کے بعد انھون نے

اس کی تفصیلی شرح کی ہے، اور لکھا ہے کہ جو حکما، اس نظریہ کے قائل ہین ان کا مطلب یہ ہے کہ

اتحاد صرف روحانی امور کا خاصہ ہے، کیونکہ جسمانی چیزون مین اتحاد نہین ہو سکتا، بلکہ وہ صرف

ایک دوسرے کے قریب ہو جاتی ہین، باہم مل جاتی ہین اور ایک جسم دوسرے جسم کو چھو جاتا ہے

اتحاد صرف روحانی چیزون مین ہوتا ہے،

---

[1] ملخص از شرح حکمۃ الاشراق ص ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰

اشراقی فلسفیون کا یہی عشق ہے جس کو ہمارے صوفیون نے وحدت الوجود کی شکل مین لیا ہے،
اور وہ تصوف کی راہ سے صوفیانہ شاعری مین آیا، اور اس عشق کے ذریعہ سے جو صوفیانہ نظریات
قائم ہوئے، فارسی شاعری نے نہایت لطیف انداز مین ان کی تشریح کی،

(۱) ان مین پہلا نظریہ یہ ہے کہ کائنات کی بنیاد عشق و محبت پر قائم ہے، کیونکہ دنیا مین
علت و معلول کا سلسلہ قائم ہے، اور ہر معلول اپنی علت سے عشق و محبت رکھتا ہے، اور علت کو
اس پر غلبہ و اقتدار حاصل ہوتا ہے، لیکن چونکہ ایک ہی چیز دو حیثیتون سے علت و معلول دونون
ہوتی ہے، اس لیے ہر چیز مین قہر و مہر دونون پائے جاتے ہین، البتہ بعض مین قہر اور بعض مین
مہر زیادہ ہوتا ہے،

عشق و محبت کے اسی عالمگیر نظریہ کو مولانا روم نے اس طرح بیان کیا ہے،

جملہ اجزائے جہان زان حکم پیش	جفت جفت و عاشقان جفت خویش
ہست ہر جزوے بعالم جفت خواہ	راست ہمچو کہربا و برگ کاہ
آسمان گوید زمین را مرحبا	با توام چون آہن و آہن ربا
میل ہر جزوے بجزوے می نہد	ز اتحاد ہر دو تولیدے جہد
ہر یکے خواہان دگر را ہمچو خویش	از پئے تکمیل فعل کار خویش
دور گردون را ز موج عشق دان	گر نبودے عشق بفسردے جہان
کے جمادی محو گشتے در نبات	کے فدائے روح گشتے نامیات
ہر یکے بر جا فسردے ہمچو یخ	کے بدے پرّان و جویان چون ملخ

شعرائے ایران نے عشق کے اسی عالمگیر نقطۂ نظر سے کائنات کو دیکھا تو جن چیزون مین
عشق و محبت کی کشش زیادہ نظر آئی ان کو باہم عاشق و معشوق بنا دیا، ذرہ و آفتاب، کاہ و کہربا،

کبک و آتش، سرو قمری، گل و بلبل، پروانہ و شمع، نیلوفر و آفتاب، ماہ و کتان سب کے سب باہم عاشق و معشوق ہین، دوسرے ممالک کی شاعری مین ایک آدھ چیز کو عاشق مانتے ہین، لیکن فارسی شاعری نے تمام کائنات کو عاشق و معشوق بنا دیا، مولانا شبلی نے شعر العجم مین لکھا ہے کہ یہ اُس عالمگیر حسن کا اثر تھا جو ایران مین جمع ہو گیا تھا لیکن ہمارے نزدیک یہ فلسفۂ اشراق کا اثر ہے جس نے عشق کا عالمگیر کائناتی نظریہ قائم کیا،

(۲) علت معشوق اور معلول عاشق ہوتا ہے، اور علت مین قہر اور معلول مین مہر کا جذبہ پایا جاتا ہے، زمین اور زمین کی پیداوار پر سب سے زیادہ اثر آسمان کا پڑتا ہے، اس لیے آسمان اسکی علت اور زمین معلول ہے، اور اسی نسبت سے آسمان مین قہر اور زمین مین مہر کا جذبہ زیادہ موجود ہے، ایرانی شعرا آسمان کی جفاکاری اور بے مہری کی جو شکایت کرتے ہین وہ اسی اشراقی فلسفہ کا اثر ہے، جو علت کو علت قاہرہ قرار دیتا ہے،

(۳) علت مین قدرت، غلبہ، اقتدار اور عز و شرف پایا جاتا ہے، اور اسی نسبت سے معلول مین عجز و اطاعت اور ذلت و مسکنت پائی جاتی ہے، اور چونکہ علت معشوق اور معلول عاشق ہوتا ہے اس لیے معشوق زیادہ معزز، صاحب اقتدار اور بلند رتبہ ہوتا ہے، اس کے برعکس عاشق مین عجز، فروتنی اور پستی پائی جاتی ہے، اس لیے ایرانی شاعری سے زیادہ کسی شاعری نے عاشق کو ذلیل نہین کیا، خواجہ حافظ فرماتے ہین،

شنیدہ ام کہ سگان را قلادہ مے بندی — چرا بہ گردن حافظ نمے نہی رسنے

اور یہ اسی فلسفۂ اشراق کے نظریۂ عشق کا اثر ہے، ورنہ عرب مین عاشق اس قدر ذلیل و خوار نہین ہوتا،

(۴) عشق اتحاد چاہتا ہے، عاشق جب تک معشوق سے متحد نہ ہو جائے اس کو اور کسی چیز

سے تسکین نہین ہوتی، عشق کے اس نظریہ نے وحدت الوجود کا مسئلہ پیدا کیا، اور صوفیون نے خدا کی ذات
کے ساتھ اتحاد پیدا کرنا چاہا، لیکن جسم کا اتحاد جسم سے نہین ہوتا، بلکہ روح کا اتحاد روح سے ہوتا ہے،
اور خدا چونکہ ہمہ تن روح ہے اس لیے اس سے اتحاد پیدا کرنے کے لیے جسم کو فنا کرنا چاہیے صوفیون
کے ریاضت و مجاہدہ کی بنیاد اسی نظریۂ عشق پر ہے۔

(۵) خدا خود اپنی ذات پر عاشق ہے، اس لیے وہ عاشق بھی ہے اور معشوق بھی، اس سے
زیادہ کوئی چیز حسین و جمیل نہین، اس لیے وہ کسی دوسری چیز پر عاشق نہین ہو سکتا، البتہ اس
مین اپنے حسن کی جلوہ گری کا تماشا دیکھ سکتا ہے، اور اسی غرض سے اس نے دنیا کو پیدا کیا ہے،
مرزا غالب اسی تخیل کو اس طرح بیان کرتے ہین،

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہین ہم کہان ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بین

(۶) حسن و جمال اور تمام محاسن و فضائل کا منبع خدا کی ذات ہے، اور اسی کے فیض کا پرتو
درجہ بدرجہ تمام کائنات پر پڑتا ہے، اور دنیا اس سے روشن ہو جاتی ہے، اس لیے تمام اشیاء
مین جو حسن نظر آتا ہے وہ عارضی اور مستعار ہے، اگر آفتاب کے پرتو سے دیوار روشن ہو جائے
تو دیوار در اصل روشن نہین بلکہ اصل مین آفتاب روشن ہے، دیوار پر صرف اس کا پرتو پڑ گیا ہے،

گر شود پر نور روزن یا سرا تو مدان روشن مگر خورشید را
ور در و دیوار گوید روشنم پرتو غیرے ندارم این منم
پس بگوید آفتاب اے نارشید چونکہ من غائب شوم آید پدید

چھٹی صدی ہجری تک عشق و محبت کا یہی اشراقی نظریہ صوفیانہ شاعری کا راس المال
رہا، البتہ عقل سے اس کا حریفانہ مقابلہ نہین ہوا تھا، لیکن چھٹی صدی ہجری مین تصوف اور فلسفہ
دونون نے غیر معمولی ترقی حاصل کی، تاتاریون کا ہنگامہ اسی زمانے مین شروع ہوا جس نے

تمام دنیاے اسلام کو زیر و زبر کر دیا اور دنیا و مافیہا کی بے قدری اور بے حقیقتی جو تصوف کا سنگِ بنیاد ہے سب کو علانیہ نظر آ گئی، ان حالات مین لوگون کو خدا سے زیادہ لو لگی اور نہایت کثرت سے صوفی شعرا پیدا ہو گئے، جن مین مولانا روم، سعدی، اوحدی اور عراقی زیادہ مشہور ہین لیکن یہی زمانہ فلسفہ کی ترقی کا بھی ہے، کیونکہ فلسفیانہ علوم کی ابتدا اگرچہ عباسیون کے دور حکومت سے ہوئی، لیکن مسلمانون مین امام غزالی اور امام رازی نے ان کو مقبول عام بنا دیا، اور دونون بزرگون نے فلسفہ اور علم کلام کا صور اس بلند آہنگی کے ساتھ پھونکا کہ بچہ بچہ کے کان مین یہ آواز پہنچ گئی، فارابی اور بو علی سینا نے جو فلسفیانہ کتابین لکھی تھین وہ نہایت مبہم، پیچیدہ اور مغلق تھین، لیکن امام غزالی بالخصوص امام رازی نے فلسفہ کو اس قدر آسان کر دیا کہ وہ بازیچۂ اطفال بن گیا، اس لیے اس زمانے مین قدرتی طور پر عشق و عقل کا حریفانہ مقابلہ ہوا، اور دونون کے راستے الگ الگ ہو گئے، فلسفہ اور علم کلام عقلی استدلال کے ذریعہ سے خدا رسی کی راہ دکھاتے تھے، اور تصوف عشق و محبت کے راستے سے اس منزل کو طے کرنا چاہتا تھا، مولانا روم فلسفہ اور تصوف دونون کے اسرار و رموز سے واقف تھے، اس لیے ان کو معلوم ہو گیا کہ فلسفیانہ او متکلمانہ عقل خدا تک نہین پہنچا سکتی، اس کا ذریعہ صرف عشق و محبت ہی جو تصوف کا مایہ خمیر ہے، اس لیے سب سے پہلے انھون نے عقل کے خلاف آواز بلند کی، اور چونکہ امام رازی نے اسی زمانے مین عقل و حکمت کا صور خاص طور سے پھونکا تھا، اس لیے تخصیص کے ساتھ ان کا نام لے کر فرمایا،

پاے استدلالیان چوبین بود ۔۔۔ پاۓ چوبین سخت بے تمکین بود

گر باستدلال کار دین بدے ۔۔۔ فخر رازی راز دار دین بدے

لیکن موجودہ زمانہ مولانا روم کے زمانے سے بھی زیادہ سخت ہے، مولانا روم کے زمانے مین عقل و عشق دونون زندہ تھے، اس لیے عشق عقل کا مقابلہ کر سکتا تھا لیکن اس دور مین صرف عقل زندہ ہے اور عشق بالکل مردہ ہو چکا ہے،

ٹرانہ مان ذرا آزما کے دیکھا اسے — فرنگ دل کی خرابی خرد کی معموری

جوانان را بدآموزست این عصر — شب ابلیس را روزاست این عصر
بدامانش مثالِ شعلہ پیچیم — کہ بے نوراست وبے سوزست این عصر

اس لیے عشق کے مقابل مین عقل کو شکست دیکر ڈاکٹر صاحب نے اس دور پر فتن مین وہی کام کیا جو قدیم دور فتن مین مولانا روم نے کیا تھا، چنانچہ خود کہتے ہین:

چو رومی در حرم دادم اذان من — ازو آموختم اسرار جان من
بدورِ فتنۂ عصرِ کہن او — بدورِ فتنۂ عصرِ روان من

ڈاکٹر صاحب نے جن وجوہ کی بنا پر عقل کے مقابل مین عشق کو ترجیح دی ہے وہ حسب ذیل ہین:

(۱) عمل کی بنیاد عقیدہ کی وحدت ویکرنگی پر قائم ہے، اسلام نے صرف ایک کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی دعوت دی اور اسی عقیدہ کی وحدت اور یکرنگی نے صحابۂ کرام کو جوشِ عمل سے لبریز کر دیا، لیکن عقلی نظریون مین یہ وحدت ویکرنگی نہین پائی جاتی بلکہ وہ ہمیشہ بدلتے رہتے ہین،

زمان زمان شکند انچہ می تراشد عقل — بیا کہ عشق مسلمان وعقل زناری است

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے — عشق بیچارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم

اس لیے وہ انسان کی عملی طاقت کو کسی ایک مرکز پر جمع نہین ہونے دیتی بلکہ اس کو منتشر رکھتی ہے،

(۲) اس وحدت ویکرنگی کے ساتھ عقیدہ کے لیے استحکام اور پختگی بھی ضروری ہے، جس کو شریعت کی اصطلاح مین ایمان ویقین کہتے ہین اور یہی ایمان ویقین انسان کو آمادۂ عمل کرتا ہے، لیکن ایک طرف تو عقلی نظریات کا یہ اختلاف انسان کے دل مین یقین وایمان پیدا ہی نہین ہونے دیتا بلکہ اس کو تلون وتذبذب اور شک مین مبتلا رکھتا ہے، دوسری طرف ان نظریات کو سیکڑون دلائل سے ثابت کیا جاتا ہے، اور انسان اگرچہ ان دلائل کی کثرت سے حیرت زدہ ہو جاتا ہے،

اک دانشِ نورانی اک دانشِ برہانی ‌ ‌ ‌ ‌ ہے دانشِ برہانی حیرت کی فراوانی

لیکن اس کے دل مین یقین کی کیفیت نہین پیدا ہوتی جس پر عمل کی بنیاد ہے،

علاجِ ضعفِ یقین ان سے ہو نہین سکتا ‌ ‌ ‌ ‌ غریب اگرچہ ہین رازی کے نکتہ ہاے دقیق

بلکہ وہ ایک کشمکش مین مبتلا ہو جاتا ہے، اور اس حالت مین بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عقل ان دلائل سے انسان کی رہبری کرنا چاہتی ہے، لیکن درحقیقت وہ راہ زنی کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ان دلائل کو مکر، فریب اور حیلہ قرار دیتے ہین،

فریبِ کشمکشِ عقل دیدنی دارد ‌ ‌ ‌ ‌ کہ میرِ قافلہ و ذوقِ رہزنی دارد

نشانِ راہ ز عقلِ ہزار حیلہ مپرس ‌ ‌ ‌ ‌ بیا کہ عشق کمالے ز یک فنی دارد

عشق صید از زورِ بازو افگند ‌ ‌ ‌ ‌ عقل مکار است و دامے می زند

(۳) ایک طرف تو علم و یقین کا یہ ضعف عقل کو عملی میدان مین ناکامیاب رکھتا ہے' دوسری طرف عملی زندگی مین جو خطرات و مہالک پیش آتے ہین ان کے مقابلے کے لیے جس جرأت، استقامت اور جانبازی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ عقل مین بہت کم پائی جاتی ہے، عشق آگ مین نہایت بیباکی کے ساتھ کود پڑتا ہے، لیکن عقل دیکھ بھال مین رہ جاتی ہے،

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود مین عشق ‌ ‌ ‌ ‌ عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

کیونکہ عشق خود ایک آگ ہے، جو دل مین زندگی کی حرارت پیدا کر دیتا ہے، اس لیے آگ کو آگ سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے، لیکن عقل مین زندگی کی یہ حرارت نہین پائی جاتی، اور ڈاکٹر صاحب نے ایک فرضی اور خیالی حکایت مین اس نکتہ کو نہایت شاعرانہ انداز مین بیان کیا ہے،

شنیدم شبے در کتب خانۂ من ‌ ‌ ‌ ‌ بہ پروانہ میگفت کرمِ کتابی

باوراقِ سینا نشیمن گرفتم ‌ ‌ ‌ ‌ بسے دیدم از نسخۂ فاریابی

نفہمیدہ ام حکمتِ زندگی را | ہمان تیرہ روزم ز بے آفتابی
نکو گفت پروانہ، نیم سوزے | کہ این نکتہ را در کتابے نیابی
تپش میکند زندہ تر زندگی را | تپش میدہد بال و پر زندگی را

اس لیے اگرچہ عقل بھی بڑے بڑے میدان فتح کرنا چاہتی ہے، لیکن جرأت و ہمت کی کمی سے وہ دفعتاً ان میدانون کو فتح نہین کرسکتی بلکہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہے،

عقل ہم خود را بدین عالم زند | تا طلسمِ آب و گل را بشکند
میشود ہر سنگ رہ او را ادیب | میشود برق و سحاب او را خطیب
چشمش از ذوقِ نگہ بیگانہ نیست | لیکن او را جرأتِ رندانہ نیست
پس ز ترسِ راہ چون کورے رود | نرم نرمک صورتِ مورے رود
تا خرد پیچیدہ تر از جنگ و پوست | می رود آہستہ اندر راہ دوست
کارش از تدریج می یابد نظام | من ندانم کے شود کارش تمام

لیکن جرأت و ہمت کی کمی سے عقل جو کام برسون مین کرسکتی ہے اس کو عشق آن کی آن مین کرسکتا ہے،

می نداند عشق سال و ماہ را | دیر و زود و نزد و دور راہ را
عقل در کوہے شگافے میکند | یا بگرد او طوافے میکند
کوہ پیشِ عشق چون کاہے بود | دل سریع السیر چون ماہے بود
زور عشق از باد و خاک و آب نیست | قوتش از سختیِ اعصاب نیست
عشق با نانِ جوین خیبر کشاد | عشق در اندامِ مہ چاکے نہاد
کلّۂ نمرود بے ضربے شکست | لشکرِ فرعون بے حربے شکست

عشق سلطان است و برہان مبین　　　ہر دو عالم عشق را زیر نگین

اس تمام تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جس عشق کو عقل کا حریف مقابل قرار دیا ہے، وہ ایک پر زور قوت ہے جو پہاڑون کو ریزہ ریزہ کر سکتی ہے، اور اس زمانے مین اگرچہ سائنس بھی ایک عملی طاقت بن گئی ہے، لیکن با اینہمہ سائنس اور عشق مین مختلف حیثیتون سے فرق ہے،

(۱) سائنس مین اخلاق کی آمیزش نہین، اس لیے وہ زندگی کے ایک ضروری عنصر سے خالی ہے،

(۲) سائنس کے لیے غیر معمولی مصارف، غیر معمولی ساز و سامان اور غیر معمولی آلات کی ضرورت ہے، اور عشق کے لیے ان چیزون کی ضرورت نہین، بلکہ وہ بے سرو سامانی کے ساتھ بھی دنیا کو تہ و بالا کر سکتا ہے،

ڈاکٹر صاحب نے اسی غرض سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے عشق کو بطور نمونہ و مثال کے سامنے رکھا ہے، جنھون نے باوجود بے سرو سامانی کے تمام دنیا کو ہلا دیا تھا، صوفیہ کا عشق جو صرف محویت ذاتِ الٰہی تک محدود ہے، ان کے نزدیک قابلِ تقلید نہین،

(۳) سائنس کتنی ہی ترقی کر جائے، لیکن اس کی تگ و دو صرف انسان کی بیرونی دنیا تک محدود ہے، اور وہ صرف مظاہر فطرت کی ایک ایک چیز کو لے کر اس کے اوصاف و خواص بیان کرتی ہے، مثلاً پانی مین کیا خاصیت ہے؟ حرارت کے کتنے درجے ہین؟ بھاپ مین کسقدر طاقت ہے؟ اور وہ ان اوصاف و خواص کے انکشاف سے صرف انسان کی بیرونی دنیا مین حرکت پیدا کر سکتی ہے، لیکن عشق خارجی دنیا سے کوئی تعلق نہین رکھتا، بلکہ وہ صرف انسان کے روحانی اوصاف و خواص کی جستجو مین رہتا ہے، اس لیے وہ خلوت سے باہر قدم نہین نکالتا، اور اس طرح عقل و عشق کی تگ و دو کے میدان الگ الگ ہو جاتے ہین،

عقل او را سوے جلوت میکشد　　　عشق او را سوے خلوت میکشد

اس لیے عقل سے اگرچہ خارجی دنیا کی تمام چیزون کے اوصاف وخواص نمایان ہوجاتے ہین، لیکن خود انسان کے روحانی اوصاف وخواص پر پردہ پڑا رہتا ہے، عقل بجلی کے چراغ جلاکر تمام دنیا کو تو روشن کرسکتی ہے، لیکن اس چراغ کی روشنی انسان کی روحانی زندگی تک نہین پہنچ سکتی، اس کو صرف عشق ہی روشن کرسکتا ہے،

جلوت او روشن از نور صفات　　　　خلوت او مستیز از نور ذات

حالانکہ انسان کی حقیقی زندگی یہ نہین ہے کہ وہ بیرونی چیزون کے اوصاف وخواص سے تو واقف ہو اور خود اس کے اندرونی اوصاف وخواص پر پردہ پڑا رہے، بلکہ اس کی اصلی زندگی یہ ہے کہ خود اس کو اپنی ذات یعنی اپنی خودی کے اوصاف وخواص بے پردہ ہوکر نظر آئین،

برمقامِ خود رسیدن زندگی است　　　　ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

مرد مومن در نسازد با صفات　　　　مصطفیٰ راضی نشد الا بذات

جلوت وخلوت کی اس تفریق نے اگرچہ عقل وعشق کے حدود الگ الگ کردیے، لیکن صوفیانہ نظریۂ عشق اور ڈاکٹر صاحب کے نظریۂ عشق کے درمیان حد فاصل قائم نہین ہوئی، کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی طرح ہمارے صوفی بھی عشق کو خلوت ہی کی چیز سمجھتے ہین، لیکن ان کے نزدیک اس خلوت نشینی کا مقصد صرف محویت، استغراق اور مشاہدۂ ذاتِ الٰہی ہے، اور ڈاکٹر صاحب بھی اس کو ایک اعلیٰ درجہ کا مقصد سمجھتے ہین، لیکن ان کے نزدیک اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے انسان کو خود اپنی ذات یعنی اپنی خودی کا مشاہدہ کرنا چاہیے، اوپر کے اشعار مین انھون نے جہان جہان ذات کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے یہی خودی مراد ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غار حرا مین جو خلوت نشینی اختیار کی تھی اس کا مقصد ڈاکٹر صاحب کے نزدیک صرف یہ تھا کہ خود اپنی ذات یعنی خودی کے مشاہدہ کو ذاتِ الٰہی کے مشاہدے

کا ذریعہ بنائین، ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس مشہور قطعہ مین

زمن گو صوفیانِ باصفا را　　خدا جویانِ معنی آشنا را

غلامِ ہمتِ آن خود پرستم　　کہ از نورِ خودی بیند خدا را

مین جس خود پرست کی غلامی پر فخر کیا ہے، اُس سے یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مرادُ ہے، لیکن اگر خلوت نشینی مین خودی کو بالکل فنا کر دیا جائے اور صرف ذات الٰہی کا مشاہدہ مقصود ہو تو اس صورت مین عشق محض ایک علمی چیز ہو کر خلوت سے جلوت مین آجاتا ہی، اور اس مین اور عقل مین کوئی فرق باقی نہین رہ جاتا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود خدا کی ذات کو بے پردہ دیکھنا چاہا، اور اگر وہ ان کو بے پردہ نظر آجاتی تو اس سے صرف ان کی عقل کی تحقیقی قوت کو تشفی ہو جاتی لیکن خود ان کی ذات یعنی خودی کی اندرونی صلاحیتون اور قابلیتون پر پردہ پڑا رہ جاتا،

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور　　کہ جان تو ز خود نا محرمی ہست

قدم در جستجوے آدمے زن　　خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

لیکن اگر خلوت نشینی مین خود اپنی ذات یعنی خودی کا مشاہدہ کیا جائے تو انسان کو اپنی اندرونی قابلیتون اور صلاحیتون کا علم ہو جاتا ہے، اور اس صورت مین عشق عقل کی طرح صرف تحقیقی قوت نہین رہ جاتا بلکہ ایک تخلیقی جذبہ بن جاتا ہے اور انسان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ایمانی طاقت سے کام لے کر ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غارِ حرا مین خلوت نشین ہو کر خود اپنی ذات یعنی اپنی خودی کی تخلیقی قوتون کا مشاہدہ کر کے مسلمانون کی ایک نئی قوم پیدا کر دی،

مصطفیٰ اندر حرا خلوت گزید　　مدتے جز خویشتن کس را ندید

نقشِ مارا در دلِ او ریختند　　ملتے از خلوتش انگیختند

(۱۰) مسئلۂ ارتقاء، اثبات خودی کا یہ دسوان مقدمہ بلکہ خودی کی ترقی، جد وجہد اور تگ و دو کی آخری منزل ہے، عملی حیثیت سے عجمی تصوف اگرچہ بالکل شکستہ پا اور غیر متحرک ہے، لیکن اخلاقی اور روحانی ترقی کی راہ مین اس کا قدم کسی منزل پر نہین رکتا اور ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش مین رہتا ہے،

ہر نگارے کہ مرا پیش نظر می آید　　خوش نگارے است ولے خوشتر ازان می باید

اس لیے ہمارے صوفیہ موجودہ انسان اور موجودہ انسانی دنیا پر قناعت نہین کرتے بلکہ اس سے کامل تر انسان اور اس سے کامل تر دنیا کی تلاش کرتے ہین، خواجہ حافظ فرماتے ہین،

آدم خاکی درین عالم نمی آید بدست　　عالمے دیگر بباید ساخت از نو آدمے

قدیم حکماے یونان مین جو لوگ صوفیانہ زندگی بسر کرتے تھے، وہ بھی اسی قسم کے برگزیدہ انسان کی تلاش مین رہتے تھے، دیوجانس کلبی کی نسبت مشہور ہے کہ وہ دن مین چراغ لیکر پھر رہا تھا، یونان کے لوگ اس کو ایک پاگل حکیم سمجھتے تھے اسلیئے اُن سے پوچھا کہ حضرت دن دھاڑے چراغ لیکر کیا ڈھونڈھ رہے ہین؟ کہنے لگا کہ آدمی کو ڈھونڈھتا ہون، لیکن جب اس سے کہا گیا کہ آدمیون کا ہجوم تمھین نظر نہین آتا؟ تو اس نے جواب دیا کہ یہ سب ادنیٰ درجہ کی مخلوق ہین، آدمی ان مین ایک بھی نہین، چونکہ انسانِ کامل کی جستجو کا یہ ایک بہترین شاعرانہ طریقہ تھا اس لیے مولانا روم نے اس کو بعینہٖ نظم کردیا ہے،

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر　　کز دام و دد ملولم وانسانم آرزوست

از ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت　　شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست[1]

ڈاکٹر صاحب کا منتہاے آمال بھی یہی انسانِ کامل ہے اور انھون نے اس کی جستجو اور نایابی کو دیوجانس کلبی سے زیادہ مبالغہ آمیز طریقہ پر بیان کیا ہے،

[1] رسالۂ اردو اقبال نمبر ص ۸۰۳ - ۸۰۴

خدا ہم در تلاش آدمے ہست

فلسفہ و حکمت نے اگرچہ قدیم زمانہ مین بھی بہت کچھ ترقی کر لی تھی اور اب اس سے بھی زیادہ ترقی کر رہے ہین، لیکن ڈاکٹر صاحب کے نزدیک وہ اب تک انسانِ کامل کے پیدا کرنے مین ناکامیاب رہے ہین،

حکیمان گرچہ صد پیکر شکستند — مقیمِ سومناتِ بود و ہستند

چسان افرشتہ و یزدان بگیرند — ہنوز آدم بفتراکے نہ بستند۔

یہ انسان، اصولِ فطرت کے مطابق صرف روحانی ارتقاء سے پیدا ہو سکتا ہے، چنانچہ اربابِ رسائل اخوان الصفا نے اس مسئلہ پر ایک مستقل مضمون لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ معدنیات کی ترقی کا آخری درجہ نباتات سے اور نباتات کا آخری درجہ حیوانات سے اور حیوانات کا آخری درجہ انسان سے اور انسان کا آخری درجہ ملائکہ سے ملا ہوا ہے، اور ملائکہ کے بھی مختلف درجے ہین جنمین باہم اسی طرح ابتدا و انتہا نکلتی ہے[1]،

علامہ ابن مسکویہ نے الفوز الاصغر مین انسان کی ترقی کے مختلف مدارج نہایت تفصیل سے دکھائے ہین، اور اس سے نبوت پر استدلال کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ "پھر حیوان ترقی کر کے حیوانیت کے انتہائی درجہ پر پہنچ جاتا ہے، اور انسان کی سرحد مین داخل ہو جاتا ہے، گو یہ درجہ باعتبار حیوانیت کے اعلیٰ ہے مگر بہ نسبت انسانیت کے بہت نیچے ہے، اور یہ درجہ بندر وغیرہ کا ہے، جو انسان سے بالکل مشابہ ہین، اور ان مین اور انسان مین تھوڑا ہی سا فرق ہے جس کو اگر بندر طے کر لین تو بالکل انسان ہو جائین، جب حیوان اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے تو اس کا قد سیدھا ہو جاتا ہے، اور اس مین تھوڑی سی تمیز کی قوت آجاتی ہے، اور وہ تربیت سے سمجھدار ہو سکتا ہے، یہ درجہ اگرچہ جانورون کی

---

[1] رسالہ اخوان الصفار جلد ۳ ص ۲۲۲

بہ نسبت زیادہ بلند ہے لیکن انسان کامل کے درجہ سے بہت پست ہے۔ یہ حیوان نما انسان زمین
کے آباد حصے کے انتہا اور اس کے اطراف مثلاً شمال وجنوب اور زنگستان مین پائے جاتے ہین،
کیونکہ ان مین اور بندرون مین کچھ زیادہ فرق نہین ہوتا، نہ ان کا کوئی فلسفہ منقول ہے اور نہ انھون
نے اپنی ہمسایہ قومون سے علم وفن حاصل کیا ہے۔ اسی طرح عقل انسانی درجہ بدرجہ بڑھتی جاتی ہے،
یہان تک کہ زمین کی وسط آبادی یعنی تیسری، چوتھی اور پانچوین اقلیم مین پہنچکر درجۂ کمال تک پہنچ
جاتی ہے، اور ان مین ذہانت، سمجھ اور بیدار مغزی اور صنعتی ذکاوت پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ
علوم کے پیچیدہ مسائل حل کرنے لگتے ہین اور علوم وفنون کو وسعت دیتے ہین، پھر اس درجہ مین
بھی فرق مراتب پیدا ہو جاتا ہے، یہانتک کہ بعض لوگ اس قدر سریع الفکر، صحیح النظر اور صائب الرائے
ہوتے ہین کہ آیندہ ہونے والے واقعات کی پیشینگوئی کر سکتے ہین، گویا یہ لوگ غیب کی باتون کو
ایک باریک پردہ کے آڑ سے دیکھ لیتے ہین، جب انسان اس بلند درجہ تک پہنچ جاتا ہے تو وہ
ملائکہ کی سرحد مین داخل ہو جاتا ہے، یعنی ایک ایسی شخصیت عالم وجود مین آجاتی ہے جو انسانی
شخصیت سے بلند ہوتی ہے، اور اس مین اور فرشتون مین بہت تھوڑا سا فرق رہ جاتا ہے،
ترقی کے ان مدارج کو سامنے رکھکر انسانیت کے بلند درجہ کی انتہا معلوم ہو سکتی ہے، اور رسالت
اور نبوت کی بلند پایگی سمجھ مین آسکتی ہے[۱]،

ڈاکٹر صاحب نے بھی ارتقاے انسان کا یہی فلسفیانہ نظریہ اختیار کیا ہے،

عروج آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہین ۔۔۔ کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

لیکن یہ مہ کامل ابتک ضو فشان نہین ہوا ہے، اس لیے دنیا اس کے طلوع کی انتظار مین ہے،

درین عالم بہشتِ خرمے ہست ۔۔۔ بشاخِ او ز تاکِ من نمے ہست

---

[۱] الفوز الاصغر ص ۹۰، ۹۱، ۹۲

نصیب او ہنوز آن ہاو ہوئیست کہ او در انتظار آدمے ہست

بدہ او را جوان پاکبازے سرورش از شرابِ خانہ سازے

قوی بازوے او مانند حیدر دل او از دو گیتی بے نیازے

زمن ہنگامۂ دہ این جہان را دگرگون کن زمین و آسمان را

ز خاکِ ما دگر آدم بر انگیز بکش این بندۂ سود و زیان را

نقش دگر طراز دہ آدم پختہ تر بیار لعبت خاک ساختن می نہ سزد خدائے را

ان اشعار سے اس انسان کامل کے اوصاف بھی معلوم ہوتے ہین یعنی وہ ایک ہنگامہ خیز، پاکباز، قوی ہیکل، بے نیاز، پختہ مغز انسان ہوگا اور اس کے سامنے موجودہ انسانون کی حیثیت مٹی کے کھلونون سے زیادہ نہین ہوگی، لیکن علم و حکمت اور فلسفہ و سائنس کے ذریعہ یہ انسان کامل نہین پیدا ہو سکتا، بلکہ اس کو صرف ایک روحانی جذبہ یعنی عشق ہی پیدا کر سکتا ہے،

بیا اے عشق، اے رمزِ دلِ ما بیا اے کشتِ ما اے حاصلِ ما

کہن گشتند این خاکی نہادان دگر آدم بنا کن از گلِ ما

یہ انسان کامل چونکہ خود عقل، عشق اور اخلاق حسنہ کا مجموعہ ہوگا اس لیے جس دنیا مین زندگی بسر کرے گا یا جس عالم نو کو وہ پیدا کرے گا اس کی ترکیب بھی انہی تینون اجزا سے ہوگی،

خیز و نقش عالمِ دیگر بنہ عشق را با زیرکی آمیز دہ

شعلۂ افرنگیان نم خوردہ ایست چشم شان صاحب نظر دل مردہ ایست

سوز و مستی را مجو از تاکِ شان عصرِ دیگر نیست در افلاکِ شان

زندگی را سوز و ساز از نارِ تست عالمِ نو آفریدن کارِ تست

یہ کامل ترین انسان جو اس قسم کا ترقی یافتہ عالم نو پیدا کر سکتا ہے، خودی کی ترقی کی آخری منزل ہے،

اور اسرار خودی مین ڈاکٹر صاحب نے خودی کی تربیت و ترقی کے اسی آخری مرحلہ کو نیابت الٰہی کے نام سے موسوم کیا ہے، اور اس نائب الٰہی کا خیر مقدم نہایت پرجوش اشعار مین کیا ہے،

اے سوارِ اشہبِ دوران بیا | اے فروغِ دیدۂ امکان بیا
رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو | در سواد دیدہ ہا آباد شو
شورشِ اقوام را خاموش کن | نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن
خیز و قانونِ اخوت ساز دہ | جام صہبائے محبت باز دہ
باز در عالم بیار ایامِ صلح | جنگجویان را بدہ پیغامِ صلح
نوعِ انسان مزرع و تو حاصلی | کاروانِ زندگی را منزلی
ریخت از جورِ خزان برگِ شجر | چون بہاران بر ریاضِ ما گذر
سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر | از جبینِ شرمسارِ ما بگیر
از وجودِ تو سرافرازیم ما | پس باٰلامِ جہان سازیم ما

لیکن یہ "سوارِ اشہب دوران" زمانے کے ہزارون تغیرات وانقلابات کے بعد پیدا ہوتا ہے،

طبعِ فطرت عمرہا در خون تپید | تا دو بیتِ ذاتِ او موزون شود

اس لیے ڈاکٹر صاحب نے اس کے مدارج ارتقا کی توجیہ فرانس کے مشہور فلسفی برگسان کے نظریۂ زمان و مکان سے کی ہے جس کا خلاصہ ایک مختصر لفظ "دائمی تخلیق" سے مین کیا جا سکتا ہے یعنی یہ کہ "کوئی چیز ہے نہین، بلکہ ہوتی رہتی ہے، ہر چیز اپنے سے مختلف بنتی رہتی ہے کائنات ساکن نہین بلکہ متحرک ہے"

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید | کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون
سکون محال ہے قدرت کے کارخانے مین | ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے مین

لہ شعر نہار از مجنون گورکھپوری ص، ۳۰

فلسفۂ خودی کے ماخذ. فلسفۂ خودی کی ابتدا مثنوی اسرار خودی سے ہوئی، اور جب پروفیسر نکلسن نے انگریزی زبان مین اس کا ترجمہ کیا تو بعض انگریزون نے اپنے تبصرہ مین یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ فلسفہ جرمنی کے مشہور فلاسفر نٹشے کے افکار و خیالات سے ماخوذ ہے، چنانچہ خود ڈاکٹر صاحب پروفیسر نکلسن کو ایک خط مین لکھتے ہین:

بعض انگریز تنقید نگارون نے اس سطحی تشابہ اور تماثل سے جو میرے اور نٹشے کے خیالات مین پایا جاتا ہے دھوکا کھایا ہے، اور غلط راہ پر پڑ گئے ہین، "دی انیتھم" والے مضمون مین جو خیالات ظاہر کئے گئے ہین وہ بہت حد تک حقائق کی غلط فہمی پر مبنی ہین، لیکن اس غلطی کی ذمہ داری صاحب مضمون پر عائد نہین ہوتی، وہ انسان کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر نہین سمجھ سکا، یہی وجہ ہے کہ اس نے غلط مبحث کرکے میرے انسان کامل اور جرمن متفکر کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے، مین نے آج سے تقریباً ۲۰ سال قبل انسان کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا، اور یہ وہ زمانہ ہے جب نہ تو نٹشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانون تک پہنچا تھا، نہ اس کی کتابین میری نظرون سے گذری تھین،[1]

اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو نٹشے کی تقلید و تتبع سے بالکل انکار ہے، بلکہ انھون نے دوسرے موقع پر علانیہ یہ دعویٰ کیا ہے کہ

اسرار کا فلسفہ مسلمان صوفیہ اور حکما کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے، اور تو اور وقت کے متعلق برگسان بھی ہمارے صوفیون کے لیے کوئی نئی چیز نہین،[2]

اس دعوی کے بعد اب ہمارے سامنے یہ سوال ہے کہ کیا واقعی ڈاکٹر صاحب کے دعوی کے مطابق اسرار خودی کا فلسفہ مسلمان صوفیہ اور حکما کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے؟

---

[1] اقبال نامہ ص ۴۷۰، ۴۷۱ [2] ایضاً ص ۴۳، ۴۴

اور اس سوال کے جواب کے لیے ہم کو سب سے پہلے خود اسرار خودی کے فلسفیانہ اجزاء کی تحلیل کر کے دیکھنا چاہیے کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے؟

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسرار خودی میں فلسفۂ خودی کے اجزاء و مقدمات نہایت مبہم، پراگندہ اور ناکمل طور پر بیان کیے گئے ہیں، اور جب تک ڈاکٹر صاحب کے پورے مجموعۂ کلام کو پیش نظر نہ رکھا جائے صرف اسرار خودی سے ان اجزاء و مقدمات کی تکمیل نہیں ہو سکتی، اس لیے ہم نے فلسفۂ خودی کے تمام اجزاء و مقدمات سے نہایت مفصل طور پر بحث کی ہے اور اس بحث کے بعد ڈاکٹر صاحب کا یہ دعویٰ یقیناً صحیح ہے، لیکن سردست سوال صرف اسرار خودی کے متعلق ہے، جس سے اس فلسفہ کی ابتدا ہوئی ہے، اور جس کی نسبت ڈاکٹر صاحب کا دعویٰ ہے کہ وہ مسلمان صوفیہ و حکماء کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے، اس لیے ہم کو صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ اسرار خودی کے فلسفیانہ اجزاء کہاں تک مسلمان صوفیہ اور حکماء کے خیالات سے ماخوذ یا متاثر ہیں؟ اسرار خودی میں فلسفۂ خودی کے جو اجزاء و مقدمات بیان کیے گئے ہیں ان کی ترتیب یہ ہے:

(۱) "در بیان اینکہ اصل نظام عالم از خودی است، و تسلسل حیات تعینات وجود بر استحکام خودی انحصار دارد"،

اور اس جزء کے متعلق خلیفہ عبدالحکیم جنھوں نے اس بحث پر "رومی، نٹشے اور اقبال" کے عنوان سے نہایت جامع اور مفصل مضمون لکھا ہے، لکھتے ہیں کہ

"خودی کے فلسفہ کی تاسیس میں صفحہ ۱۲ پر جو اشعار ہیں وہ فشٹے سے ماخوذ ہیں جس کا فلسفہ یہ تھا کہ عین ذات یا حقیقت وجود ایک انا ہے ساعی ہے عمل اس کی فطرت ہے، اخلاقی عمل اور پیکار اور نشوونما کے لیے اس نے اپنا غیر یا ما سوا پیدا کیا تاکہ امکان پیکار اور اسکے

ذریعہ سے امکان ارتقار ممکن ہوجائے، اس فلسفہ کو جون کا تون اقبال نے اپنے بلیغ و رنگین انداز مین اس طرح بیان کر دیا ہے کہ فلسفہ کا خشک صحرا گلزار ہوگیا ہے۔ مفصلۂ ذیل اقتباس سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے،

پیکر ہستی ز آثار خودی است | ہر چہ می بینی ز اسرار خودی ست

خویشتن را چون خودی بیدار کرد | آشکارا عالمِ پندار کرد

صد جہان پوشیدہ اندر ذاتِ او | غیرِ او پیداست از اثباتِ او

در جہان تخمِ خصومت کاشت است | خویشتن را غیرِ خود پنداشت است

سازد از خود پیکرِ اغیار را | تا فزاید لذتِ پیکار را

می کُشد از قوتِ بازوے خویش | تا شود آگاہ از نیروے خویش

بہرِ یک گل خونِ صد گلشن کند | از پئے یک نغمہ صد شیون کند

عذرِ این اسراف و این سنگین دلی | خلق و تکمیلِ جمالِ معنوی

شعلہ ہاے او صد ابراہیم سوخت | تا چراغ یک محمد بر فروخت

یہ سب فشتے کا فلسفۂ انا اور فلسفۂ حیات ہے، جہان تک افکار اقبال کی اساس کا تعلق ہے اقبال بہ نسبت نٹشے کے فشتے سے زیادہ متاثر ہے، فشتے کی کشمکش حیات مین اخلاق اور روحانیت کی بھی چاشنی ہے، جو نٹشے مین اسقدر نمایان نہین، فشتے ایک خاص انداز کا موحد ہے، اور نٹشے منکر خدا ہے،[1]

(۲) حکایت درین معنی کہ مسئلہ نفی خودی از مخترعات اقوام مغلوبہ بنی نوع انسان است کہ باین طریق مخفی اقوام غالب را ضعیف میسازند"

اور اس سلسلے مین ایک مستقل عنوان سے افلاطون پر جو تنقید کیگئی ہے وہ خلیفہ عبدالحکیم کے الفاظ مین نٹشے سے ماخوذ ہے[2]

(۳) دربیان اینکہ تربیت خودی را سہ مراحل است، مرحلۂ اول را اطاعت و مرحلۂ دوم را ضبط نفس و مرحلۂ سوم را نیابت الٰہی نامیدہ اند"

اور اس جزو کے متعلق خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہین کہ

لے رسالہ اردو، اقبال نمبر ص ۵۲۲، ۲ے ایضاً ص ۵۲۳

ان مراحل مین مرحلۂ اول مین خودی کو شتر قرار دیا ہے، یہ خیال بعینہٖ نٹشے سے ماخوذ ہے، باقی دو مراحل اقبال نے اسلامیات سے لیے ہین، نٹشے کے یہان بھی مراحل تین ہین، وہ کہتا ہے کہ روح حیات تین مراحل مین سے گذرتی ہے، یا یون کہو کہ تبدیلِ ہیئت مین وہ یکے بعد دیگرے تین ہیئتیں اختیار کرتی ہے، پہلی ہیئت مین وہ اونٹ ہے، دوسری مین شیر اور تیسری مین بچہ، ہیئت اشتری مین روح نہایت صبر اور جبر سے اپنے اوپر فرائض اور اوامر و نواہی کا بوجھ لادلیتی ہے، اس کے بعد جبر اور باربرداری احکام مین سے نکل کر وہ جب ہیئت اختیاری مین آتی ہے تو شیر ہوجاتی ہے، لیکن نئی اقدار کے پیدا کرنے کے لیے اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ تیسری ہیئت طفلی ہو جس مین معصومیت اور نسیان کی ضرورت ہے، پہلے مرحلہ کو بالکل بھول جائے، زندگی کو ایک کھیل سمجھے، نئے سرے سے اس کا آغاز کرے، اقبال نے نٹشے کے تین مراحل مین سے صرف مسئلۂ اشتری کو لے لیا، حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے تین مراحل مین سے دو مراحل اطاعت اور ضبط نفس دونون اس مین پائے جاتے ہین، نٹشے کے یہان جو مرحلہ شیری ہے اس کو اقبال نے دوسری جگہ بیان کیا ہے، لیکن اس سلسلے مین اس کو نظر انداز کردیا ہے[۱]،

خلیفہ عبدالحکیم نے ہم کو یہ نہین بتایا کہ ڈاکٹر صاحب نے مرحلہ شیری کو دوسری جگہ کہان بیان کیا ہے، لیکن اگر اس کے معنی جبر سے اختیار مین آنے کے ہین تو اسی سلسلے مین ڈاکٹر صاحب نے اس کو بھی بیان کردیا ہے

تو ہم از بار فرائض سرمتاب	برخوری از عندہ حسن المآب
در اطاعت کوش اے غفلت شعار	میشود از جبر پیدا اختیار

---

[۱] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۸۲۴ و ۸۲۵

(۴) حکایت طائرے کہ از تشنگی بیتاب بود۔

اور اس سلسلے مین ریزۂ الماس اور شبنم پر جو اشعار ہین وہ خلیفہ عبدالحکیم کے الفاظ مین براہ راست نطشے کے زیر اثر لکھے گئے ہین[۱]،

(۵) "حکایت الماس و زغال"

خلیفہ عبدالحکیم کے الفاظ مین اس کا مضمون بھی نطشے سے ماخوذ ہے، نطشے کی اخلاقیات کا اصول اولین جو اس کے مذہب کا کلمہ ہے یہ ہے کہ "سخت ہو جاؤ"۔ اس اصل کی تشریح مین نطشے نے بھی اسی قسم کے استعارون سے کام لیا ہے[۲]،

(۶) "الوقت سیف"

اس عنوان کے تحت مین برگسان کا فلسفۂ وقت بیان کیا گیا ہے اور امام شافعی کے ایک قول سے اس کی تائید کی گئی ہے، لیکن خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہین کہ امام شافعی کے قول کے تحت مین کوئی فلسفہ نہین تھا جو فلسفہ اقبال نے برگسان سے لے کر اس قول کی تفسیر مین پیش کیا ہے، وہ خود امام صاحب کی سمجھ مین نہ آتا، ان کا تدین اور تورع ایسے افکار سے بہت گریزان تھا[۳]،

فلسفۂ خودی کے یہ تمام اجزاء فلاسفۂ مغرب بالخصوص نطشے سے ماخوذ ہین، خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہین کہ "اپنی شاعری کے اس دور مین جس مین اسرار خودی تصنیف کی گئی اقبال نطشے سے متاثر تھے، علاوہ اس داخلی شہادت کے جو اسرار خودی سے بکثرت اور بوضاحت مل سکتی ہے، مجھکو اس بارے مین شخصی طور پر بھی کچھ معلومات حاصل ہین، یورپ کے قیام کے دوران مین اقبال کو اس مومن قلب اور کافر دماغ مجذوب کا فلسفہ بہت دلکش معلوم ہوا[۴]،

دوسرے موقع پر لکھتے ہین کہ "پیام مشرق مین نطشے کا اثر اس قدر نمایان نہین جتنا کہ اسرار خودی

[۱] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۸۲۵ [۲] ایضاً ص ۸۲۶، [۳] ایضاً [۴] ایضاً ص ۷۹۴

ہین ہے[1]

طبقاتی حیثیت سے نٹشے کے نزدیک اخلاق دو طرح کے ہین (۱) آقائی (۲) اور غلامانہ،
صداقت کی تلاش، جرأت، زندگی کو لذت والم اور سود و زیان کے پیمانے سے نہ ناپنا، ہر قسم کا اثبات
اور حیات افزا فعلیت آقائی اخلاق کے مظاہر ہین، اور ہر قسم کی بزدلی، رسوم و قیود سے باہر آنے
کی کوشش نہ کرنا، عجز، قناعت، توکل، خیرات، حلم، عبرت غرضیکہ ہر قسم کی انفعالی صورتین، غلامانہ
اخلاق مین داخل ہین، خیرات کا دینے والا بھی ذلیل ہوتا ہے اور لینے والا بھی،[2]

نٹشے کی اس اخلاقی تقسیم کے بعد اسرار خودی کے یہ اشعار پڑھو

تا کجے دریوزۂ منصب کنی صورتِ طفلان ز نے مرکب کنی

فطرتے کو بر فلک بندد نظر پست میگردد ز احسانِ گر

از سوال افلاس گردد خوارتر از گدائی گدیہ گر نادارتر

از سوال آشفتہ اجزائے خودی بے تجلی نخل سینائے خودی

عشق بادشوار ورزیدن خوش است چون خلیل از شعلہ گل چیدن خوش است

ممکنات قوتِ مردانِ کار گردد از مشکل پسندی آشکار

زندگانی قوت پیدا ستے اصل او از ذوق استیلا ستے

عفو بیجا سردیِ خونِ حیات سکتۂ در بیت موزونِ حیات

ہر کہ در قعرِ مذلت ماندہ است ناتوانی را قناعت خواندہ است

ناتوانی زندگی را رہزن است بطنش از خوف و دروغ آبستن است

گاہ او را رحم و نرمی پردہ دار گاہ می پوشد ردائے انکسار

---

[1] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۸۰۲، [2] ایضاً ص ۷۹۸

گاہ او دستور در مجبوری است　　گاہ پنہان در تہِ معذوری است

چہرہ در شکلِ تن آسانی نمود　　دل ز دستِ صاحبِ قوت ربود

با توانائی صداقت توام است　　گر خود آگاہی ہمین جامِ جم است

زندگی کشت است و حاصل قوت است　　شرحِ رمزِ حق و باطل قوت است

مدعی گر صاحبِ قوت بود　　دعویش مستغنی از حجت بود

تو صاف معلوم ہوگا کہ وہ بالکل نٹشے کے نظریۂ اخلاق کی تفسیر ہین

ڈاکٹر صاحب کے نقادون نے اس کے جواب مین زیادہ سے زیادہ یہ کیا ہے کہ نٹشے اور ڈاکٹر صاحب کے فلسفہ مین فرق و امتیاز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہین کہ "نٹشے کے افکار مین سے اقبال کو تعمیر خودی، استحکام خودی اور عروج آدم کا مضمون پسند آیا، لیکن نٹشے کے یہان تخریبی افکار بہ نسبت ترکیبی افکار کے بہت زیادہ ملتے ہین۔ اس مین جلال کا پہلو جمال کے پہلو پر اس قدر غالب ہے کہ ہستی محض ایک میدان کارزار بنجاتی ہے، اقبال خودی کے ساتھ ایک بیخودی کا فلسفہ بھی رکھتا ہے، ایک کو دوسرے کے بغیر ناقص سمجھتا ہے، نٹشے کے یہان انفرادی خود اختیاری کا اس قدر زور ہے کہ فرد کا رشتہ ملت اور کائنات سے نہایت غیر معین اور مبہم سا رہ جاتا ہے، اس کے یہان قاہری غالب ہے اور دلبری مغلوب، اقبال کے نصب العین مین ناز کے ساتھ نیاز بھی ہے، ادعا کے ساتھ تسلیم و رضا بھی ہے، نٹشے جمہوریت اور مساوات کا دشمن ہے، اور غریبون اور کمزورون کے لیے اس کے پاس نفرت کے احساس کے سوا کچھ نہین، اقبال بھی جمہوریت کی موجودہ شکلون کو دھوکا سمجھتا ہے، لیکن ایک اعلیٰ سطح پر صحیح مساوات کا متلاشی ہے، نٹشے کے یہان صداقت کا معیار قوت کے سوا کچھ نہین، تنازع للبقاء کا انداز ظالمانہ، بیرحمانہ اور جابرانہ ہے، اقبال کے یہان محض قوت صداقت کا معیار نہین، نٹشے خدا کا منکر ہے، اقبال

اعلیٰ درجہ کا موحد ہے، اقبالؔ تمام نوع انسانی کو ابھارنا چاہتا ہے۔ نٹشے کی نظر فقط چند کامل افراد پر ہے جو تمام پیکار حیات کا ماحصل ہیں، نٹشے نے ڈاروِن کے نظریۂ حیات پر اخلاق اور فلسفے کی بنیاد رکھی، اس کا یہ خیال کہ اسی نظریہ کے ماتحت آنے والا انسان موجودہ انسان سے اتنا ہی مختلف ہو سکتا ہے جتنا کہ موجودہ انسان کیڑوں مکوڑوں سے مختلف ہو گیا ہے، انسانی نصب العین میں بڑی قوت پیدا کر سکتا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ نٹشے کسی وجہ سے بڑے زور شور سے یہ عقیدہ بھی رکھتا تھا کہ کائنات اپنے حوادث کو ازلی اور ابدی طور پر دوہراتی رہتی ہے، جو کچھ ہو رہا ہے وہ پہلے بھی ہو چکا ہے، جو مخلوق اس وقت ہے وہ پہلے بھی موجود رہ چکی ہے اور آئندہ بھی بار بار وجود میں آتی رہے گی، تکرار ابدی کا یہ عقیدہ نٹشے کے جوش ارتقاء کے خلاف پڑتا ہے[۱]۔

(۱) لیکن اس جواب میں دو نقص ہیں، ایک تو یہ کہ اس اعتراض کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے نٹشے یا اور کسی فلسفی کا فلسفہ بعینہٖ اس کی تمام خصوصیات کے ساتھ لے لیا ہے، بلکہ ایک مسلمان کے مذہبی اور اخلاقی مقاصد کے لیے ان کو جس فلسفی کی کوئی بات پسند آئی اس کو انھوں نے لے لیا، اور اس حیثیت سے فلاسفۂ مغرب میں ان کی نگاہ سب سے پہلے نٹشے پر پڑی اور اسکے فلسفہ میں سے انھوں نے صرف وہ باتیں اخذ کر لیں جو اسلام کے مطابق تھیں، چنانچہ خود خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں کہ "اقبال کو نٹشے کی تعلیم کا وہی پہلو پسند ہے جو اسلام کی تعلیم کا ایک امتیازی عنصر ہے، اسلام کے اس پہلو سے متاثر ہونے کی وجہ سے اقبال نے نٹشے کا اثر قبول کیا، اسلام نے جہاد کو ایمان کا ثبوت قرار دیا اور کہا کہ جہاد ہی اس امت کی رہبانیت ہے، زندگی باوجود اس کی کلفت اور کشاکش کے اسلام کے نزدیک ایک نعمت ہے، جس میں قوت اور جمال پیدا کرنا ہر مومن کا فریضہ ہے، ارتقائے حیات، علوئے آدم، تسخیر فطرت، احترام حیات جسم اور مادے

[۱] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۴۳۴

کو روحانیت کا معاون سمجھنا حصولِ قوت کی کوشش یہ تمام چیزین اسلام اور نیٹشے کی تعلیم مین بہت حد تک مشترک ہین، گو انداز بیان بہت مختلف ہے،[1]

ان کے علاوہ جو باتین مذہب اسلام کے خلاف تھین ان کو چھوڑ دیا اس لیے اس فرق و امتیاز کے دکھانے سے یہ ثابت نہین ہوتا کہ اسرار خودی کا فلسفہ خودی نیٹشے سے ماخوذ و متاثر ہی نہین ہے،

(۲) دوسرے یہ کہ اعتراض کی ابتدا، مثنوی اسرار خودی سے ہوئی اس لیے اسرار ہی کے فلسفہ کو پیش نظر رکھکر اس کا جواب دینا چاہیے تھا، لیکن جواب دینے والون نے ان فروق و امتیازات کو بھی پیش نظر رکھا ہے، جو ڈاکٹر صاحب کے فلسفہ مین اسرار خودی کے بعد پیدا ہوے ہین مثلاً "فلسفہ بیخودی جس کی نسبت خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہین کہ" اقبال خودی کے ساتھ ایک بیخودی کا فلسفہ بھی رکھتا ہے اسرار خودی کے بعد پیدا ہوا، اور ڈاکٹر صاحب نے اس کے متعلق ایک مستقل مثنوی رموز بیخودی کے نام سے لکھی، یا یہ کہ ان کا فلسفۂ خودی سے کوئی تعلق ہی نہین، مثلاً جمہوریت جس کی نسبت خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہین کہ نیٹشے جمہوریت اور مساوات کا دشمن ہے، اور اقبال بھی جمہوریت کی موجودہ شکلون کو دھوکا سمجھتا ہے، ایک سیاسی چیز ہے، اور ڈاکٹر صاحب نے اسرار خودی مین اس پر کچھ نہین لکھا ہے، بلکہ بعد کی نظمون مین اس کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کیے ہین، بہر حال اسرار خودی کے اکثر فلسفیانہ اجزاء، تو فلاسفۂ مغرب سے ماخوذ ہین، اس مین حکمائے اسلام کے خیالات کا پرتو بہت کم پایا جاتا ہے، البتہ اسلامی تصوف مین سے انھون نے صرف عشق کا نظریہ مولانا روم سے لیا ہے، اور نہایت بلند آہنگی سے اس کا اعتراف کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہین،

روے خود بنمود پیر حق سرشت | کو بحرف پہلوی قرآن نوشت
گفت اے دیوانۂ ارباب عشق | جرعۂ گیر از شراب ناب عشق

[1] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۸۱۶

اسرار خودی کے علاوہ انھون نے اپنی دوسری تصنیفات مین بھی مولانا روم کا نام پیرومرشد کی حیثیت سے لیا ہے، چنانچہ پیام مشرق مین فرماتے ہین:

مطرب غزلے، بیتے از مرشد روم آور | تا غوطہ زند جانم در آتش تبریزے

بیا کہ من زخم پیر روم آوردم | مے سخن کہ جوان تر ز بادۂ عنبی است

زبور عجم مین لکھتے ہین،

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی | برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

بال جبریل مین کہتے ہین،

علاج آتشِ رومی کے سوز مین ہے ترا | تری خرد پہ ہے غالب فرنگیون کا فسون

اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن | اسی کے فیض سے میرے سبو مین ہے جیحون

اس بنا پر شاعرانہ، فلسفیانہ، اور متکلمانہ غرض ہر حیثیت سے ہم کو یہ پتہ لگانا چاہیے کہ ڈاکٹر صاحب نے مولانا روم سے کیا کیا فیوض و برکات حاصل کئے ہین،

(۱) شاعرانہ حیثیت سے ہندوستان بلکہ ایران مین بھی ڈاکٹر صاحب کے زمانے مین جب شاعری کا عام طور پر رواج تھا وہ عاشقانہ شاعری تھی، اور خود ڈاکٹر صاحب نے بھی اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی تھی، اس کے بعد زمانہ کی ضروریات اور مغربی شاعری کی تقلید مین قومی، سیاسی اور نیچرل نظمون کا رواج ہوا، اور ڈاکٹر صاحب نے بھی ان اصنافِ سخن مین طبع آزمائی کی، لیکن اب تک ہندوستان اور ایران مین فلسفیانہ اور متکلمانہ شاعری کا آغاز نہین ہوا تھا، ایران مین بھی مولانا روم کے زمانے تک زیادہ تر غزل، قصیدہ، اور رزمیہ مثنویون کا رواج تھا فلسفیانہ اور متکلمانہ مباحث شاعری مین بہت کم آئے تھے، مولانا روم پہلے شخص ہین جنھون نے اپنی مثنوی کو اس قسم کے مباحث و مسائل سے لبریز کردیا، اور انھون نے ڈاکٹر صاحب

کو بھی ہدایت کی کہ اب عشق و ہوس اور مداحی اور شاگستری کا زمانہ نہین رہا بلکہ شاعری کو علوم و فنون کے دقیق مسائل سے آشنا کرنا چاہیے، جیسا کہ مثنوی معنوی مین اس قسم کے مسائل مذکور ہین، چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اس ہدایت کے مطابق ایک علمی اور فلسفیانہ شاعری کی ابتدا کی،

باز بر خوانم ز فیض پیر روم دفتر سربستۂ اسرار علوم

لیکن اس کے ساتھ مولانا روم نے ڈاکٹر صاحب کو یہ ہدایت بھی کی کہ اس شاعری سے قوم مین عملی طور پر انقلاب اور بیداری پیدا کرنا مقصود ہو، اور اس کی حیثیت محض شاعری کی نہ ہو، بلکہ ایک انقلاب انگیز پیغام کی ہو،

از نیستان ہمچو نے پیغام دہ قیس را از قوم حے پیغام دہ
نالہ را انداز نو ایجاد کن بزم را از ہاے و ہو آباد کن
روح نو سے جوید اجسام کہن کمتر از قم نیست اعجاز سخن
خیز و جانِ نو بدہ ہر زندہ را از قُم خود زندہ تر کن زندہ را
خیز و پا بر جادۂ دیگر بنہ جوشِ سوداے کہن از سر بنہ

اس بنا پر ڈاکٹر صاحب نے اس انقلاب انگیز پیغام اور حیات بخش شاعری کے لیے اگرچہ چند اجزا، فلاسفۂ مغرب سے بھی لیے تاہم اصل پیغام مولانا روم ہی کے فیوض و برکات کا نتیجہ ہی،

(۲) اس پیغام کے قبول کرنے کے لیے خوش قسمتی سے ڈاکٹر صاحب اور مولانا روم مین طبعی مناسبت بھی موجود تھی، مولانا شبلی مولانا روم کے حالات مین لکھتے ہین کہ "تصوف کے مقامات مین دو مقام آپس مین متقابل ہین، فنا، و بقا، مقام فنا مین سالک پر خضوع، مسکینی، اور انکسار کی کیفیت غالب ہوتی ہے، بخلاف اس کے بقا مین سالک کی حالت جلال اور عظمت سے لبریز ہوتی ہے، مولانا پر یہ نسبت زیادہ غالب رہتی تھی. اس لیے ان کے کلام مین جو جلال،

ادعا، بیباکی اور بلند آہنگی پائی جاتی ہے، صوفیہ مین سے کسی کے کلام مین نہین پائی جاتی"[1]

اور ڈاکٹر صاحب بھی فطرۃً اسی قسم کی پرجوش اور غلغلہ انگیز طبیعت رکھتے تھے، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہین،

شرار ے جستہ، گیر از درونم   کہ من مانند رومی گرم خونم

اس طبعی مناسبت کی وجہ سے انھون نے تمام صوفیہ مین مولانا روم کا اثر سب سے زیادہ قبول کیا، چنانچہ خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہین کہ "عارف رومی اور علامہ اقبال مین بہت مماثلت پائی جاتی ہے، دونون اعلیٰ درجہ کے شاعر ہین، دونون اسلامی شاعر ہین، دونون کی شاعری حکیمانہ ہے، دونون معقولات کے سمندر کے تیراک ہونے کے باوجود وجدانات کو معقولات پر مرجح سمجھتے ہین، دونون خودی کی نفی کے بجائے خودی کی تقویت چاہتے ہین، دونون کے نزدیک حقیقی خودی اور حقیقی بیخودی مین کوئی تضاد نہین بلکہ ایک کے بغیر دوسری مہمل اور بے نتیجہ ہے، دونون کا تخیل تقدیر کے متعلق عام مسلمہ تخیل سے الگ ہے، دونون کا خیال ہے کہ تقدیر مین جزئی طور پر اعمال افراد پہلے ہی سے خدا کی طرف سے متعین اور مقدر نہین بلکہ تقدیر آئین حیات کا نام ہے، دونون ارتقائی متفکر ہین، نہ صرف انسان بلکہ تمام موجودات ادنیٰ سے اعلیٰ منازل کی طرف عروج کر رہے ہین، انسان کے عروج کی کوئی حد نہین، قوت، آرزو اور جہد صالح سے کئی نئی کائناتین انسان پر نہ صرف منکشف ہو سکتی ہین بلکہ خلق ہو سکتی ہین، دونون قرآن کریم کے آدم کو نوع انسان کی معراج کا ایک نصب العین تخیل سمجھتے ہین، دونون جد وجہد کو زندگی اور خستگی کو موت سمجھتے ہین، دونون کے یہان بقا مشروط ہے، سعی بقا پر، دونون اپنے سے پیشتر پیدا کردہ افکار سے کما حقہ واقف ہین، اور متضاد عناصر کو ایک بلند تر وحدت فکر کی سطح پر لانا چاہتے ہین، اس ازلی اور طبعی مناسبت کی وجہ سے اقبال اپنے آپ کو عارف رومی کا مرید سمجھتا ہے، یہ مرید معمولی تقلیدی

[1] سوانح مولانا روم ص ۵۵-۵۶

مرید نہین ، کمالِ عقیدت کے ساتھ پیر کے رنگ مین رنگا ہوا مرید ہے"[1]

افسوس ہے کہ خلیفہ عبد الحکیم نے اس موقع پر اجمال سے کام لیا ہے، ورنہ ضرورت یہ تھی کہ مولانا روم اور ڈاکٹر صاحب دونون کے کلام سے بالمقابل شواہد پیش کیے جاتے، تاہم خود ڈاکٹر صاحب کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انھون نے کون کون سی خاص باتین مولانا روم سے اخذ کی ہین،

(۱) ان مین پہلی چیز تو خودی کا تصور ہے، جو ڈاکٹر صاحب کے فلسفہ کی اساس ہے، اور اسی پر ان کے تمام فلسفیانہ خیالات کی بنیاد ہے، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصور یورپین فلاسفہ بالخصوص نٹشے سے ماخوذ ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس تخیل کو مولانا روم سے اخذ کیا ہے، چنانچہ جاویدنامہ مین اس فلسفے کو انھون نے مولانا روم کی زبان سے اس طرح بیان کیا ہے،

روحِ رومی پردہ ہا را بر درید — از پسِ کہ پارۂ آمد پدید
گفتمش موجود و ناموجود چیست؟ — معنیِ محمود و نامحمود چیست؟
گفت موجود آنکہ مے خواہد نمود — آشکارائی تقاضاے وجود
زندگی خود را بخویش آراستن — بر وجودِ خود شہادت خواستن
انجمن روزِ الست آراستند — بر وجودِ خود شہادت خواستند
زندۂ یا مردۂ یا جان بلب — از سہ شاہد کن شہادت را طلب

(۲) لیکن اس خودی کو اگر بالکل مطلق العنان چھوڑ دیا جائے تو وہ ایک شیطانی قوت بنجاتی ہے، جس کا کام تخریب و فساد، لوٹ مار، گمراہی و ضلالت اور قتل و غارت کے سوا کچھ نہین ہوتا، تاتاریون نے دنیاے اسلام کو جو تباہ و برباد کیا وہ اسی مطلق العنان خودی کا نتیجہ تھا، اور آج یورپین قومون مین اسی قسم کی خودی پائی جاتی ہے، اس لیے اس مین اعتدال پیدا

[1] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۸۸، ۸۹،

کرنے کے لیے اس کو کسی آئین کا پابند بنانا ضروری ہے، چنانچہ ڈاکٹر صاحب خود ایک خط میں لکھتے ہیں

دین اسلام جو ہر مسلمان کے عقیدہ کی رو سے ہر شے پر مقدم ہے، نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لیے حدود معین کرتا ہے، ان حدود کے معین کرنے کا نام اصطلاح اسلام میں شریعت یا قانون الٰہی ہے، خودی خواہ مسولینی کی ہو خواہ ہٹلر کی، قانون الٰہی کی پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے، مسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کے لیے پامال کیا، مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں حبشہ کی آزادی کو محفوظ رکھا، فرق صرف اس قدر ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون کی پابند نہیں، دوسری صورت میں قانون الٰہی اور اخلاق کی پابند ہے، بہرحال حدود خودی کے تعین کا نام شریعت ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے، جب احکام الٰہی خودی میں اس حد تک سرایت کر جائیں کہ خودی کے پرائیویٹ امیال و عواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا مقصود ہو جائے تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیائے اسلام نے فنا کہا ہے، بعض نے اسی کا نام بقا رکھا ہے[1]

خودی کو شریعت یا قانون الٰہی کا پابند بنانے کے لیے دو باتوں کی سخت ضرورت ہے

۱- ایک تو یہ کہ بنی نوع انسان کے دوسرے افراد کا بھی لحاظ رکھا جائے، اور ان کے ساتھ اتحاد پیدا کیا جائے، نٹشے نے دنیا کو آقا اور غلام کے دو طبقوں میں تقسیم کر کے بنی نوع انسان کے کمزور افراد کو طاقتور افراد سے بالکل الگ کر دیا تھا، اس لیے اس کے فلسفہ کی رو سے اخلاق کا جمال آمیز پہلو یعنی لطف و محبت، تواضع و انکسار، رحم و ہمدردی وغیرہ کا خاتمہ ہو گیا تھا، ڈاکٹر صاحب نے اسی بنا پر اسرار خودی کے بعد رموز بیخودی لکھ کر اس کی تکمیل کی اور فرد کا رشتہ ملت کے ساتھ

[1] اقبال نامہ ص ۲۰۲، ۲۰۳

قائم کیا، لیکن تکمیل خودی کا یہ اخلاقی نظریہ انھون نے مولانا روم ہی سے اخذ کیا ہے، چنانچہ مولانا روم نے جاوید نامہ مین خودی کے جو دو مراتب بتائے ہین ان مین پہلا مرتبہ یہ ہے،

شاہد اول شعورِ خویشتن　　　　خویش را دیدن بنورِ خویشتن

اسی کا دوسرا نام خودی ہے،

لیکن انسان کو صرف اپنے ہی نور کے مشاہدے مین محو و مستغرق نہین ہو جانا چاہیے بلکہ اپنے ساتھ بنی نوع انسان کے دوسرے افراد کے نور کا بھی مشاہدہ کرنا چاہیے،

شاہدے ثانی شعورِ دیگرے　　　　خویش را دیدن بنورِ دیگرے

اور اسی مرتبہ کا نام فلسفۂ بیخودی ہے، اب اپنی خودی کے ساتھ اگر دوسرون کی خودی کو بھی شامل کر لیا جائے تو اخلاقی حیثیت سے جلال و جمال کے دونون پہلو باہم متحد ہو جاتے ہین اور جمال و جلال کا جو اتحاد ڈاکٹر صاحب کے کلام مین پایا جاتا ہے وہ مولانا روم کے اسی چشم و ابرو کا اشارہ ہے،

۲- دوسرے یہ کہ انسانی خودی کا رشتہ خداوند تعالیٰ کی ذات سے منقطع نہ ہونے پائے نٹشے خدا کا منکر ہے، اس لیے اس نے خودی کا جو نظریہ قائم کیا ہے وہ بالکل ملحدانہ ہے، لیکن مولانا روم نے ڈاکٹر صاحب کو تکمیل خودی کے لیے بتایا کہ

شاہد ثالث شعورِ ذاتِ حق　　　　خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق

پیش این نور ار بمانی استوار　　　　حی و قائم چون خدا خود را شمار

۳- خالق و مخلوق اور عبد و معبود مین یہ تعلق صرف عشق و محبت سے پیدا ہو سکتا ہے، مولانا روم کے زمانے مین چونکہ مسلمانون کی عقلی ترقی درجۂ کمال کو پہنچ گئی تھی اس لیے لوگ خدا کو عشق کے بجائے عقل سے دیکھتے تھے، بااینہمہ اس زمانے مین خدا بالکل گم نہین ہوا تھا، بلکہ موجود تھا، البتہ اس سے تعلق پیدا کرنے کا طریقہ عشق کے بجائے عقل کو قرار دیا گیا تھا، صرف

صوفیون کا گروہ ایسا تھا جو خدا کو عقل کے بجائے عشق کی عینک سے دیکھتا تھا، اور ان مین مولانا روم سب کے پیشرو تھے،

ڈاکٹر صاحب کے زمانے مین عقلی ترقی اس زمانے سے بھی زیادہ ہوگئی تھی، اُس زمانے مین تو خدا کم از کم موجود تھا، لیکن اس زمانے مین سرے سے موجود ہی نہین ہُے، اس زمانے مین عقل کے ساتھ عشق کا وجود بھی تھا لیکن اس زمانے مین صرف عقل ہی عقل ہے، عشق کا وجود نہین، اس لیے مولانا روم اور ڈاکٹر صاحب کا زمانہ اس حیثیت سے باہم مشابہت رکھتا ہے، اور دونون ایک ہی قسم کے فتنہ انگیز زمانے مین موجود تھے، اور دونون نے ایک ہی قسم کی بلند آہنگی کے ساتھ اپنے زمانے کے عقلی رجحان کی مخالفت کی، اور لوگون کو عشق و محبت کی طرف مائل کیا، اس بنا پر خودی کی تکمیل کے لیے عشق و محبت کا نظریہ انھون نے ابتدا ہی سے مولانا روم سے لیا، اور آخر تک اس نظریہ پر قائم رہے، چنانچہ ارمغانِ حجاز مین جو قطعات مولانا روم پر لکھے ہین ان مین صاف صاف تصریح کی ہے کہ

نئے آن نے نواز پاکباز ے | مرا با عشق و مستی آشنا کرد
مے روشن ز تاکِ من فرو ریخت | خوشا مردے کہ در دامانم آویخت
نصیب از آتشے دارم کہ اول | سنائی از دلِ رومی برانگیخت

اگرچہ تمام صوفیہ نے خدا سے تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ عشق کو قرار دیا تھا، لیکن ان کے نزدیک اس عشق کا آخری درجہ یہ تھا کہ انسان اپنی خودی کو خدا کی ذات مین بالکل فنا کردے اور خود اس کا کوئی وجود باقی نہ رہے، لیکن مولانا روم کے نزدیک انسان اپنی خودی کو خدا کی ذات مین فنا کرنے کے بعد بھی قائم رکھ سکتا ہے، خلیفہ عبد الحکیم لکھتے ہین کہ "رومی انفرادی بقا کا قائل ہے۔ اور کہتا ہے کہ خدا مین انسان اس طرح محو نہین ہوجاتا جس طرح کہ

قطرہ سمندر میں محو ہو جاتا ہے، بلکہ ایسا ہوتا ہے جیسے کہ سورج کی روشنی میں چراغ جل رہا ہے یا جیسے لوہا آگ میں پڑ کر آگ ہو جاتا ہے لیکن باوجود اس کے اس کی انفرادیت باقی رہتی ہے[1]

ڈاکٹر صاحب کے فلسفۂ خودی کے لیے بھی یہی نظریہ مناسب تھا، اس لیے انھوں نے اس کو مولانا روم سے اخذ کیا،

دوسرے صوفیہ نے ذات خداوندی میں انفرادی خودی کی محویت کا جو نظریہ قائم کیا تھا، اس نے انسان کے تمام ایجابی اخلاق مثلاً جرأت، شجاعت، عزم و استقلال وغیرہ کو فنا کر کے اس میں سلبی اخلاق مثلاً زہد و قناعت، توکل، گوشہ گیری اور عجز و انکسار پیدا کر دیے تھے، لیکن مولانا روم کے نظریۂ عشق کے رو سے انسان کے ایجابی اخلاق اور بھی زیادہ مستحکم اور ترقی یافتہ ہو جاتے ہیں، اس لیے خدا کی ذات میں محو ہو کر ایک بزدل انتہا درجہ کا بہادر ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام صوفیہ میں ڈاکٹر صاحب نے مولانا روم کے نظریۂ عشق کو اختیار کیا، اور لوگوں کو ہدایت کی کہ

بگیر از ساغرش آن لالہ رنگے　　　کہ تاثیرش دہد لعلے بسنگے

غزالے را دل شیرے بہ بخشند　　　بشوید داغ از پشت پلنگے

اس قطعہ میں یہ لطیف اشارہ موجود ہے کہ مولانا روم کا نظریۂ عشق انسان کو اخلاقی حیثیت سے جلال و جمال دونوں کا بہترین مجموعہ بنا سکتا ہے،

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ڈاکٹر صاحب کا فلسفہ کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ انھوں نے دوسروں کی خوشہ چینی کر کے ان ہی کے فلسفہ کو شاعرانہ اسلوب و رنگ کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے، بلکہ ان کے فلسفۂ خودی کے تمام اساسی مضامین درحقیقت قرآن مجید سے ماخوذ ہیں، اور قرآن مجید میں فضیلت انسان، تسخیر فطرت، عزم و استقلال

[1] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۳۳۸، ۳۳۴

جرأت و شجاعت، فتح و نصرت، حمیت و غیرت اور قدرت و اختیار پر بہ کثرت آیتیں موجود ہیں،
اور انہی آیتوں نے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کو خودی یعنی جلال و جمال دونوں کا بہترین مجموعہ
بنا دیا تھا، ڈاکٹر صاحب نے یہ تمام مضامین قرآن مجید ہی سے لیے، اس کے بعد انھوں نے فلسفہ و
تصوف پر نگاہ ڈالی تو ان کو دو متضاد فلسفیانہ اور صوفیانہ نظریے نظر آئے، ایک تو شوپنہار
کا قنوطی فلسفہ تھا جو سراپا قرآن مجید کی تعلیمات کے خلاف اور خودی کے تمام عناصر کا بیخ کن
تھا، اس کے برخلاف نطشے کا فلسفہ تھا جو اگرچہ تمام تر تقویم خودی پر مبنی تھا، لیکن یہ خودی ایک
محدود اور شیطانی خودی تھی، جس کا تعلق خدا اور عام بنی نوع انسان سے نہ تھا، اسی طرح صوفیانہ
تعلیمات بھی مختلف تھیں، تصوف کی عام کتابیں، بالخصوص صوفیانہ شاعری کا تمام تر ذخیرہ اشراقی
اور افلاطونی فلسفہ سے متاثر تھا، جو زندگی کو ہیچ قرار دیتا تھا، اور صرف سلبی اخلاق کی تعلیم دیتا تھا،
لیکن مثنوی مولانا روم میں ان کو جابجا ایسے اشعار، ایسے خیالات اور ایسے نظریات ملے جو
قرآن مجید کی تعلیمات کے موافق اور فلسفۂ خودی کے مؤید ہیں، ڈاکٹر صاحب نے ان تمام فلسفیانہ
اور صوفیانہ نظریات میں سے شوپنہار اور عام صوفیانہ تعلیمات اور صوفیانہ شاعری کے تمام ذخیرہ
کو قرآن مجید کی تعلیمات کے مخالف پایا، اس لیے ان کو بالکل نظر انداز کر دیا، اسی طرح نطشے
کے فلسفہ میں ان کو خودی کے جو شیطانی عناصر نظر آئے ان کو تو انھوں نے بالکل چھوڑ دیا،
البتہ اصل مسئلہ کو لے کر اس شیطانی خودی کو یزدانی خودی بنا دیا، اور اس میں ان کو قرآن مجید
کے بعد مولانا روم کی مثنوی سے مدد ملی، لیکن اس معاملہ میں انھوں نے درجہ بدرجہ ترقی کی، پہلے
تو انھوں نے اسرار خودی میں خودی کا ایک سادہ اور نامکمل خاکہ قائم کیا جو زیادہ تر حکمائے
یورپ، بالخصوص نطشے کے خیالات و نظریات کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا، اور اسی خاکہ کو پیش نظر
رکھکر یورپین تنقید نگاروں نے یہ رائے قائم کی کہ ان کا فلسفہ تمام تر نطشے کے فلسفہ سے ماخوذ ہے،

لیکن اس کے بعد انھون نے اس فلسفہ کے اجزاء و مقدمات مین جو تصرفات اور اضافے کیے اور اسکو جس شاعرانہ آب ورنگ کے ساتھ پیش کیا، اس نے ان کے فلسفہ کو نٹشے کے فلسفہ اور مولانا روم کے صوفیانہ نظریون سے بالکل مختلف کر دیا، ان کو منتشر طور پر صرف چند ذرے ملے تھے لیکن انہی ذرون کو چمکا کر انھون نے آفتاب بنا دیا، انھون نے صرف چند موتی پائے تھے، لیکن انھون نے ان کو پرو کر ایک خوشنما ہار تیار کر دیا، ان کو صرف چند دائرے اور خطوط ہاتھ آئے تھے لیکن انہی کی مدد سے انھون نے ایک مکمل مرقع تیار کر لیا جس مین خودی کی تصویر نمایان طور پر نظر آ گئی، انھون نے بے شبہہ نٹشے اور اسکے ساتھ بہت سے فلسفیون کا اثر قبول کیا لیکن اثر پذیری اور نقالی مین زمین و آسمان کا فرق ہے، شکسپیر کے متعلق آج یہ طے ہو چکا ہے کہ اس کے تمام ڈرامون کا ماخذ پرانی کہانیان ہین لیکن اس کے باوجود اس نے ان مین جو آب و رنگ اور روغن بھرا اور جو دیدہ زیب قالب انھین بخشا وہ اسے ہمیشہ ایک اوریجنل شاعر کی حیثیت سے مشہور رکھے گا، یہی صورت ڈاکٹر صاحب کی ہے، دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا شخص بھی نیستی سے ہستی یا عدم سے وجود کو پیدا کرنے کا مدعی نہین ہو سکتا، ڈاکٹر صاحب بھی یہ دعویٰ نہین کر سکتے، البتہ انھون نے رائج الوقت افکار و خیالات کو اپنی قوت متخیلہ کے قالب مین ڈھالکر مسلمانون کے سامنے جو کچھ پیش کیا ہے وہ بالکل ایک نئی چیز ہے، ہر مصور خطون اور دائرون ہی سے کام لیتا ہے، لیکن اگر محض اس بنا پر کسی مصور کو نقال نہین کہا جا سکتا تو ڈاکٹر صاحب جیسے مصور افکار کو بھی نقال کہنا صحیح نہ ہوگا۔[1]

غرض "شعر" مین ڈاکٹر صاحب نے حکمت کے جو موتی پروئے ہین ان کے متعلق محض یہ کہدینا ناانصافی ہو گی کہ وہ موتی انھون نے دوسرے جوہریون سے لیے ہین، ہیرا جب تک تراشا نہ جائے، اور موتی جبتک مالا مین پرویا نہ جائے اور جواہرات جب تک زیور مین جڑے نہ جائین ان کا جمال معمولی سنگ ریزون

---

[1] پیغام حق اقبال نمبر ص ۲۶۰، ۲۶۱

اور خزف پاروں سے زیادہ نہیں ہوتا، ڈاکٹر صاحب نے شاعری پر جو احسان کیا ہے، وہ یہ ہے کہ مشرق اور مغرب اور ماضی و حال کے وہ جواہر پارے جو نفس انسانی کے آسمان کے تارے ہیں کمال شاعری سے اس طرح تراشے اور پروئے اور جڑے ہیں کہ نوع انسان کے لیے ہمیشہ کے لیے بصیرت افروز ہو گئے ہیں[۱]"

ڈاکٹر صاحب نے ان جواہر پاروں پر بھی اندھا دھند ہاتھ نہیں مارا ہے بلکہ ان میں تصرفات اور اضافے کیے ہیں، اس لیے "جہاں تک افکار کا تعلق ہے انھوں نے نہ رومی کا کامل تتبع کیا ہے، نہ نٹشے کا، نہ برگساں کا اور نہ کارل مارکس کا، نہ لینن کا، اپنے تصورات کا قالین بنتے ہوئے انھوں نے رنگین دھاگے اور بعض خاکے ان لوگوں سے لیے ہیں لیکن ان کے مکمل قالین کا نقشہ کسی دوسرے کے نقشے کی ہو بہو نقل نہیں ہے، اپنی تعمیر کے لیے انھوں نے ان افکار کو سنگ و خشت کی طرح استعمال کیا ہے، ڈاکٹر صاحب ان متفکر شاعروں میں ہیں جن کے پاس اپنا ایک خاص زاویۂ نگاہ اور نظریۂ حیات بھی ہوتا ہے، محض افکار کے ادھر اُدھر سے اخذ کردہ عناصر سے اس کی توجیہ نہیں ہو سکتی[۲]"

"عشق اور عقل کا باہمی تعلق جس پر ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعری کا بہت سا حصہ وقف کیا ہے پیر رومی کا خاص مضمون ہے، ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون میں فقط مرشد کے الفاظ کو دہرایا نہیں بلکہ جدتِ افکار سے اس میں بہت دلکش رنگ اپنی طرف سے بھرے ہیں[۳]"

---

[۱] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۸۳۰، ۸۳۱۔ [۲] ایضاً ص ۸۳۱۔ [۳] ایضاً ص ۸۳۳

فلسفۂ بیخودی

ڈاکٹر صاحب سے پہلے خودی اور بیخودی مین باہم کوئی ربط و علاقہ نہ تھا، اس لیے دو نون ناکمل تھے، نٹشے کے یہان، جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہین "انفرادی خود اختیاری کا اسقدر زور ہے کہ فرد کا رشتہ ملت اور کائنات سے نہایت غیر معین اور غیر مبہم سا رہ جاتا ہے" لیکن ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ خودی نہایت ناقص ہے،

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہین　　　موج ہے دریا مین اور بیرون دریا کچھ نہین

اس کے برعکس صوفیہ انفرادی خودی کو خدا کی ذات مین بالکل فنا کر دینے کی تعلیم دیتے تھے، اور اس غرض سے وہ انفرادی خودی کو قطرہ سے اور خدا کو دریا سے تشبیہ دیتے تھے، جس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح قطرہ دریا سے مل کر بالکل فنا ہو جاتا ہے، اسی طرح انسان کو اپنی خودی خدا کی ذات مین فنا کر دینی چاہیے، لیکن ڈاکٹر صاحب اس کی مخالفت کرتے ہین، اور کہتے ہین کہ اگر قطرہ دریا مین جا کر موتی نہ بنا اور بالکل فنا ہو گیا تو یہ سراسر اس کا نقصان ہے کہ اپنی گرہ کا مال بھی گیا اور کچھ حاصل بھی نہ ہوا،

ز خود گذشتہ اے قطرۂ محال اندیش　　　شدن بہ بحر و گہر برنخاستن ننگ است

اس لیے وہ اس قطرہ کو ایک ایسے دریا مین جانے کی تعلیم دیتے ہین جس مین ابھرنے اور ڈوبنے دونون حالتون مین خودی اور بھی نمایان ہوتی ہے،

کبھی دریا سے مثل موج ابھر کر　　　کبھی دریا کے سینے مین اتر کر

کبھی دریا کے ساحل سے گذر کر — مقام اپنی خودی کا فاش تر کر

لیکن یہ دریا خدا کی ذات نہین جیسا کہ صوفیہ کا خیال ہے بلکہ قوم وملت کا وجود ہے، اور اسی دریا مین ڈوب کر افراد انسانی دریا کے اندرونی خزانہ سے مالامال ہو سکتے ہین،

افراد کے ہاتھون مین ہے اقوام کی تقدیر — ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

محروم رہا دولتِ دریا سے وہ غواص — کرتا نہین جو صحبتِ ساحل سے کنارا

اس بحر بیکنار مین ڈوب کر جب افراد اپنی خودی کو بالکل فنا کر دیتے ہین تو وہ گوہر مقصود ہاتھ آجاتا ہے جس کو قومی خودی کہتے ہین۔

مسلمانی غمِ دل در خریدن — چو سیماب از تپ یاران تپیدن

حضورِ ملت از خود در گذشتن — دگر بانگِ انا و ملت کشیدن

اسی بنا پر ڈاکٹر صاحب کہتے ہین کہ

خودی از بیخودی آید پدیدار

اور اب یہ قومی خودی اس قدر بلند ہو جاتی ہے کہ خدائی کا دعوی بھی اسکے لیے جائز ہو جاتا ہے،

انا الحق جز مقامِ کبریا نیست — سزاے او چلیپا ہست یا نیست

اگر فردے بگوید سرزنش بہ — اگر قومے بگوید ناروا نیست

اسی بیخودی یا فرد وملت کے باہمی ربط کو ڈاکٹر صاحب نے مختلف شاعرانہ تمثیلات سے سمجھایا ہے، مثلاً

ڈالی گئی جو فصلِ خزان مین شجر سے ٹوٹ — ممکن نہین ہری ہو سحابِ بہار سے

ہے لازوال عہدِ خزان اسکے واسطے — کچھ واسطہ نہین ہے اسے برگ وبار سے

ہے تیرے گلستان مین بھی فصلِ خزان کا دور — خالی ہے جیبِ گل زرِ کامل عیار سے

جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق مین طیور — رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے

شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو
نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

وہ دور رہنے والے ہنگامۂ جہاں سے
کہتا ہے جنکو انسان اپنی زبان مین تارے
محو فلک فروزی تھی انجمن فلک کی
عرش بریں سے آئی آواز اک ملک کی
اے شب کے پاسبانو اے آسمان کے تارو!
تابندہ قوم ساری گردون نشین تمھاری
چھیڑو سرود ایسا جاگ اٹھین سونیوالے
رہبر ہے قافلون کی تابِ جبین تمھاری
آئینے قسمتون کے تم کو یہ جانتے ہین
شاید سنین صدائین اہل زمین تمھاری
رخصت ہوئی خموشی تارون بھری فضا سے
وسعت تھی آسمان کی معمور اس نوا سے

حسنِ ازل ہے پیدا تارون کی دلبری مین
جس طرح عکس گل ہو شبنم کی آرسی مین
آئینِ نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قومون کی زندگی مین
یہ کاروانِ ہستی ہے تیز گام ایسا
قومین کچل گئی ہین جس کی رواروی مین
آنکھون سے ہین ہماری غائب ہزارون انجم
داخل ہین وہ بھی لیکن اپنی برادری مین
اک عمر مین نہ سمجھے اسکو زمین والے
جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی مین
ہین جذب باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تارون کی زندگی مین

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
برگ سبزے کز نہالِ خویش ریخت
از بہاران تار امیدش شکست
مردمان خوگر بیک دیگر شوند
سفتہ در یک رشتہ چون گوہر شوند
محفلِ انجم ز جذبِ باہم است
ہستیٔ کوکب ز کوکب محکم است

انفرادی حالت مین خودی بالکل خود مختار مطلق العنان، اور سراپا غرور ہوتی ہے، لیکن

جماعت میں شامل ہو کر یہ تمام اخلاقِ رذیلہ بدل جاتے ہیں اور ان کے بجائے باہمی لطف و محبت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

جبر قطعِ اختیارش میکند　　　از محبت مایہ دارش میکند

ناز تا ناز است کم خیزد نیاز　　　ناز ہا سازد بہم خیزد نیاز

در جماعت خود شکن گردد خودی　　　تا ز گلبرگے چمن گردد خودی

لیکن سوال یہ ہے کہ فرد و جماعت کے باہمی ربط کا وہ اصول جس سے عداوت کے بجائے محبت اور ناز کے بجائے نیاز پیدا ہو، کیا ہے؟ یورپ نے اس کے متعلق جو اصول قائم کیے تھے، وہ سب کے سب سیاسی، معاشی اور وطنی حیثیت رکھتے تھے، اس لیے ان سے محبت کے بجائے عداوت اور نیاز کے بجائے ناز پیدا ہوتا تھا، انقلاب فرانس جو اٹھارہویں صدی کے آخر میں شروع ہوا تھا فرد کی آزادی کا علمبردار تھا، لیکن جب مشینی ترقی کے سیلاب نے دولت اور ذخائر دولت کو چند افراد کی ملکیت بنانا شروع کیا اور سرمایہ داروں نے شہنشاہیت کے ساتھ سازباز کر کے پوری دنیا کو چند افراد کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تو فرد کی آزادی کے خلاف بغاوت شروع ہوئی اور اس بغاوت نے ایک طرف تو مارکس کی بین الاقوامی اشتراکیت کو پیدا کیا، اور دوسری طرف میکیاولی کے قومی اتحاد کے تصور کو رفتہ رفتہ جرمنی کی قومی اشتراکیت (نیشنل سوشلزم) اور اٹلی کی فسطائیت (فاشزم) کے روپ میں جلوہ گر کیا، جس کا فرد کو جماعت پر قربان کر دینا سب سے پہلا اصول ہے۔

غرض جس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کا دماغ غور و فکر کے مراحل طے کر رہا تھا، یورپ میں فرد و ملت کی بحثیں شروع ہو گئی تھیں، اگرچہ اس مسئلہ کے متعلق اب تک مفکرین مختلف الرائے ہیں، تاہم اتنا طے ہو چکا ہے کہ فرد کو شترِ بے مہار کی طرح بالکل آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا،

لیکن جہاں فسطائیت واشتراکیت میں فرد کی آزادی کو بالکل نظر انداز کر دینے پر اصرار کیا جاتا ہے، وہاں جمہوریت میں فرد و ملت کی آزادیوں کے درمیان ایک قسم کی مفاہمت کرانے کی کوشش کیجاتی ہے لیکن بہر حال یہ تمام اصول سیاسی، معاشی اور وطنی ہیں اور دنیا میں اس وقت جو قیامت خیز ہنگامے برپا ہیں ان سب کو انہی اصول نے پیدا کیا ہے، اور اس بنا پر پیدا کیا ہے کہ ان کی بنیاد مادیت پر ہے، روحانیت پر نہیں ہے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب نے اپنے فلسفۂ بیخودی کی بنیاد روحانیت پر رکھ کر ان تمام جھگڑوں کو ختم کرنا چاہا ہے اور یہی وہ اصولی فرق ہے جو ان کے فلسفۂ فرد و ملت کو یورپ کی جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور قومی اشتراکیت جیسے فلسفوں سے بالکل علیحدہ کر دیتا ہے، اور افراد کا یہ روحانی ربط ایک ایسی ملت پیدا کر دیتا ہے جس کے حدود قوم و نسل، رنگ و نسب یا وطن و مرز بوم کی رائج الوقت اصطلاحوں سے متعین نہیں ہوتے بلکہ روحانی افکار و خیالات سے اس کی حدبندی ہوتی ہے، اس لیے اجتماعیت وانفرادیت کی جو کشمکش دولت و ذخائر دولت کے محدود ہونے کی وجہ سے یورپ میں نظر آتی ہے، وہ ان کے فلسفہ میں نابود ہے[1]، اور یہی وہ روحانی فلسفہ ہے جس کی توضیح نظریۂ ملت کے عنوان میں آگے آتی ہے۔

---

[1] ماخوذ از مضمون سید ابو سعید صاحب بزمی مندرجہ پیام حق اقبال نمبر

نظریۂ ملیّت

ڈاکٹر صاحب فرد کو قطرہ سے اور قوم کو دریا سے تشبیہ دیتے ہین، اس لیے ان کے نزدیک قوم مین دریا ہی کی طرح وسعت بھی ہونی چاہیے،

ہمچو جو سرمایہ از باران مخواہ　　　بیکران شو در جہان پایان مخواہ

اور یہ وسعت صرف اس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ قومیت کی بنیاد روحانی اصول پر قائم کی جائے، لیکن موجودہ دور مین ملک ونسب اور رنگ وروپ کے امتیازات کی بنا پر قومیت کا جو محدود نظریہ قائم کیا گیا ہے وہ وطنیت کے جغرافیانہ تحدید کے مادی تخیل سے پیدا ہوا ہے، اس لیے اس نے دنیا کے سامنے ایک مادی بت کھڑا کر دیا ہے جس کی پرستش دنیا کی تمام قومین کر رہی ہین، اور دنیا کی تمام قومون کے ساتھ مسلمان بھی اس مشرکانہ عبادت مین شریک ہین،

اس دور مین مے اور ہے جام اور ہے جم اور　　　ساقی نے بنا کی روشِ لطف وستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور　　　تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤن مین بڑا سب سے وطن ہے　　　جو پیرہن اسکا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یورپ جانے سے پہلے ڈاکٹر صاحب بھی اسی بت کے پرستارون مین تھے، لیکن یورپ مین جا کر انھون نے مختلف قومون کی باہمی رشک ورقابت کے مناظر دیکھے تو، ان کو معلوم ہوا کہ اس تنگ. محدود مادی نظریہ سے قومیت کا بحر بیکران نہین پیدا ہوتا

بلکہ اس کے بجائے بہت سی چھوٹی چھوٹی نہرین پیدا ہو جاتی ہین، اس لیے فرد و قوم کے اختلاط و امتزاج سے جو اخلاقی فوائد حاصل ہو سکتے تھے وہ حاصل نہین ہو سکتے، بلکہ اخوت، محبت اور انسانیت کا بالکل خاتمہ ہو جاتا ہے، اور قومیت کا ڈھانچا ہی ڈھانچا باقی رہ جاتا ہے جس مین روح نہین ہوتی،

از فریب عصرِ نو ہشیار باش — رہ فتد اے راہرو ہشیار باش

آن چنان قطعِ اخوت کردہ اند — بر وطن تعمیر ملت کردہ اند

تا وطن را شمعِ محفل ساختند — نوعِ انسان را قبائل ساختند

مردمی اندر جہان افسانہ شد — آدمی از آدمی بیگانہ شد

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند — آدمیت گم شد و اقوام ماند

اس لیے اگر دنیا کی قومون مین اخوت اور محبت کا جذبہ پیدا کر کے دوبارہ انسانیت کی روح کا زندہ کرنا مقصود ہے، تو مادیت کے بجائے قومیت کی بنیاد روحانیت پر رکھنی چاہیے، اور یورپ سے پلٹنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے قومیت کی بنیاد اسی روحانیت پر رکھکر قومیت کے محدود و مادی نظریہ کے بجائے ملیت کا وسیع روحانی نظریہ قائم کیا، جس کی تشریح انھون نے ایک گفتگو مین اس طرح کی ہے کہ

مین سماجی اتحاد کے لیے وطن کو ایک بنیاد سمجھتا تھا، اس لیے خاکِ وطن کا ہر ذرہ مجھے دیوتا دکھائی دیتا تھا، اُس وقت میرے خیالات مادیت کی طرف مائل تھے، سوائے وطن کے مجھے انسانون مین اتحاد کے لیے کوئی دوسرا ذریعہ دکھائی نہین دیتا تھا، اب مین انسانون کو صرف ازلی اور ابدی روحانی بنیادون پر متحد کرنا چاہتا ہون، اور جب بھی مین اسلام کا لفظ استعمال کرتا ہون تو میری مراد اس سے یہی روحانی نظام ہے، اسلام

اور مسلم میرے لیے خاص اصطلاحات ہیں جن کو میرے خیالات سمجھنے کے لیے اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔[1]

اگرچہ اس گفتگو سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ملیت کا یہ روحانی نظام مذہب اسلام اور خاص طور پر مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ ایک وسیع المشرب صوفی نے بنارس کے ایک فلسفی برہمن کو نصیحت کی ہے،

من نگویم از بتان بیزار شو	کافری شایستۂ زنار شو
اے امانتدار تہذیب کہن	پشت پا بر مسلک آبا مزن
گر ز جمعیت حیات ملت است	کفر ہم سرمایۂ جمعیت است
تو کہ ہم در کافری کامل نۂ	درخور طوف حریم دل نۂ
ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور	تو ز آذر ما ز ابراہیم دور

ایک کافر بھی روحانی بنیاد پر ملیت کا یہ روحانی نظام قائم کرسکتا ہے، لیکن اپنی مخصوص اصطلاح کے مطابق ڈاکٹر صاحب نے خاص طور پر مسلمانوں کے سامنے اس روحانی نظریہ کو پیش کیا ہے، اور اخلاقی اصول کے مطابق ان کو اس نظریہ کے قبول کرنے کی دعوت دی ہے،

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انسان کو	اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی یہ تورانی	تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا	نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

اور اس دعوت کی بنیاد پر انھوں نے مسلمانوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جنکی ذات سے مسلمانوں کا وجود وابستہ ہے، قریب تر کرنا چاہا ہے، اور بتان رنگ و خون کے توڑنے کے بعد انکو اس وسیع ملت میں داخل

[1] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۹۳۹

ہونے کی تعلیم دی ہے، جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قائم کیا تھا، اور جس کا ذکر قرآن مجید مین مدح وتحسین کے ساتھ بار بار آیا ہے،

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ
اِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ
مِنَ الْمُشْرِكِينَ (آل عمران ۱۰)

آپ کہدیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے سچ کہدیا سو
تم ملت ابراہیم کا اتباع کرو جس مین ذرا
کجی نہین اور وہ مشرک کبھی نہ تھے،

وَمَنْ اَحْسَنُ دِينًا مِمَّنْ اَسْلَمَ
وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ
مِلَّةَ اِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا (نساء-۱۸)

اور ایسے شخص سے زیادہ اچھا کس کا دین ہوگا
جو کہ اپنا رخ اللہ کی طرف جھکادے اور وہ مخلص بھی ہو
اور وہ ملت ابراہیم کا اتباع کرے جسمین کجی کا نام نہین،

قُلْ اِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي اِلَى صِرَاطٍ
مُسْتَقِيمٍ، دِينًا قِيَمًا مِلَّةَ
اِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ
مِنَ الْمُشْرِكِينَ (انعام-۲۰)

آپ کہدیجیے کہ مجھکو میرے رب نے ایک سیدھا راستہ
بتلا دیا ہے، کہ وہ ایک دین ہے مستحکم طریقہ ہے
ابراہیم کا جسمین ذرا کجی نہین. اور وہ شرک کرنے والون
مین سے نہ تھے،

اس قسم کی اور بھی بہت سی آیتین ہین، اور قرآن مجید کی ان آیتون سے ثابت ہوتا ہے کہ ملت ابراہیم کی بنیاد وطنیت کے محدود و مادی تخیل پر قائم نہ تھی بلکہ اس کا سب سے پہلا جزو توحید تھا اس لیے ملت اسلامیہ کی شیرازہ بندی جن روحانی ارکان واصول سے ہوتی ہے ان مین سب سے مقدم یہی توحید ہے،

ملت بیضا تن و جان لا الٰہ — ساز ما را پردہ گردان لا الٰہ
اسود از توحید احمر می شود — خویش فاروقؓ و ابوذرؓ می شود
ملت از یک رنگی دلہاستے — روشن از یک جلوۂ این سیناستے

ما مسلمانیم و اولادِ خلیل | از ابیکم گیر اگر خواہی دلیل
با وطن وابستہ تقدیر امم | بر نسب بنیادِ تعمیرِ امم
اصلِ ملت در وطن دیدن کہ چہ | باد و آب و گل پرستیدن کہ چہ
بر نسب نازان شدن نادانی است | حکمِ او اندر تن و تن فانی است
ملتِ ما را اساسِ دیگر است | این اساس اندر دلِ ما مضمر است
حاضریم و دل بغائب بستہ ایم | پس ز بند این و آن وارستہ ایم
رشتہ این قوم مثلِ انجم است | چون نگہ ہم از نگاہِ ما گم است
تیر خوش پیکان یک کیشیم ما | یک نما یک بین یک اندیشیم ما

توحید کے بعد اس ملت کا دوسرا روحانی عنصر نبوت اور رسالت ہے، کیونکہ اس ملت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیدا کیا تھا،

تارکِ آفل براہیمِ خلیل | انبیاء را نقشِ پائے او دلیل
آن خدائے لم یزل را آیتے | داشت در دل آرزوئے ملتے
بہر ما ویرانہ آباد کرد | طاقِ ایمان را خانہ بنیاد کرد

اور وہ ایک پیغمبر تھے اس لیے وہ رسالت سے عالم وجود میں آئی اور رسالت ہی کی آغوش میں نشو و نما پائی،

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید | از رسالت در تنِ ما جاں دمید
از رسالت در جہاں تکوینِ ما | از رسالت دینِ ما آئینِ ما
ما ز حکمِ نسبتِ او ملتیم | اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد اس ملت میں وسعت پیدا ہوئی تو وہ صحرائے

عرب میں پھیل کر مختلف شعوب و قبائل میں تقسیم ہو گئی اور اس تقسیم نے اس میں نسبی فخر و غرور اور تفوق امتیاز کے وہی جذبات پیدا کر دیے جو موجودہ قوموں میں پیدا ہو گئے ہیں، اس لیے صحرائے عرب میں اور بہت سے بتوں کے ساتھ قومیت کا وہ مادی بت بھی کھڑا ہو گیا جس کی پرستش آج دنیا کی تمام قومیں کر رہی ہیں، اس لیے اس ملت کی تجدید و اصلاح کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے جنھوں نے پہلے توحید و رسالت کے ذریعہ سے اہل عرب میں وحدت ملیہ کا روحانی رشتہ قائم کیا، اور توحید و رسالت کے بعد سب کے آخر میں قومیت کے اس مادی بت کو توڑا اور حجۃ الوداع میں یہ اعلان کیا،

عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے،

خداوند تعالیٰ نے تمھارے جاہلیت کے غرور، اور باپ دادا کے اوپر فخر کرنے کے طریقہ کو مٹا دیا، اب صرف دو قسم کے آدمی ہیں، مومن پرہیزگار اور بدبخت بدکار، تم لوگ آدم کے بچے ہو، اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے، لوگ ایسے لوگوں پر فخر کرنا چھوڑ دیں جو جہنم کا کوئلہ ہیں یا خدا کے نزدیک اس گبریلے سے بھی زیادہ ذلیل ہیں جو اپنے منہ سے نجاست کو گھسیٹتا چلتا ہے۔

اور اس نسبی تفوق و امتیاز کے مٹ جانے کے بعد محدود قومیت نے ملت کی وسیع شکل اختیار کر لی جس کے روحانی اجزا یہ قرار پائے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ	تم سب میں بڑا شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو
(حجرات ۲)	
ان کل مسلم اخو المسلم وان	ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے

المسلمین اخوۃ — اور مسلمان مسلمان باہم بھائی ہیں،

ارقاءکم ارقاءکم اطعموھم — تمہارے غلام تمہارے غلام ہیں جو خود کھاؤ وہی

مما تاکلون واکسوھم مما تلبسون — انکو کھلاؤ جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ"

اس لیے اس ملت کا ابتدائی اور انتہائی سلسلہ دو پیغمبروں کی ذات سے ملا ہوا ہے،

مرسلان و انبیا آبائے او — اکرم او نزد حق اتقائے او

کل مومن اخوۃ اندر دلش — حریت سرمایۂ آب و گلش

ناشکیب امتیازات آمدہ — در نہاد او مساوات آمدہ

اور رسالت ہی کے ذریعہ سے اس میں اتحاد پیدا ہوا ہے،

از رسالت ہم نوا گشتیم ما — ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما

اس لیے توحید کے بعد رسالت ہی کے عقیدہ سے اس کی وحدتِ ملی کو قائم رکھا جا سکتا ہے"

ان دونوں روحانی اجزا یعنی توحید و رسالت کی بنا پر ملتِ اسلامیہ کسی خاص ملک، کسی خاص مقام اور کسی خاص خطہ تک محدود نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کلمہ پر اس کی بنیاد رکھکر ایک "ملت گیتی نورد" پیدا کر دی ہے،

حکمتش یک ملتِ گیتی نورد — بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد

جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ

جوہر ما با مقامے بستہ نیست — بادۂ تندش بجامے بستہ نیست

ہندی و چینی سفال جام ماست — رومی و شامی گل اندام ماست

قلب ما از ہند و روم و شام نیست — مرز و بوم او بجز اسلام نیست

اس لیے اس ملت کو ملک و وطن کی قید سے آزاد ہو کر گیتی نورد ہی رہنا چاہیے،

ہر کہ آزاد رفتن آبرو ست | عرصۂ آفاق زیر پاے اوست
صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو | یعنی از قید مقام آزاد شو
ہر کہ از قید جہات آزاد شد | چون فلک در شش جہت آباد شد

اسی گیتی نوردی کا دوسرا نام آفاقیت ہے، جس کی نسبت ڈاکٹر صاحب نہایت فخر کے ساتھ فرماتے ہین،

سما سکا نہ دو عالم مین مرد آفاقی

لیکن بڑی مشکل یہ آپڑتی ہے کہ آفاقیت کے اس نظریہ کے باوجود وہ اس ملت کی وحدت کے قائم رکھنے کے لیے ایک مرکز کی وابستگی ضروری سمجھتے ہین، جسکا نام خانہ کعبہ یا بیت الحرام ہے.

قوم را ربط و نظام از مرکزے | روزگارش را دوام از مرکزے
راز دار و راز ما بیت الحرام | سوز ما ہم ساز ما بیت الحرام
تو ز پیوند حریمے زندۂ | تا طواف او کنی پاینده

اور یہ محدود مرکزی وابستگی آفاقیت کے پانون مین ایک بیڑی ڈال دیتی ہے جس سے اس مین گیتی نوردی کی صلاحیت باقی نہین رہتی، یہی مشکل ہے جس کو اعتراض کی شکل مین اس طرح پیش کیا گیا ہے، کہ "اقبال کا وہ میلان جو حجازیت کے نام سے مشہور ہے ان کی اسی ماضی پرستی اور رجعت پسندی کا نتیجہ ہے، اس بات پر جس قدر حیرت کی جائے کم ہے، کہ جس شخص کی یہ تخئیل رہی ہو

نہ چینی و عربی وہ نہ رومی و شامی | سما سکا نہ دو عالم مین مرد آفاقی
جو کرے گا امتیاز رنگ و خون مٹ جائیگا | ترک خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر

وہ پھر اس بات پر کیسے ناز کر سکتا ہے،

نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری[1]

کیونکہ ایک خاص مرکز یا ایک خاص خطہ کی وابستگی سے آفاقیت ایک خاص ملک اور ایک خاص مقام مین محدود ہو کر وطنیت کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور رنگ وخون کا وہی نسلی امتیاز پیدا ہو جاتا ہے جس کے ڈاکٹر صاحب سخت مخالف ہین، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وطنی تحدید اور مرکزی وابستگی دو مختلف چیزین ہین، جہان تک وطنی تحدید کا تعلق ہے ڈاکٹر صاحب مصر وشام وغیرہ کی طرح اس ملت گیتی نورد کو حجاز سے بھی الگ رکھنا چاہتے ہین،

تو ابھی رہگذر مین ہے قید مقام سے گذر　　مصر وحجاز سے گذر، پارس وشام سے گذر

اور رنگ وخون کے نسلی امتیاز کے ذریعہ سے حجاز کے ساتھ کوئی تعلق پیدا کرنا نہین چاہتے، بلکہ نہایت واضح الفاظ مین اس تعلق کا انکار کرتے ہین،

تو اے کودک منش خود را ادب کن　　مسلمان زادہٴ ترک نسب کن

برنگ احمر وخون ورگ وپوست　　عرب نازد اگر ترک عرب کن

لیکن اسی کے ساتھ وہ اس ملت گیتی نورد کی آفاقیت کو ایک مرکز کے ساتھ وابستہ کرکے اور بھی زیادہ مضبوط، مستحکم اور طاقتور بنانا چاہتے ہین، کیونکہ مختلف ملکون مین پھیل کر اس کی جو آفاقی شان نمایان ہوتی تھی اس مین ایک قسم کی پراگندگی اور بے ربطی پائی جاتی تھی، لیکن جب سمٹ کر وہ ایک مرکز کے ساتھ وابستہ ہوجاتی ہے تو یہ پراگندگی اور بے ربطی دور ہو جاتی ہے، اور آفاقیت کے جو مناظر مختلف ملکون مین دیکھے جا سکتے تھے وہ ایک ہی مرقع مین نظر آنے لگتے ہین، لیکن یہ محدود مرکز اس کا وطن نہین ہوتا، بلکہ اس کی نمایش گاہ ہوتا ہے، جہان وطنیت اور قومیت کے تمام رشتے منقطع ہو جاتے ہین، اور اس ملت کے جو اجزا ایران، عرب، روم وشام، ہندوستان وخراسان غرض دنیا کے مختلف حصون مین بکھرے ہوئے تھے ایک لڑی مین پرو دیے جاتے ہین، اس بنا پر اگر قومیت

[1] اقبال اور مجنون گورکھپوری ص ۹۰

کی بنیاد جمعیت پر قائم ہے، تو بیت الحرام سراپا جمعیت ہے،

در جہان جانِ امم جمعیت است   در نگر سیر حرم جمعیت است

اس نظریۂ آفاقیت پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "اگر ڈاکٹر صاحب کے کلام کا مطالعہ کیا جائے اور ان کے کلام سے جو اثرات مترتب ہوتے ہین ان کا تجزیہ کیا جائے تو ہم کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے دل مین ہماری دنیائے آب وگل کے لیے نہ کوئی محبت تھی اور نہ کوئی جذبۂ احترام، یہ سچ ہے کہ تمام بنی نوعِ انسان کو ایک نظام اخوت کے ماتحت لے آنا اور ساری دنیا کو ایک اجتماعی ہیئت کا پابند بنانا انسان کا بہترین کارنامہ ہوگا، لیکن اس کے یہ معنی نہ ہونا چاہیے کہ جس مٹی سے ہمارا خمیر ہوا ہو اس کے لیے ہمارے دل مین کوئی انس یا درد باقی نہ رہے، اور اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ ڈاکٹر صاحب کا کلام اس درد اور انس سے خالی ہے[۱]"، لیکن ڈاکٹر صاحب کے نزدیک وطن کے دو معنی ہین،

گفتار سیاست مین وطن اور ہی کچھ ہے   ارشادِ نبوت مین وطن اور ہی کچھ ہے

اور جہان تک ارشادِ نبوت کا تعلق ہے ڈاکٹر صاحب کا دل بھی اس فطری جذبہ سے خالی نہ تھا، اور جس مٹی سے ان کا خمیر تیار ہوا تھا نظریۂ آفاقیت کے قائم کرنے کے بعد بھی اس کا انس اور اس کا درد ان کے دل مین باقی رہا، چنانچہ ضرب کلیم مین انھون نے "شعاعِ امید" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس مین صاف طور پر اس محبت کی جھلک نظر آتی ہے،

اک شوخ کرن شوخ مثالِ نگہِ حور   آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب

بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو   جبتک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہانتاب

چھوڑون گی نہ مین ہند کی تاریک فضا کو   جبتک نہ اٹھین خواب سے مردانِ گران خواب

[۱] اقبال از مجنون گورکھپوری ص ۵۲

خاور کی امیدون کا یہی خاک ہے مرکز　　اقبال کے اشکون سے یہی خاک ہے سیراب

چشم مہ و پروین ہے اسی خاک سے روشن　　یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُر ناب

اس خاک سے اٹھے ہین وہ غواص معانی　　جن کے لیے ہر بحر پر آشوب ہے پایاب

لیکن یہ محبت جب سیاسی شکل اختیار کر لیتی ہے تو ہر قسم کے رشک و رقابت اور شر و فساد کا منبع بن جاتی ہے،

اقوام جہان مین ہے رقابت تو اسی سے　　تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے　　کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اور وطنیت کی محدود و مادی دیوار حائل ہو کر نوع انسانی کو مختلف قومون مین تقسیم کر دیتی ہے،

اقوام مین مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے　　قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اور اسی شر و فساد اور تقسیم و تجزی سے بچنے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے آفاقیت کا وسیع نظریہ قائم کیا ہے جو ان مادی دیوارون کو منہدم کر کے ایک روحانی رشتہ سے قومون کی شیرازہ بندی کرتا ہے جس سے قومیت کے محدود دائرے مین وسعت پیدا ہو جاتی ہے، اور اب یہ یوسف جس کا دامن محدود وطنیت کے گرد و غبار سے پاک ہوتا ہے، ہر بازار مین مل سکتا ہے۔

پاک ہے گرد وطن سے سر دامان تیرا　　تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعان تیرا

لیکن اب یہ تیسری مشکل پیش آجاتی ہے کہ اس وسیع نظریہ کے مطابق اگرچہ ڈاکٹر صاحب قومیت اور وطنیت کے تنگ دائرے سے نکل جاتے ہین، لیکن اسی کے ساتھ "وہ مذہب و ملت کے تنگ دائرے مین پھنس جاتے ہین اور یہ محسوس نہین کرتے یا محسوس کرتے ہین تو تجاہل برت جاتے ہین کہ آفاقیت مین اگر ملکی اور نسلی امتیازات کی گنجایش نہین ہے تو اسلام اور غیر اسلام کے فرق اور مسلم اور غیر مسلم کی شناخت کی بھی اس مین کہین کھپت نہین ہے"[1]، حالانکہ ڈاکٹر صاحب

[1] اقبال از مجنون گورکھپوری ص ۵۳، ۵۴

کے کلام میں یہ فرق ہر جگہ نہایت نمایاں طور پر نظر آتا ہے، اس لیے آفاقیت کی بنیاد مذہب و ملت کے بجائے انسانیت پر رکھنی چاہیے تاکہ مسلم و غیر مسلم کا یہ فرق باقی نہ رہے، اور ایک متحدہ انسانی برادری پیدا ہو جائے، لیکن درحقیقت یہ غیر محدود آفاقیت جس کو قدیم زمانہ میں ملحد صوفیوں نے وحدت الوجود کے ذریعہ سے قائم کر کے کفر و اسلام کے فرق کو مٹانا چاہا تھا کہ

از یک چراغ کعبہ و بتخانہ روشن است

ملحدانہ ہے، اور ڈاکٹر صاحب بھی جب تک اس قسم کے خیالات نہ رکھتے تھے اسی قسم کا قومی اتحاد پیدا کرنا چاہتے تھے،

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشیٔ ازل ہو

اور اب اسی قسم کا غیر محدود ملحدانہ اتحاد انسانیت کے وسیع تخیل کی بنیاد پر پیدا کیا جا رہا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں جب کبھی اتحاد پیدا ہوا ہے تو اس کو انسانیت نے نہیں بلکہ مذہب و ملت ہی نے پیدا کیا ہے، نہایت قدیم زمانہ میں جبکہ

کان الناس امۃ واحدۃ (بقرہ، ۲۶) سب آدمی ایک ہی طریق کے تھے،

تو یہ متحدہ طریقہ مفسرین کے مختلف اقوال کے مطابق خواہ اسلام کا طریقہ ہو، خواہ کفر کا طریقہ ہو، خواہ عقلی شریعت کا طریقہ ہو، لیکن بہر حال وہ مذہب و ملت ہی کا متحدہ طریقہ تھا، اس کے بعد جب اس متحدہ انسانی برادری میں اختلافات پیدا ہوئے تو مذہب و ملت ہی نے ان اختلافات کا فیصلہ کیا،

فبعث اللہ النبیین مبشرین و منذرین وانزل معھم الکتٰب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ (بقرہ - ۲۶)

پھر اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا جو کہ خوشی کے وعدے سناتے تھے اور ڈراتے تھے اور ان کے ساتھ آسمانی کتابیں بھی ٹھیک طور پر نازل فرمائیں، اس غرض سے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں میں ان کے

اور ڈاکٹر صاحب بھی اسی مذہبی و ملی اتحاد کی بنا پر ان اختلافات کو دور کرنا چاہتے ہین، جن کو قومیت کے محدود نظریہ نے پیدا کر دیا ہے، اس لیے وہ تمام ملتون کو مٹا کر ایک عالمگیر ملت پیدا نہین کرنا چاہتے، بلکہ مختلف قومیتون کو مٹا کر ملیت کا ایک ایسا روحانی نظریہ قائم کرتے ہین، جو کافر کو آذر کے ساتھ اور مسلمان کو ابراہیم کے ساتھ قریب تر کر دیتا ہے، اس لیے ملیتین تو باقی رہ جاتی ہین، لیکن وطنیت کے محدود قومی نظریہ نے ان ملتون کو مختلف قومون مین تقسیم کر کے جو اختلافات پیدا کر دیے ہین وہ دور ہو جاتے ہین اور ملکی اور نسلی رشک و رقابت کا خاتمہ ہو جاتا ہے مثلاً اگر یورپین قومون مین صرف عیسائیت ذریعۂ اتحاد ہوتی تو آج ان مین وہ لڑائیان نہ ہوتیں جو ملکی اور نسلی امتیازات کی بنا پر ہوئین، اگر چین و جاپان مین صرف بودھ مذہب کا رشتۂ اتحاد قائم ہوتا تو جاپان چین پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کرتا، بہر حال مذہب و ملت کے روحانی اتحاد سے جو قوم پیدا ہوتی ہے وہ لازوال ہوتی ہے، اور وہ جس طرح کسی محدود وطن، کسی محدود ملک اور کسی محدود مقام کی پابند نہین ہوتی اسی طرح اس کا زمانہ بھی غیر محدود ہوتا ہے، اور وہ ہمیشہ باقی رہتی ہے، مسلمانون کی قوم اسی قسم کی قوم ہے، اس لیے وہ ہمیشہ قائم رہے گی اور اس کے افراد کے فنا ہونے کا اس پر کوئی اثر نہ پڑے گا کیونکہ دونون کی موت و حیات کے اصول باہم مختلف ہین، افراد کو مادیت نے اور اس قوم کو روحانیت نے پیدا کیا ہے،

ہمچنان از فردہاے بے سپر ہست تقویم امم پایندہ تر

در سفر یار است و صحبت قائم است فرد و گیر است و ملت قائم است

ذاتِ او دیگر صفاتش دیگر است سنتِ مرگ و حیاتش دیگر است

فرد برخیزد ز مشتِ گلے قوم زاید از دلِ صاحبدلے

اور مادہ کے فنا ہونے سے روح فنا نہین ہوتی اس کے ساتھ اس کی زندگی ایک روحانی

کتاب کے ساتھ بھی وابستہ ہے،

گر تو میخواہی مسلمان زیستن　　نیست ممکن جز بقرآن زیستن

جس کی حفاظت کا خداوند تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے، اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ

اس لیے اگر اس کے محفوظ رکھنے والے فنا ہو جائیں تو وہ کیونکر محفوظ رہے گی،

از اجل این قوم بے پرواستے　　استوار از نحن نزلنا استے

ذکر قائم از قیامِ ذاکر است　　از دوامِ او دوامِ ذاکر است

تا کہ توحید خدا را حجتم　　حافظِ رمزِ کتاب و حکمتم

اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ جو تومیں ملکی اور نسبی امتیازات کی بنا پر پیدا ہوئیں وہ فنا ہو گئیں،

رومیان را گرم بازاری نماند　　آن جہانگیری جہانداری نماند

شیشۂ ساسانیان در خون نشست　　رونقِ خمخانۂ یونان شکست

اگرچہ ملت اسلامیہ پر بھی اس قسم کی تباہیاں آئیں اور ساتویں صدی میں فتنۂ تاتار نے اُسکو اور قوموں کی طرح اس کو بھی فنا کرنا چاہا،

آسمان با ما سر پیکار داشت　　در بغل یک فتنۂ تاتار داشت

بند ہا از پا کشود آن فتنہ را　　بر سرِ ما آزمود آن فتنہ را

سطوتِ مسلم بخاک و خون تپید　　دید بغداد آنچہ روما ہم ندید

لیکن باایں ہمہ چونکہ اس کی بنیاد روحانیت پر قائم تھی اس لیے وہ اپنے مورث اول حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح اس آگ سے بالکل محفوظ نکل آئی،

تو مگر از چرخ کج رفتار پرس　　زان نوائین کہن پندار پرس

آتشِ تاتاریان گلزار کیست؟　　شعلہ ہائے او گلِ دستار کیست؟

زانکہ مارا فطرت ابراہیمی است | ہم بہ مولیٰ نسبت ابراہیمی است
از تہِ آتش بر اندازیم گل | نارِ ہر نمرود را سازیم گل
شعلہ ہاے انقلابِ روزگار | چون بباغِ ما رسد گردد بہار

اور اب تک محفوظ ہے،

در جہان بانگِ اذان بود ست و ہست | ملتِ اسلامیان بود است و ہست

لیکن ملیت کا یہ روحانی نظریہ اس روحانی قوم کو عالمِ مادی سے بالکل بیگانہ نہین کر دیتا، بلکہ وہ کائنات کے ذرہ ذرہ سے نہایت وسیع پیمانے پر ربط و تعلق پیدا کر سکتی ہے، صوفیون نے اس کو کائنات سے اس بنا پر بالکل بے تعلق رکھنا چاہا تھا کہ روحانیات کے مقابل مین مادیت کا درجہ بالکل ہیچ ہے،

اے کہ از تاثیرِ افیون خفتۂ | عالمِ اسباب را دون گفتۂ

اور نفیِ خودی اور نفیِ کائنات کا یہی روحانی فلسفہ تھا جس نے اس کے دستِ عمل کو بالکل شل کر دیا تھا، لیکن ڈاکٹر صاحب کے نزدیک وہ درحقیقت اسقدر بے رتبہ چیز نہین ہے،

خیز و واکن دیدۂ مخمور را | دون مخوان این عالمِ مجبور را

یہ صوفیون کی غفلت کا نتیجہ ہے کہ کائنات ان کو خواب و خیال معلوم ہوتی ہے، ورنہ اگر وہ آنکھین کھول کر دیکھتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ یہ خواب بیداری مین بھی دیکھا جا سکتا ہے،

تو چشم بستی و گفتی کہ این جہان خواب است | کشاے چشم کہ این خواب خوابِ بیداری است

مجنون گورکھپوری لکھتے ہین کہ اقبال کے دل مین ہماری دنیاے آب و گل کے لیے نہ کوئی محبت تھی اور نہ جذبۂ احترام، ان کو ہمارے کرۂ ارضی سے زیادہ خورشید و ماہ و انجم و کہکشان کی دنیا سے محبت معلوم ہوتی ہے، اور وہ اپنے خیال مین ستارون سے آگے کی آبادیون مین کھوئے

رہتے ہین[1] لیکن واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اس روحانی کتاب کے بعد جس کا نام قرآن ہے انسان صحیفۂ کائنات ہی کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کر کے نائب جہان بن سکتا ہے،

کوہ و صحرا دشت و دریا بحر و بر ۔۔۔ تختۂ تعلیم ارباب نظر

تا ز تسخیر قوائے این نظام ۔۔۔ ذو فنونیہائے تو گردد تمام

نائب حق در جہان آدم شود ۔۔۔ بر عناصر حکم او محکم شود

البتہ وہ کائنات کو اس قدر قابل احترام بھی نہین سمجھتے کہ اس کو گذشتہ قومون کی طرح اپنا خدا بنا لیا جائے بلکہ ایک مسلمان کے نزدیک اس کی حیثیت محض لونڈی غلام کی ہے۔

ثابت و سیارۂ گردون وطن ۔۔۔ آن خداوندان اقوام کہن

این ہمہ اے خواجہ آغوش تواند ۔۔۔ پیش خیز و حلقہ در گوش تواند

اور اسی حیثیت سے اس کو اپنا فرمانبردار (خدمتگار، لونڈی) بنانا اور اس کو قابو مین رکھنا اس کا فرض ہے، کیونکہ کائنات مین ایسی روشن، ایسی بلند اور ایسی عظیم الشان ہستیان موجود ہین کہ اگر انسان انکو اپنے قابو مین نہ لائے گا تو وہ خود انسان کو اپنا فرمانبردار بنا لین گی،

گیر او را تا نہ او گیرد ترا ۔۔۔ ہمچو مے اندر سبو گیرد ترا

گذشتہ قومون نے آفتاب و ماہتاب کو اسی بنا پر اپنا خدا بنا لیا تھا، کہ انکو اپنے تسلط و اقتدار سے باہر سمجھتی تھین لیکن ڈاکٹر صاحب ان کو ایک مسلمان کے اقتدار سے باہر نہین سمجھتے بلکہ جس طرح ایک شکاری اپنے شکار کی تلاش مین جنگل کے گوشے گوشے کو چھان ڈالتا ہے، اسی طرح ڈاکٹر صاحب بھی اپنے شکار کی تلاش مین کائنات کے ذرے ذرے کو ٹٹولتے ہین اور اس تلاش مین ستارون کی آگے کی دنیا سے بھی نکل جاتے ہین،

---

[1] اقبال از مجنون گورکھپوری ص ۵۲، ۵۳

صد جہان در یک فضا پوشیدہ اند   مہرہا در ذرہا پوشیدہ اند

آنکہ بر اشیا کمند انداختست   مرکبے از برق و حرارت ساختست

بہرحال ڈاکٹر صاحب کے نزدیک

ماسوا از بہر تسخیر است و بس   سینۂ او عرضۂ تیر است و بس

اس لیے وہ تسخیر کائنات کو ملی زندگی کی توسیع کا ذریعہ قرار دیتے ہیں، اور ایک مسلمان کو اس جنگ کے لیے آمادہ کرتے ہیں،

چون نہال از خاکِ این گلزار خیز   دل بغائب بند و با حاضر ستیز

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد   عالمے از ذرۂ تعمیر کرد

خویش را بر پشت باد اسوار کن   یعنی این جماز را مہار کن

دست رنگین کن ز خون کوہسار   جوے آبِ گوہر از دریا بر آر

حدت از خورشید عالمتاب گیر   برق طاق افروز از سیلاب گیر

جستجو را محکم از تدبیر کن   انفس و آفاق را تسخیر کن

لیکن انفس و آفاق کی تسخیر کے لیے صرف علم ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے عملی طاقت کی بھی ضرورت ہے، اور یہ عملی طاقت صرف آئین الٰہی یعنی اتباعِ شریعت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے،

فرد را شرع است مرقات یقین   پختہ تر از وے مقاماتِ یقین

ملت از آئینِ حق گیرد نظام   از نظامِ محکمے خیزد دوام

قدرت اندر علم او پیدا استے   ہم عصا و ہم ید بیضا استے

اے کہ باشی حکمتِ دین را امین   با تو گویم نکتۂ شرعِ مبین

چون کسے گردد مزاحم بے سبب | با مسلمان ورا داے مستحب
مستحب را فرض گردانیده اند | زندگی را این قدرت دیده اند
سرّ این فرمانِ حق دانی کہ چیست | زیستن اندر خطرہا زندگیست
شرع میخواہد کہ چون آئی بجنگ | شعلہ گردی واشگافی کام سنگ
آزماید قوتِ بازوے تو | مے نہد الوند پیش روے تو
باز گوید سرمہ ساز الوند را | از تف خنجر گداز الوند را
نیست بیش ناتوانے لاغرے | در خور سرپنجۂ شیر نرے
باز چون با صعوہ خوگر میشود | از شکار خود زبون تر میشود
شارعِ آئین شناسِ خوب و زشت | بہر تو این نسخۂ قدرت نوشت
از عمل آہن عصب مے سازدت | جاے خوبے در جہان اندازدت
خستہ باشی استوارت می کند | پختہ مثل کوہسارت می کند
ہست دینِ مصطفٰی دین حیات | شرعِ او تفسیر آئینِ حیات

قرنِ اول کے مسلمانون نے اسی آئین حیات کی پابندی سے انفس و آفاق کو مسخر کیا تھا، لیکن عجمی صوفیون نے اس آئین حیات کو چھوڑ دیا، کوہ دریا، اور بحر و بر کی وسیع فضا سے نکل کر گوشہ گیری اختیار کر لی، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ وسیع فضائین ان کے ہاتھ سے نکل گئین اور اب اس مین صرف ایک کشکول گدائی باقی رہ گیا،

تا شعار مصطفٰی از دست رفت | قوم را رمز بقا از دست رفت
آن نہال سربلند و استوار | سیرتِ صحرائی اشتر سوار
پاے تا در وادیِ بطحا گرفت | تربیت از عادتِ صحرا گرفت

آن چنان کاہید از بادِ عجم — ہمچو نے گردید از بادِ عجم

آنکہ کُشتے شیر را چون گوسفند — گشت از پامالِ مورے دردمند

آنکہ از تکبیر او سنگ آب گشت — از صفیرِ بلبلے بیتاب گشت

آنکہ عزمش کوہ را کاہے شمرد — با توکل دست و پائے خود سپرد

آنکہ ضربش گردنِ اعدا شکست — قلبِ خویش از ضربہائے سینہ خست

آنکہ گامش نقشِ صد ہنگامہ بست — پائے اندر گوشۂ عزلت شکست

آنکہ فرمانش جہان را ناگزیر — بر درش اسکندر و دارا فقیر

کوششِ او با قناعت ساز کرد — تا بہ کشکولِ گدائی ناز کرد

اب اگر ملت اسلامیہ کو اپنے اندر قوت و توانائی اور اپنی سیرت مین پختگی پیدا کرنا مقصود ہے تو پھر اس کو صحراے عرب کی طرف رخ کرنا چاہیے،

قلب را زین حرفِ حق گردان قوی — با عرب در ساز تا مسلم شوی

لیکن اہل عرب کے ساتھ ملت اسلامیہ کی یہ وابستگی وطنی، نسبی، اور ملکی نہین، بلکہ محض اخلاقی ہوگی، اور یہی وہ حجازی لے ہے جو ڈاکٹر صاحب کے ہندی نغمون مین سنائی دیتی ہے،

لیکن موجودہ زمانہ مین ملت اسلامیہ ان بلند پایہ روحانی، اخلاقی اور آفاقی اصول پر قائم نہین ہے، اس لیے ڈاکٹر صاحب اس ملت کی تجدید کرنا چاہتے ہین،

مسلمان فاقہ مست و ژندہ پوش است — ز کارش جبرئیل اندر خروش است

بیا نقشِ دگر ملت بریزیم — کہ این ملت جہان را بار دوش است

اور ایسی ملت پیدا کرنا چاہتے ہین جس کے اوصاف ان کے نزدیک یہ ہین،

دگر ملت کہ کارے پیش گیرد — دگر ملت کہ نوش از نیش گیرد

نگردد با یکے عالم رضا مند دو عالم را بدوش خویش گیرد

پر او در وسعت گردون یگانہ نگاہ او بہ شاخ آشیانہ

مہ و انجم گرفتار کمندش بدست او ست تقدیر زمانہ

بباغان عندلیبے خوش صفیرے براغان جرہ بازے زود گیرے

امیرے او بسلطانی فقیرے فقیر او بدرویشی امیرے

اور یہ اوصاف اس مین قدرتی طور پر خودی کا احساس پیدا کر دیتے ہین۔

بہ آن ملت انا الحق سازگار است کہ از خونش نم ہر شاخسار است

نہان اندر جلال او جمالے کہ او را نہ سپہر آئینہ دار است

وجودش شعلہ از سوز درون است چو خس او را جہان چند و چون است

کند شرح انا الحق ہمت او پے ہر کن کہ میگوید یکون است

خنک آن ملتے بر خود رسیدہ ز درد جستجو نا آرمیدہ

درخشد او درین نیلگون چرخ چو تیغے از میان بیرون کشیدہ

لیکن قومی خودی کا یہ احساس صرف ملی تاریخ کے پیش نظر رکھنے سے پیدا ہو سکتا ہے، اور روایات ملیہ ہی کے از بر رکھنے سے اس احساس کی تکمیل ہو سکتی ہے، بالخصوص موجودہ زمانہ مین مسلمانون کے لیے اس کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے، کیونکہ دنیا کی اور قومون کی گذشتہ تاریخ نہایت تاریک اور ان کا موجودہ دور نہایت روشن ہے، اس لیے اگر وہ اپنی گذشتہ تاریخ کو بھلا دین تو یہ ان کے لیے چندان مضر نہین لیکن مسلمانون کی حالت ان سے بالکل مختلف ہے، ان کا ماضی نہایت روشن اور ان کا حال نہایت تاریک ہے، اس لیے ان مین قومی خودی کا احساس پیدا کرنے کے لیے ان کی گذشتہ تاریخ کا اعادہ اور اسکا حفظ و تکرار نہایت ضروری ہے،

قوم روشن از سواد سرگذشت — خودشناس آمد ز یاد سرگذشت

سرگذشتِ او گر از یادش رود — باز اندر نیستی گم می شود

نسخهٔ بود ترا اے ہوشمند — ربط ایام آمده شیرازه بند

ربط ایام است ما را پیرہن — سوزنش حفظِ روایاتِ کہن

چیست تاریخ؟ اے ز خود بیگانهٔ — داستانے قصهٔ افسانهٔ

این ترا از خویشتن آگہ کند — آشنائے کار و مرد رہ کند

ضبط کن تاریخ را پاینده شو — از نفسہائے رمیده زنده شو

دوش را پیوند با امروز کن — زندگی را مرغ دست آموز کن

سر زند از ماضیٔ تو حالِ تو — خیزد از حال تو استقبالِ تو

مشکن ار خواہی حیات لازوال — رشتهٔ ماضی ز استقبال و حال

موج ادراک تسلسل زندگی است — میکشان را شورِ قلقل زندگی است

کیونکہ اگر وہ اپنی تاریخ کو بھلا دیگی تو لازمی طور پر دوسری قوموں کے تہذیب و تمدن کے اصول اختیار کرکے خود اپنی ملی وجود کو فنا کردیگی اور ملت اسلامیہ اسی بنا پر یورپین تہذیب و تمدن کی جگمگاہٹ کو دیکھکر اپنی ملی حیثیت کو فنا کر رہی ہے،

ملت نوزادہ مثلِ طفلک است — طفلکے کو در کنارِ مادر است

طفلکے از خویشتن نا آگہے — گوہر آلودهٔ خاکِ رہے

بستہ با امروز او فرداش نیست — حلقہ ہائے روز و شب در پاش نیست

چشم ہستی را مثال مردم است — غیر را بیننده و از خود گم است

اور ڈاکٹر صاحب اس "از خود گم قوم" کے سامنے اس کی گذشتہ تاریخ کو رکھکر دوبارہ اس کو زندہ کرنا چاہتے ہیں،

تعلیم

ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعری کے پہلے اور دوسرے دور مین تعلیم پر کچھ نہین لکھا، اس موضوع پر انھون نے سب سے پہلے اپنی شاعری کے تیسرے دور مین اپنے خیالات ظاہر کیے، چنانچہ بانگ درا کے دور سوم کی نظمون مین دو ایک نظمین تعلیم پر بھی ملتی ہین، اور ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ

(۱) ڈاکٹر صاحب جدید تعلیم کو مذہب سے بیگانہ رکھنا گوارا نہین کر سکتے، اس لیے موجودہ تعلیم سے جو الحاد پھیل رہا ہے اس سے سخت بیزاری ظاہر کرتے ہین،

خوش تو ہین ہم بھی جوانون کی ترقی سے مگر
لبِ خندان سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

گھر مین پرویز کے شیرین تو ہوئی جلوہ نما
لیکے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

تعلیم پیر فلسفۂ مغربی ہے یہ
نادان ہین جنکو ہستیٔ غائب کی ہے تلاش

محسوس پر بنا ہے علومِ جدید کی
اس دور مین ہے شیشۂ عقائد کا پاش پاش

مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام
ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش

کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور
مجھ پر کیا یہ مرشد کامل نے راز فاش

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدۂ بے جنون مباش

لیکن الحاد سے یہ بیزاری محض ملایانہ دینداری کا نتیجہ نہین ہے بلکہ اس کے تحت مین چند فلسفیانہ اور تاریخی حقائق بھی پوشیدہ ہین، زندگی محض علم کا نام نہین ہے، بلکہ اسکے لیے عمل بھی ایک ضروری

چیز ہے، اور انسان مین عمل کا جوش اور اس کا ولولہ صرف مذہب سے پیدا ہو سکتا ہے، ممکن ہے کہ وہ کچھ لوگون کے نزدیک ایک جنونِ خام ہو، لیکن عملی زندگی مین اس جنونِ خام کے بغیر کام نہین چل سکتا، اس لیے

ہر چند عقل کل شدہ بے جنون مباش

اس کے علاوہ تعلیم ایک اجتماعی چیز ہے، اس کا مقصد انتشار پیدا کرنا نہین ہے، بلکہ اتحاد واتفاق پیدا کرنا ہے، لیکن چونکہ ملت اسلامیہ کی بنیاد دینی اور روحانی اصول پر قائم ہے، اس لیے جب تک اس کی تعلیم مین دینی اور روحانی عناصر شامل نہ ہون اس کا اجتماعی وجود قائم نہین رہ سکتا،

مذہب سے ہم آہنگیٔ افراد ہے باقی　　　دین زخمہ ہے جمعیتِ ملت ہی اگر ساز

بانگ درا کے بعد ڈاکٹر صاحب نے بال جبرئیل کے جستہ جستہ اشعار مین تعلیم کے موجودہ طریقون پر جو نکتہ چینی کی ہے اس مین پہلا رونا تو اسی الحاد اور بیدینی کا ہے، جس کی تعلیم ان مدرسون مین دیجاتی ہے،

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا　　　کہان سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

لیکن اسی کے ساتھ اور بھی چند نئی باتون کی طرف اشارے کیے ہین،

(۲) ایک تو یہ کہ اس تعلیم سے جو نئی نسل پیدا ہو رہی ہے اس مین صرف یہی نقص نہین ہے کہ وہ ملت اسلامیہ کے دینی اور روحانی اصول پر قائم نہین ہے، بلکہ سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ اس مین یورپین قومون کی خصوصیات بھی نہین پائی جاتین،

یہ بتانِ عصر حاضر کہ بنے ہین مدرسون مین　　　نہ ادائے کافرانہ، نہ تراشِ آذرانہ

اس لیے ایک ایسی ملت تیار ہو رہی ہے جس کی نسبت ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا

در میان کافران ہم بودہ ام　　　یک کمر شایستۂ زنار نیست

(۳) موجودہ طریقۂ تعلیم مسلمانون کی قومی اور تاریخی زندگی سے بالکل مطابقت نہین رکھتا اور ان مین وہ جوش، وہ ولولہ، وہ اولوالعزمی اور وہ بلند پروازی نہین پیدا کرتا جس کی مثالین مسلمانون کی گذشتہ قومی تاریخ مین ہر جگہ ملتی ہین،

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہین بچون کو دے رہے ہین خاکبازی کا

ان جستہ جستہ اشعار کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے ضربِ کلیم مین تعلیم و تربیت کا ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے، لیکن بڑی مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ اس عنوان کے تحت مین جو اشعار لکھے ہین ان مین اکثر تعلیم و تربیت سے کوئی تعلق نہین رکھتے، تاہم غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک

(۴) تعلیم کا اصلی مقصد خودی کی نشوونما ہے، چنانچہ اس عنوان کے پہلے ہی صفحہ مین انھون نے حکمائے قدیم و جدید کی زبان سے تعلیم کے دو مقصد بتائے ہین، اسپنوزا کہتا ہے کہ

نظر حیات پہ رکھتا ہے مردِ دانشمند
حیات کیا ہے؟ حضور و سرور و نور و وجود

لیکن افلاطون کے نظریہ کے مطابق

نگاہ موت پہ رکھتا ہے مردِ دانشمند
حیات ہے شبِ تاریک مین شرر کی نمود

ان دونون کے بعد ڈاکٹر صاحب کے نزدیک

حیات و موت نہین التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

لیکن یہی خودی ہے جس کی تعلیم اسکولون، کالجون اور یونیورسٹیون مین نہین دیجاتی، بلکہ ایسی غلامانہ تعلیم دیجاتی ہے جس سے خودی کے تمام احوال و مقامات پوشیدہ رہ جاتے ہین،

اقبال یہان نام نہ لے علمِ خودی کا
موزون نہین مکتب کے لیے ایسے مقالات

بہتر ہے کہ بیچارے ممولون کی نظر سے
پوشیدہ رہین باز کے احوال و مقالات

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے | زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے | ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

کیونکہ خودی کی تربیت صرف مذہبی اور اخلاقی تعلیم پر موقوف ہے، جس سے موجودہ نظامِ تعلیم بالکل خالی ہے، اور صرف خالی ہی نہیں بلکہ مذہب و اخلاق کی بیخکنی کر رہا ہے،

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم | ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

(۵) موجودہ تعلیم صرف معاش کا ایک ذریعہ ہے، اور معاش ہی کی فکر نے تمام قوم کو غلام بنا رکھا ہے

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے | قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا | زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش
اُس جنون سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا | جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش
فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہین بخشا | جس میں رکھدی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش

(۶) لیکن موجودہ تعلیم جس پر مذہب، اخلاق اور عشق و عمل سب کو قربان کیا جا رہا ہے معاش کا بھی کافی انتظام نہیں کرتی،

نوا از سینۂ مرغ چمن برد | زخونِ لالہ آن سوز کہن برد
باین مکتب باین دانش چہ نازی | کہ نان در کف ندا د وجان ز تن برد

اسی لیے مذہبی اور صنعتی تعلیم کو بھی نظامِ تعلیم کا ضروری جزو بنانا چاہیے،

بہ پورِ خویش دین و دانش آموز | کہ تابد چون مہ و انجم نگینش
بدستِ او اگر دادی ہنر را | ید بیضا ست اندر آستینش

سیاست

ڈاکٹر صاحب نے جو سیاسی نظام قائم کیا ہے اس کا

(۱) پہلا اصول موضوعہ یہ ہے کہ زمین کسی شخص، کسی خاندان اور کسی قوم کی ملک نہین ہے، بلکہ دنیا مین جو کچھ ہے سب خدا کا ہے،

سرگذشتِ آدم اندر شرق و غرب	بہر خاکے فتنہ ہاے حرب و ضرب
یک عروس و شوہر او ما ہمہ	آن فسونگر بے ہمہ ہم با ہمہ
عشوہ ہاے او ہمہ مکر و فن است	نے از آنِ تو نہ از آنِ من است
حق زمین را جز متاعِ ما نگفت	این متاعِ بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا! نکتۂ از من پذیر	رزق و گور از وے بگیر او را مگیر
تو عقابی طائفِ افلاک شو	بال و پر بکشا و پاک از خاک شو

(۲) لیکن آج تک دنیا نے ملوکیت کے ذریعہ سے خدا کی زمین پر قبضۂ غاصبانہ کر کے اسکو اپنی موروثی جائداد بنا لیا تھا، اس لیے ڈاکٹر صاحب ملوکیت کے سخت مخالف ہین،

ملوکیت سراپا شیشہ بازی است	از و ایمن نہ رومی نے حجازی است
عرب خود را بہ نورِ مصطفیٰ سوخت	چراغِ مردۂ مشرق برافروخت
ولیکن آن خلافت راہ گم کرد	کہ اول مومنان را شاہی آموخت
ہنوز اندر جہان آدم غلام است	نظامش خام و کارش ناتمام است

غلامِ فقرِ آن گیتی پناہم | کہ در دینش ملوکیت حرام است

ملوکیت کا یہ سیاسی نظام ابلیس کا قائم کیا ہوا ہے، جس پر اس کو نہایت فخر ہے،

مین نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب | مین نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسون

اور اس ابلیسی نظامِ سیاست نے ایک طرف تو مسجد، دیر اور کلیسا کا افسون توڑ کر سلطنت کو مذہب اور اخلاق سے بالکل بیگانہ کر دیا اور اس بیگانگی کی تعلیم سب سے پہلے میکیا ولی نے دی اس لیے ڈاکٹر صاحب میکیا ولی کو ابلیس کا بھیجا ہوا پیغمبر سمجھتے ہین،

دہریت چون جامۂ مذہب درید | مرسلے از حضرت شیطان رسید

آن فلارنساویِ باطل پرست[1] | سرمۂ او دیدۂ مردم شکست

نسخۂ بہر شہنشاہان نوشت | در گلِ ما دانۂ پیکار کشت

مملکت را دینِ او معبود ساخت | فکر او مذموم را محمود ساخت

بوسہ تا بر پاے این معبود زد | نقدِ حق را بر عیارِ سود زد

باطل از تعلیمِ او بالیدہ است | حیلہ اندازی فنے گردیدہ است

دوسری طرف غلامی کے خمیر کو اور بھی زیادہ پختہ کر دیا،

اس مین کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام | پختہ تر اس سے ہوے خوے غلامی مین عوام

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج | صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہین تمام

اس لیے اس ابلیسی نظام کے توڑنے کے لیے سب سے پہلے آزادی کی ضرورت ہے اور ڈاکٹر صاحب اصولاً آزادی کے سب سے بڑے حامی ہین،

خودگیری و خودداری و گلبانگِ انا الحق | آزاد ہو سالک تو ہین یہ اسکے مقامات

---

[1] فلارنساوی یعنی میکیا ولی کتاب الملوک کا مشہور مصنف جو فلارنس مین پیدا ہوا۔

محکوم ہو سالک تو یہی اسکا ہمہ اوست — خود مردہ و خود مرقد و خود مرگِ مفاجات

آزاد کی رگ سخت ہے مانند رگِ سنگ — محکوم کی رگ نرم ہے مانند رگِ تاک

محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید — آزاد کا دل زندہ و پرسوز و طربناک

آزاد کی دولت دلِ روشن نفسِ گرم — محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک

محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروت — ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک

ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش — وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک

لیکن باانیمہ وہ موجودہ دور کی آزادی کو بھی خطرہ سے خالی نہیں سمجھتے،

بطے میگفت بحر آزاد گردید — چنین فرمان ز دیوانِ خضر رفت

نہنگے گفت رو ہر جا کہ خواہی — ولے از ما بنباید بے خبر رفت

اور اس آزادی کا جو نتیجہ موجودہ جمہوری حکومتوں کی شکل میں نکلا ہے اس سے بالکل غیر مطمئن ہیں،

۱۔ اولاً تو وہ اصولاً جمہوریت کو نظامِ حکومت کی کوئی بہترین شکل نہیں سمجھتے، اگرچہ پچھلی صدی کے اواخر میں جمہوریت کو بہترین نظام حکومت خیال کیا جاتا تھا، مگر اس صدی کے اوائل میں یورپ کے بعض مفکرین نے اس طرزِ حکومت پر شدید حملے کیے جن میں نٹشے، لیپان، فان ٹرائتشگی شپنگلر، سٹوڈرڈ، میگیڈوگل وغیرہ بہت اہمیت رکھتے ہیں[۵]، اور اب تو یورپ میں بھی جمہوریت کے خلاف زبردست رائے پیدا ہو گئی ہے، اور بیسیوں کتابیں اس کی خرابیوں پر لکھی جا رہی ہیں، بہرحال بعض مغربی مفکر اور سائنسدان ان جمہوری اصول کے سخت مخالف ہیں، اور ان کی مخالفت کی بعض دلیلیں یہ ہیں،

(۱) جمہوری حکومت متوسط اور ادنی درجہ کے لوگوں کی حکومت ہوتی ہے،

---

[۱] ماخوذ از مضمون ڈاکٹر سید عبداللہ ایم۔اے مندرجہ معارف بابت مارچ ۱۹۴۶ء ص ۱۹۶

(۲) اس مین اعلیٰ دماغ اور شخصیتون کو قابلیت کے اظہار کا موقع نہین ملتا جس کی وجہ سے قوم مین ذہن وفکر کی تربیت مسدود ہو جاتی ہے،

(۳) حکومت مین عوام کی مداخلت اور حق رائے دہی کی وسعت، فرقون کی بے انتہا کثرت کا باعث ہو جاتی ہے، جمہور کی آزادی مین لاکھ برکتین سہی لیکن اس بات سے انکار نہین کیا جاسکتا کہ جمہور کا یہ غلبۂ عام اور عوام کی مطلق العنانی کسی نظام کو بھی پائدار اور مستحکم نہین ہونے دے گی اور آئے دن کے انقلابات اور سریع الوقوع تغیرات قومی تعمیر اور انسانی ترقی مین رکاوٹ پیدا کرینگے،

اور ڈاکٹر صاحب بھی ان دلائل سے یقیناً متاثر ہین، چنانچہ پہلی اور دوسری دلیل کو شاعرانہ طرز مین اس طرح پیش کرتے ہین،

متاعِ معنیِ بیگانہ از دون فطرتان جوئی — ز موران شوخیِ طبعِ سلیمانی نمے آید
گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو — کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمے آید

اس راز کو اک مرد فرنگی نے کیا فاش — ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہین کرتے
جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس مین — بندون کو گنا کرتے ہین تولا نہین کرتے

یعنی اس طرز حکومت مین قابلیت کا اندازہ نہین کیا جاسکتا بلکہ صرف ووٹون کی کثرتِ تعداد سے ایک شخص کا انتخاب کر لیا جاتا ہے، لیکن یہ ضروری نہین کہ جس شخص کو زیادہ ووٹ مل جائین وہ قابل بھی ہو،

تیسری دلیل کو گلشن راز مین اس طرح بیان کرتے ہین،

فرنگ آئینِ جمہوری نہاد است — رسن از گردن دیوے نہاد است
گروہے را گروہے در کمین است — خدایش یار اگر کارش چنین است
چو رہزن کاروانے در تگ و تاز — شکمہا بہر نانے در تگ و تاز

زمن چه اہل مغرب را پیامے | کہ جمہور است تیغ بے نیامے
نہ ماند در غلاف خود زمانے | برد جان خود و جان جہانے[1]

(۲) ثانیاً اس وقت یورپ مین جو جمہوری نظام حکومت قائم ہے وہ عملاً ملوکیت ہی کی ایک شکل ہے، فرق صرف یہ ہے کہ پہلے جو جبر و استبداد مطلق العنان بادشاہ کیا کرتے تھے اب اسی کو جمہوری حکومتین قومی بھیس بدل کر کر رہی ہین،

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام | جسکے پردون مین نہین غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا مین پاے کوب | تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق | طب مغرب مین مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمی گفتار اعضاے مجالس الامان | یہ بھی اک سرمایہ دارون کی ہے جنگ زرگری
اس سراب رنگ و بو کو گلستان سمجھا ہے تو | آہ اے نادان قفس کو آشیان سمجھا ہے تو

اس لیے جمہوریت بھی ملوکیت کا ایک پردہ ہے، چنانچہ ابلیس کا دوسرا مشیر جب اس کے پہلے مشیر سے جمہوریت کے متعلق سوال کرتا ہے

خیر ہے سلطانیٔ جمہور کا غوغا کہ شر؟ | تو جہان کے تازہ فتنون سے نہین ہے باخبر

تو جواب دیتا ہے،

ہون مگر میری جہان بینی بتاتی ہے مجھے | جو ملوکیت کا اک پردہ ہو کیا اس سے خطر
ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس | جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خودنگر
کاروبار شہریاری کی حقیقت اور ہے | یہ وجود میر و سلطان پر نہین ہے منحصر
مجلس ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو | ہے وہ سلطان غیر کی کھیتی پہ ہو جسکی نظر

[1] ماخوذ از مضمون ڈاکٹر سید عبداللہ ایم اے مندرجہ معارف بابت مارچ ۱۹۴۶ء ص ۲۰۳

تو نے کیا دیکھا نہین مغرب کا جمہوری نظام　　　چہرہ روشن اندرون چنگیز سے تاریک تر

موسیو لینن کو ناز ہے کہ انسان اگرچہ ایک مدت تک قیصر و زار کے دام تزویر مین گرفتار رہا، لیکن اب جمہور نے اس پُرفریب جال کے تار تار کو توڑ ڈالا ہے، اور دنیا غلامی سے آزاد ہو گئی ہے،

غلام گرسنہ دیدی کہ بر درید آخر　　　قمیص خواجہ کہ رنگین ز خون ما بود ست

شرار آتش جمہور کہنہ سامان سوخت　　　ردائے پیر کلیسا قبائے سلطان سوخت

لیکن قیصر ولیم اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ انسان اب بھی قصر ملوکیت کا طواف کر رہا ہے اور غلامی بدستور باقی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ پہلے قبائے سلطانی کو خسرو زیب تن کرتا تھا اور اب اس قبا کو خسرو سے چھین کر کوہکن (مزدور) نے پہن لیا ہے،

گناہ عشوہ و ناز بتان چیست　　　طواف اندر سرشت برہمن ہست

اگر تاج کئی جمہور پوشد　　　ہمان ہنگامہ ہا در انجمن ہست

نماند ناز شیرین بے خریدار　　　اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

لیکن بااینہمہ اشتراکی نظام حکومت جمہوری نظام حکومت سے بہتر ہے جمہوری نظام حکومت نے ملوکیت کی روح کو قائم رکھا ہے، اس لیے ابلیس کے مشیر اس سے بہت زیادہ نہین گھبراتے لیکن اشتراکی نظام حکومت نے اس روح کو بالکل فنا کر دیا ہے، اس لیے اس کے مشیر اس سے بہت زیادہ پریشان ہین، اور اضطراب کی حالت مین سوال کرتے ہین،

روح سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب　　　ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب

وہ کلیم بے تجلی، وہ مسیح بے صلیب　　　نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

کیا بتاؤن کیا ہے کافر کی نگاہ پردہ سوز　　　مشرق و مغرب کی قومون کیلیے روز حساب

اس سے بڑھکر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد　　　توڑ دی بندون نے آقاؤن کے خیمون کی طناب

اور ڈاکٹر صاحب بھی مختلف حیثیتون سے اشتراکیت کی تائید کرتے ہین، اور ان کو اس نظام حکومت مین اسلامی نظامِ حکومت کے بہت سے اجزاء ملتے ہین، چنانچہ انھون نے جاوید نامہ مین سید جمال الدین افغانی کی زبان سے روسیون کو جو پیغام دیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قیصریت کی شکست، سود کی مذمت، زمین پر خدا کا قبضہ، تمام انسانی برادری کے مساوات مین مسلمان اور روسی متحد الخیال ہین،

ہمچو ما اسلامیان اندر جہان — قیصریت را شکستی استخوان

ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو — لن تنالوا البر حتی تنفقوا

از ربا آخر چہ مے آید؟ فتن — کس نداند لذتِ قرضِ حسن

از ربا جان تیرہ دل چون خشت و سنگ — آدمی درندہ بے دندان و چنگ

رزق خود را از زمین بردن رواست — این متاعِ بندہ و ملکِ خداست

بندۂ مومن امین، حق مالک است — غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است

آب و نانِ ماست از یک مائدہ — دودۂ آدم "کنفسِ واحدہ"

اسلام کے ابتدائی زمانے مین مسلمانون کو زائد از ضرورت مال کے جمع کرنے کی ممانعت تھی، اور ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ جو مال ضرورت سے زائد ہو اس کو خیرات کر دین،

وَيَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ — لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ کونسا مال خیرات کرین؟

قُلِ الْعَفْوَ — کہدو کہ وہ مال جو ضرورت سے زائد ہو،

گو یہ حکم بعد مین منسوخ ہو گیا، لیکن اس کی اصلی روح باقی رہی،

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اشتراکی نظریۂ مال بھی اسی قرآنی تعلیم کا اعادہ کر رہا ہے، چنانچہ ضرب کلیم مین اشتراکیت کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس مین فرماتے ہیں،

قومون کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم — بے سود نہین روس کی یہ گرمیِ رفتار

اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار

انسان کی ہوس نے جنھیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہین بتدریج وہ اسرار

قرآن مین ہو غوطہ زن اے مرد مسلمان
اللہ کرے تجھکو عطا جدتِ کردار

جو حرف "قل العفو" مین پوشیدہ ہے ابتک
اس دور مین شاید وہ حقیقت ہو نمودار

قرآنی تعلیمات کے علاوہ ڈاکٹر صاحب اخلاقی حیثیت سے بھی اشتراکی تحریک کی تائید کرتے ہین، اور ان کے نزدیک سرمایہ دارون اور مزدورون کے درمیان تقسیم مال کا جو غیر مساویانہ طریقہ جاری ہے، وہ سخت ظالمانہ ہے، اور اس پر انھون نے نہایت پرتاثیر نظمین لکھی ہین، چنانچہ پیام مشرق مین "قسمت نامۂ سرمایدار و مزدور" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس مین سرمایہ دار اور مزدور کی زندگی کا موازنہ نہایت خوبی کے ساتھ کیا ہے، اور اس کے پہلے مصرع مین مزدور کی اور دوسرے مصرع مین سرمایہ دار کی زندگی کا نقشہ نہایت عمدہ شاعرانہ ایجاز کے ساتھ کھینچا ہے،

غوغاے کارخانۂ آہنگری زمن
گلبانگِ ارغنونِ کلیسا از آنِ تو

نخلے کہ شہ خراج برو مے نہد زمن
باغِ بہشت و سدرہ و طوبیٰ از آنِ تو

تلخابہ کہ درد سر آرد زانِ من
صہباے پاک آدم و حوا از آنِ تو

مرغابی و تدرو و کبوتر از آنِ من
ظلِ ہما و شہپر عنقا از آنِ تو

این خاک و انچہ در شکم او از آنِ من
وز خاک تا بہ عرشِ معلا از آنِ تو

اس لیے اس غیر متوازن زندگی کو انسانی خودی کسی طرح برداشت نہین کر سکتی، اور ڈاکٹر صاحب نے "نواے مزدور" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس مین بھی خودداری پائی جاتی ہے،

ز مزد بندۂ کرپاس پوش و محنت کش
نصیبِ خواجۂ ناکردہ کار رختِ حریر

ز خوے فشانیٔ من لعل خاتم والی
ز اشک کودک من گوہر ستامِ امیر

ز خونِ من چو زلو فربہی کلیسا را | بزورِ بازوئے من دستِ سلطنت ہمہ گیر

خرابہ رشکِ گلستان ز گریۂ سحرم | شبابِ لالہ و گل از طراوتِ جگرم

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز | مئے کہ شیشہ گدازد بہ ساغر اندازیم

مغان و دیرِ مغان را نظامِ تازہ دہیم | بنائے میکدہائے کہن براندازیم

ز رہزنانِ چمن انتقامِ لالہ کشیم | بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم

بطوفِ شمع چو پروانہ زیستن تا کے | ز خویش این ہمہ بیگانہ زیستن تا کے

لیکن سرمایہ دار اس فرقِ مراتب کے مٹانے پر آمادہ نہیں ہے، اور اس پر عقلی دلائل قائم کرتا ہے،

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند | ہمان نخل را شاخ و برگ و بر اند

دماغ از خرد زاست از فطرتِ اوست | اگر پا زمین ساست از فطرتِ اوست

یکے کار فرما یکے کار ساز | نیاید ز محمود کارِ ایاز

نہ بینی کہ از قسمتِ کارزیست | سراپا چمن مے شود خارزیست

ایک مدت تک تو سرمایہ دار نے مزدور کو اس فریب میں مبتلا رکھکر اسکو شکست دی،

دستِ دولت آفرین کو مزد یون ملتی رہی | اہلِ ثروت جیسے دیتے ہین غریبونکو زکات

مکر کی چالون سے بازی لے گیا سرمایہ دار | انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

لیکن اشتراکی تحریک نے اس مکر و فریب کا پردہ چاک کر دیا، اور مزدور پکار اٹھا،

فریبی بحکمت مرا اے حکیم | کزو نتوان شکست این طلسمِ قدیم

مسِ خام را از زر اندودۂ | مرا خوے تسلیم فرمودۂ

کند بحر را آبِ نایم اسیر | ز خارا برد تیشہ ام جوئے شیر

حقِ کوہکن دادہ اے نکتہ سنج | بہ پرویز پر کار و نا بردہ رنج

خطا را بحکمت نگردان صواب | خضر را انگیری بدام سراب
بدوش زمین بار سرمایہ دار | ندارد گذشت از خور و خواب
جهان راست بہروزی از دست مزد | ندانی کہ این ہیچ کار ہست وزد
پئے جرم او پوزش آورده | باین عقل و دانش فسون خورده

بہرحال اشتراکیت ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا ایک دلچسپ موضوع ہے اور انھون نے بال جبرئیل وغیرہ مین اس کی تائید مین اسقدر پرجوش نظمین لکھی ہین کہ وہ بظاہر سوشلسٹ معلوم ہونے لگتے ہین، لیکن بااینہمہ وہ اس تحریک کے بعض بنیادی اصولون کے ساتھ متفق نہیں ہین، ان کے نزدیک یہ خالص ملحدانہ مادی تحریک ہے، جس کی بنیاد خداپرستی کے بجائے شکم پرستی پر قائم ہے اس لیے جہانتک نتائج کا تعلق ہے اشتراکیت اور ملوکیت مین کوئی فرق نہین ہے بلکہ دونون بندۂ زر اور بندۂ شکم ہین۔

صاحب سرمایہ[1] از نسل خلیل | یعنی آن پیغمبر بے جبرئیل
زانکہ حق در باطل او مضمر است | قلب او مومن دماغش کافر است
غربیان گم کردہ اند افلاک را | در شکم جویند جان پاک را
رنگ و بو از تن نگیرد جان پاک | جز بتن کارے ندارد اشتراک
دین آن پیغمبر حق ناشناس | بر مساوات شکم دارد اساس
تا اخوت را مقام اندر دل است | بیخ او در دل نہ در آب و گل است

لیکن یہی تن پروری ملوکیت کا بھی مقصد ہے،

ہم ملوکیت بدن را فربہی است | سینۂ بے نور او از دل تہی است

[1] صاحب سرمایہ کارل مارکس مصنف کتاب سرمایہ،

فرق صرف یہ ہے کہ ملوکیت خدا کی زمین پر خراج مقرر کر کے اس مقصد کو حاصل کرتی ہے اور اشتراکیت بغاوت کے ذریعہ سے اس کو حاصل کرنا چاہتی ہے، خدا سے دونون غافل ہین، اور دونون انسانون کو دھوکا دینا چاہتے ہین،

ہر دو را جان ناصبور و ناشکیب	ہر دو یزدان ناشناس آدم فریب
زندگی این را خروج آن را خراج	درمیان این دو سنگ آدم زجاج
این بعلم و دین و فن آرد شکست	آن برد جان را ز تن نان را ز دست
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل	ہر دو را تن روشن و تاریک دل

اشتراکیت نے اگرچہ ملوکیت کا خاتمہ کر دیا ہے، لیکن فقط اس نفی سے کام نہین چل سکتا، "لا" کے ساتھ "الا" کی آمیزش بھی ضروری ہے اور اشتراکیت نے اگرچہ بادشاہون کے بتون کو توڑ پھوڑ ڈالا ہے، لیکن اس نے ابتک خدا کا اعتراف نہین کیا ہے، اس لیے وہ محض ایک مادی طاقت ہے جس کو دوسری مادی طاقت توڑ سکتی ہے، چنانچہ اس کو توڑنے کے لیے فسطائی طاقتین پیدا ہو گئی ہین،

توڑ اس کا رومۃ الکبریٰ کے ایوانون مین دیکھ	آل سیزر کو دکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب
کون بحر روم کی موجون سے ہے لپٹا ہوا	گاہ بالد چون صنوبر گاہ نالد چون رباب

اس لیے ابلیس بھی اشتراکی نظام حکومت سے بہت زیادہ خائف نہین ہے، اور نہایت بے پروائی کے ساتھ کہتا ہے،

دست فطرت نے کیا ہے جن گریبانون کو چاک	مزدکی منطق کی سوزن سے نہین ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہین مجھکو اشتراکی کوچہ گرد	یہ پریشان روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مو
جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے	مزدکیت فتنۂ فردا نہین اسلام ہے

اس کو جو کچھ خوف ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے حالات سے کہین پھر وہی اسلامی نظام حکومت

نہ قائم ہو جائے،

عصر حاضر کے تقاضاؤن سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہین

موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقان، نے فقیر رہ نشین

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعمون کو مال و دولت کا بناتا ہے امین

اس سے بڑھکر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہون کی نہین اللہ کی ہے یہ زمین

ان تمام تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ ملوکیت، جمہوریت، اشتراکیت، مطلقیت غرض کوئی نظام حکومت ڈاکٹر صاحب کے نزدیک قابل اطمینان نہین ہے، اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کس نظام حکومت کو پسند کرتے ہین؟ اور اس پسندیدگی کے وجوہ و اسباب کیا ہین؟

(۱) ڈاکٹر صاحب کے تمام کلام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس طرح دوسرے امور مین عقلی بنیاد عمل کے مخالف ہین، اسی طرح نظریۂ سلطنت مین بھی انھین عقلی بنیاد سے خاص پرخاش ہے، کیونکہ عقلی قوانین مین انسان کی خود غرضی اور انفرادیت پسندی کی چاشنی ضرور شامل ہوگی،

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام
نے غلام او را نہ کس او را غلام

عقل خود بین غافل از بہبود غیر
سود خود بیند نہ بیند سود غیر

وحیِ حق بینندۂ سود ہمہ
در نگاہش سود و بہبود ہمہ

عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف
وصل و فصلش لایراعی لایخاف

غیر حق چون ناہی و آمر شود
زور ور بر ناتوان قاہر شود

زیر گردون آمری از قاہری ست
آمری از ماسوی اللہ کافری ست

قاہر آمر کہ باشد پختہ کار
از قوانین گرد خود بندد حصار

جرۂ شاہین تیز چنگ و زود گیر
صعوہ را در کار ہا گیرد مشیر

قاہری را شرع و دستوری دہد	بے بصیرت سرمہ با کوری دہد
حاصلِ آئین و دستورِ ملوک[۱]	دہ خدایان فربہ و دہقان چون دوک

(۲) اس بنا پر ان کے نزدیک نظامِ سلطنت کی بنیاد مذہب اور اخلاق پر قائم ہونی چاہیے، ورنہ جمہوریت اور اشتراکیت سب کی سب وہی ملوکیت کا قدیم چنگیز خانی قالب اختیار کر لیں گی،

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا	طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی
جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو	جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اور مذہب و سیاست کی یہ علحدگی مارٹن لوتھر اور میکیاولی کے بدولت عمل میں آئی، جس میں میکیاولی نے سیاست کو مذہب سے اور مارٹن لوتھر نے مذہب کو سیاست سے بالکل الگ کر دیا، اور اس تفریق میں روح اور مادہ کی ثنویت کا اصول کارفرما تھا، یعنی میکیاولی کے نزدیک سیاست کو صرف مادیات سے اور مارٹن لوتھر کے نزدیک مذہب کو صرف روحانیات سے تعلق تھا، اس لیے دونوں کے حدود اقتدار الگ الگ تھے اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی	سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں	کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا	چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی	ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دین کے لیے نامرادی	دوئی چشم تہذیب کی نابصیری

لیکن ڈاکٹر صاحب کے نزدیک روح و مادہ کی ثنویت کا یہ اصول ہی سرے سے غلط ہے بلکہ روح و مادہ دونوں ایک ہی چیز ہیں،

[۱] ماخوذ از مضمون ڈاکٹر سید عبداللہ ایم اے مندرجہ معارف بابت مارچ سنہ ۱۹۴۲ء ص ۱۹۸ - ۱۹۹

تن وجان را دو تا گفتن کلام است | تن وجان را دو تا دیدن حرام است

کلیسا سبحۂ پطرس شمارد | کہ او با حاکمی کارے ندارد

بدن را تا فرنگ از جان جدا دید | نگاہش ملک و دین راہم دو تا دید

خرد را با دلِ خود ہم سفر کن | یکے بر ملتِ ترکان نظر کن

بہ تقلید فرنگ از خود رمیدند | میانِ ملک و دین ربطے ندیدند

اس لیے ڈاکٹر صاحب صرف اسی نظامِ سلطنت کو پسند کرتے ہیں جس میں روح و مادہ کی وحدت قائم رہے، اور اس قسم کا نظام سلطنت صرف اسلام نے قائم کیا ہے،

یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشین کا | بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی | کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

یہی وہ نظامِ سلطنت ہے جس میں ایک شخص بادشاہ ہو کر بھی فقیر رہ سکتا ہے،

تو اے بادِ بیابان از عرب خیز | زنیلِ مصریان موجے برانگیز

بگو فاروق را پیغام فاروق (شاہ مصر) (حضرت عمرؓ) | کہ خود در فقر و سلطانی بیامیز

خلافت فقر با تاج و سریر است | زہے دولت کہ پایان ناپذیر است

جوان بختا مدہ از دست این فقر | کہ بے او پادشاہی زود میر است

اور یہی وہ فقیر ہے جو ملوکیت کا شیرازہ درہم برہم کر سکتا ہے،

در افتد با ملوکیت کلیمے | فقیرے بے کلاہے بے گلیمے

گہے باشد کہ بازیہائے تقدیر | بگیرد کار صرصر از نسیمے

اگرچہ اسلام میں بھی خلیفہ کا انتخاب جمہوری طریقہ پر ہوتا ہے، لیکن یہ طریقۂ انتخاب اس زمانہ کے طریقۂ انتخاب سے بالکل مختلف ہے، کیونکہ

(۱) اسلامی امیر مدۃ العمر کے لیے منتخب ہوتا ہے اور روزمرہ کے انتخابات کے فسادات سے قوم محفوظ رہتی ہے،

(۲) اسلامی امیر اس منصب کے لیے اپنے آپ کو پیش نہیں کرسکتا اور جو شخص ایسا کرے وہ اس منصب کا اہل نہیں سمجھا جاتا،

غرض اس قسم کے بے شمار امتیازات ہیں جو اسلامی خلافت کو مغربی جمہوریت سے ممتاز کرتے ہیں،

صنفِ لطیف

یعنی عورت

ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے اس مین شاعرانہ آب ورنگ اور فلسفیانہ نکتہ سنجی بہت کم پائی جاتی ہے، اس باب مین انھون نے اسلام کی صاف اور سادہ تعلیمات کا اعادہ کر دیا ہے، موجودہ دور مین آزادیٔ نسوان کی تحریک عورتون کو جس شاہراہ پر لے چلنا چاہتی ہے، اس کی دعوت ایک یورپین عورت نے جو نبوت کی مدعی تھی فلکِ مریخ پر تمام عورتون کو اس طرح دی تھی۔

اے زنان اے مادران اے خواہران　　زیستن تا کے مثالِ دلبران
دلبری اندر جہان مظلومی است　　دلبری محکومی و محرومی است
از اموموت زرد روئے مادران　　اے خنک آزادیٔ بے شوہران
آمد آن وقتے کہ از اعجازِ فن　　مے توان دیدن جنین اندر بدن
حاصلے بر داری از کشتِ حیات　　ہر چہ خواہی از بنین و از بنات
گر نباشد بر مرادِ ما جنین　　بے محابا کشتن او عین دین
پرورش گیرد جنین نوعِ دگر　　بے نسب ارحام دریابد سحر
انچہ از نیسان فروریزد دگیر　　اے صدف در زیر دریا تشنہ میر
خیز و با فطرت بیا اندر ستیز　　تا ز پیکار تو حر گردد کنیز

رستن از ربط دو تن توحید زن　　　　حافظ خود باش و بر مردان متن

(۱) اس دعوت کا خلاصہ یہ ہے کہ عورتون کو قدرتی طور پر مادرانہ فرائض کے انجام دینے کی ضرورت نہین، بلکہ اس زمانے مین سائنس نے اسقدر ترقی کر لی ہے کہ بچے خود بخود مصنوعی طریقون سے پیدا کر لیے جا سکتے ہین، لیکن ڈاکٹر صاحب انھی مادرانہ فرائض ہی کو عورت کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتے ہین،

از امومت پیچ و تاب جوے ما　　　　موج و گرداب و حباب جوے ما

آن دخ رستاق زادے جاہلے　　　　پست بالاے سطبرے بدگلے

ناتراشے پرورش نادادۂ　　　　کم نگاہے کم زبانے سادۂ

دل ز آلام امومت کردہ خون　　　　گرد چشمش حلقہ ہاے نیلگون

ملت ار گیرد ز آغوشش بدست　　　　یک مسلمان غیور حق پرست

ہستی ما محکم از آلام اوست　　　　صبح ما عالم فروز از شام اوست

وان تہی آغوش نازک پیکرے　　　　خانہ پرورد نگاہش محشرے

فکر او از تاب مغرب روشن است　　　　ظاہرش زن باطن او نازن است

تا شوخ چشم و فتنہ زا آزادیش　　　　از حیا نا آشنا آزادیش

علم او بار امومت برنتافت　　　　بر سر شامش یکے اختر نتافت

این گل از بستان ما نا رستہ بہ　　　　داغش از دامان ملت شستہ بہ

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک عورت کا کمال یہ نہین ہے کہ وہ علم و فضل مین ارسطو اور افلاطون بن جائے بلکہ اس کا اصلی کمال یہ ہے کہ وہ ارسطو اور افلاطون کو پیدا کرے،

وجود زن سے ہے تصویر کائنات مین رنگ　　　　اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز درون

شرف سے بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اسکی — کہ ہر شرف ہے اسی درج کا در مکنون

مکالمات فلاطون نہ لکھ سکی لیکن — اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرار افلاطون

(۲) عورتوں کو نکاح کی بندشوں سے آزاد ہو کر اپنی انفرادی خودی کو ترقی دینی چاہیے،

لیکن ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اسلامی تعلیمات کے مطابق عورت اور مرد کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے اور دونوں ایک دوسرے سے علٰحدہ نہیں ہو سکتے،

نغمہ خیز از زخمۂ زن ساز مرد — از نیاز او دوبالا ناز مرد

پوششِ عریانیِ مردان زن است — حسن دلجو عشق را پیراہن است

اگرچہ ڈاکٹر صاحب کو بھی اس کا افسوس ہے کہ مرد کے جوہر تو عورت کے بغیر کھل جاتے ہیں لیکن عورت کے جوہر بغیر مرد کے نہیں کھلتے، تاہم یہ ایک قدرتی چیز ہے اور اس کا کوئی علاج نہیں،

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بےمنتِ غیر — غیر کے ہاتھ ہیں ہے جوہر عورت کی نمود

ہیں بھی مظلومیٔ نسوان سے ہوں غمناک بہت — نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

لیکن باایں ہمہ احتیاج عورت کو لونڈی سمجھ لینا بھی سخت غلطی ہے،

مسلمے کو را پرستارے شمرد — بہرۂ از حکمتِ قرآن نبرد

(۳) مادرانہ فرائض اور نکاح کی بندشوں سے آزاد ہونے کے بعد عورتوں کی آزادی کا ایک دوسرا مظہر بے پردگی ہے اور ڈاکٹر صاحب اس کے سخت مخالف ہیں،

اگرچہ بظاہر یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب مردوں کو تو اثباتِ خودی کی تعلیم دیتے ہیں، لیکن عورتوں کو اس کا موقع دینا نہیں چاہتے، کہ وہ آزادی حاصل کرکے اپنی خودی کا تحقق و اثبات کر سکیں، لیکن درحقیقت ڈاکٹر صاحب عورتوں کی ترقی کے مخالف نہیں ہیں بلکہ وہ صرف ان طریقوں کے مخالف ہیں جو آزادیِ نسوان کی تحریک نے اس مقصد کو حاصل کرنے

کے لیے اختیار کیے ہیں، ڈاکٹر صاحب کے نزدیک خودی کی ترقی کا ذریعہ یہ ہے کہ ہر فرد اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں آزاد ہو، عورت کی صلاحیتیں مرد کی صلاحیتوں سے مختلف ہیں اور ان صلاحیتوں کو ایک بتانا اور ان کے فرق سے انکار کرنا فطرت کو منہ چڑھانا ہے[1]، اس لیے عورت اپنی خودی کی ترقی و تکمیل صرف پردہ میں رہ کر کر سکتی ہے،

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے | روشن ہے نگہ آئینۂ دل ہے مکدر
بڑھ جاتا ہے جب ذوق نظر اپنی حدوں سے | ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر
آغوشِ صدف جسکے نصیبوں میں نہیں ہے | وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر
خلوت میں خودی ہوتی ہے خودگیر ولیکن | خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسر

یہی ذوق نظر جو اپنے حدود سے بڑھ کر خیالات کو پراگندہ و ابتر کر دیتا ہے عورت کو زیب و زینت، بے پردگی، خود نمائی اور بے باکی کی طرف مائل کرتا ہے، اس لیے ڈاکٹر صاحب عورتوں کو ان محرکات سے روکتے ہیں،

بہل اے دخترک این دلبری ہا | مسلمان را نہ زیبد کافری ہا
منہ دل بر جمال غازہ پرورد | بیاموز از نگہ غارت گری ہا

نگاہ تست شمشیر خداداد | بزخمش جان ما را حق بہا داد
دل کامل عیار آن پاک جان برد | کہ تیغ خویش را آب از حیا داد

ضمیر عصر حاضر بے نقاب است | کشادش در نمود رنگ و آب است
جہانتابی ز نور حق بیاموز | کہ او با صد تجلی در حجاب است

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک خودی کا تحقق و اثبات صرف فقر، قوت، حریت اور سادگی سے

---

[1] روح اقبال ص ۲۶۹

ہوسکتا ہے اور یہ تمام اوصاف حضرت فاطمہ زہراؓ کی ذات مین جمع ہو گئے تھے، اس لیے انھون نے عورتون کے سامنے اُنھی کے اسوۂ حسنہ کو پیش کیا ہے،

اگر پندے ز درویشے پذیری | ہزار امت بمیرد تو نمیری
بتولے باش و پنہان شو ازین عصر | کہ در آغوش شبیرے بگیری

اور مثنوی رموز بیخودی مین اس کی مزید تشریح کی ہے

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز | از سہ نسبت حضرت زہرا عزیز
نور چشم رحمۃ اللعالمین | آن امام اولین و آخرین
بانوے آن تاجدار ہل اتیٰ | مرتضیٰ مشکل کشا شیر خدا
پادشاہ و کلبۂ ایوان او | یک حسام و یک زرہ سامان او
مادر آن مرکز پرکار عشق | مادر آن کاروان سالار عشق
وان دگر مولاے ابرار جہان | قوت بازوے احرار جہان
در نواے زندگی سوز از حسین | اہل حق حریت آموز از حسین
مزرع تسلیم را حاصل بتول | مادران را اسوۂ کامل بتولؓ
نوری و ہم آتشی فرمانبرش | گم رضایش در رضاے شوہرش
آن ادب پروردۂ صبر و رضا | آسیا گردان و لب قرآن سرا

حضرت فاطمہ زہراؓ کے ان اوصاف کو گنا کر عورتون کو انھی کے اسوۂ حسنہ کے تقلید کرنے کی دعوت دی ہے،

از سر سود و زیان سودا مزن | گام جز بر جادۂ آبا مزن
ہوشیار از دستبرد روزگار | گیر فرزندان خود را در کنار

این چمن زادان کہ پر نکشادہ اند | ز آشیانِ خویش دور افتادہ اند

فطرت تو جذبہ ہا دارد بلند | چشم ہوش از اسوۂ زہرا بنبد

تا حسینی شاخ تو بار آورد | موسم پیشین بگلزار آورد

ان تمام اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے عورتوں کی خودی کو آزادانہ بیراہ روی سے صرف اسلیے روکا ہے کہ وہ ایک مکمل فطری خودی کو پیدا کر سکیں،
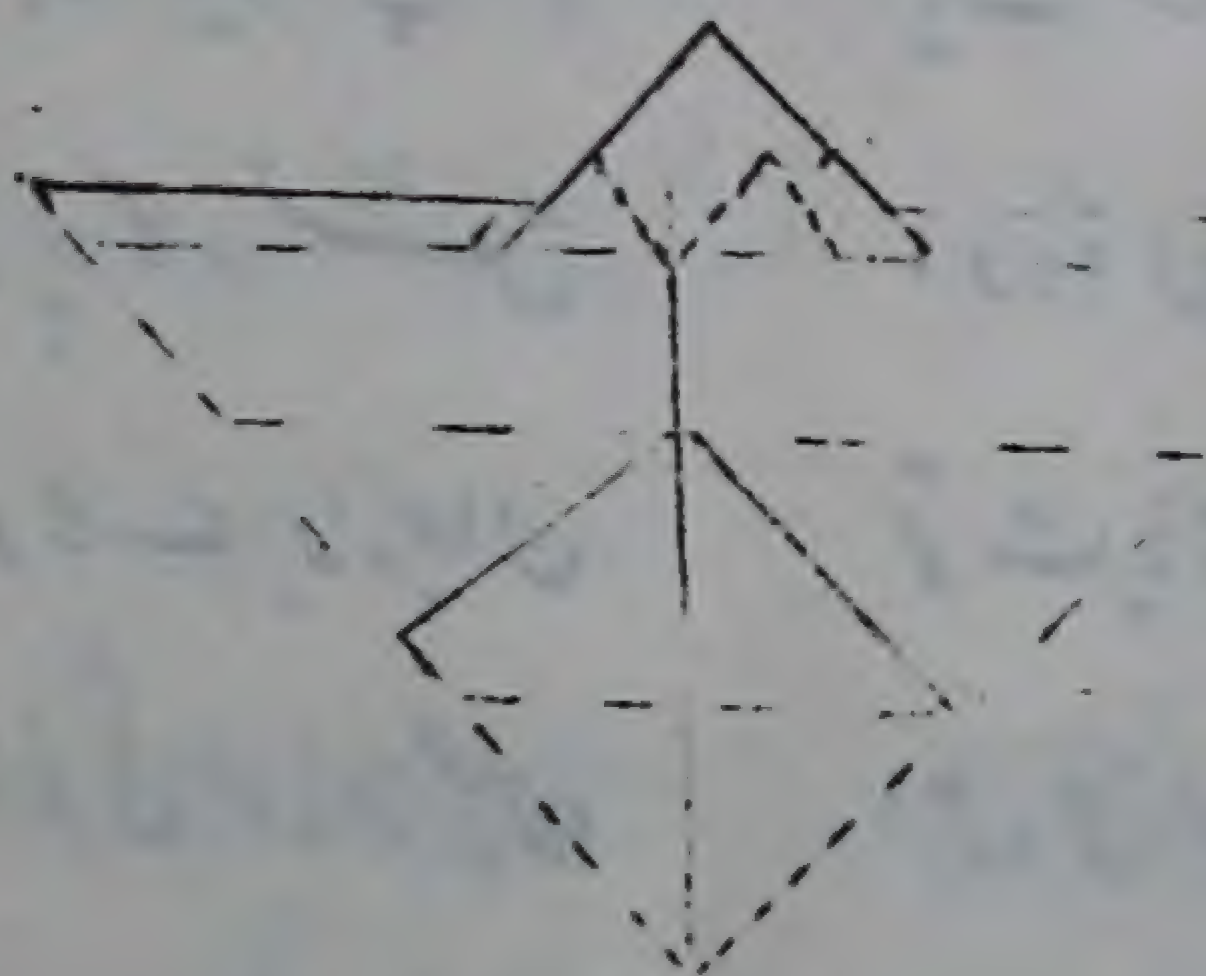
فنون لطیفہ

قومی زندگی کے مظاہر مین فنون لطیفہ کو خاص طور پر اہمیت حاصل ہے، اس لیے ہر شاعر، ہر ادیب، ہر معمار اور ہر مصور کا کمال صرف یہ ہے کہ وہ اپنے مخصوص فن کے ذریعہ سے اپنے زمانے کی قومی زندگی کے تمام خط و خال کو نمایان کرے، چنانچہ لیبان لکھتا ہے کہ

معمار، ادیب، شاعر غرض ہر وہ شخص جو صناع ہوتا ہے اپنے اندر ایک ساحرانہ طاقت رکھتا ہے، جس کے ذریعہ سے اپنی صناعیون کو اپنی قوم اور اپنے زمانہ کی روح کا حقیقی مظہر بنا دیتا ہے، اس بنا پر وہ اس جاعت کے خیالات کا آئینہ ہوتا ہے جس مین وہ زندگی بسر کرتا ہے، اسکی صناعیون کے ذریعہ سے اس کے قومی تمدن کے متعلق نہایت سچی شہادت حاصل کی جا سکتی ہے، وہ جو کچھ دیکھتا ہے طوطے کی طرح اس کی نقل کر دیتا ہے، اس لیے وہ جو کچھ زبان حال سے کہتا ہے اس مین غلطی کا احتمال نہین ہوتا، اس پر گرد و پیش کے محسوسات کا شدت سے اثر پڑتا ہے اس لیے وہ تمدنی احساسات، تمدنی خیالات، تمدنی ضروریات اور تمدنی میلانات کی تعبیر مین جادۂ اعتدال سے ذرہ برابر بھی نہین ہٹتا، فنون لطیفہ کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کی مخصوص کیفیت کو پیش نظر کر دے، اور ہم کو خود تصویرون کے اندر مصور کے اصلی محسوسات اور حقیقی مشاہدات کی تصویر نظر آجائے، لیکن اگر صرف ایسی تصویرین بنائی جائین جو ان عقائد و خیالات کی ترجمانی کرین جنکا ہم خود اعتقاد نہین رکھتے تو یہ حقیقی فن نہین بلکہ

نقالی اور تقلید ہے، ہمارے زمانے مین من حیث الفن صرف ان چیزون کی تصویرون کو اعلی تصویر کہہ سکتے ہین جو ہمارے گرد و پیش موجود ہین، ہمارے زمانے کا اصلی فن تعمیر وہ ہے جو ہمارے سامنے پنج منزلہ عمارتون، پانی کی نہرون، بڑے بڑے پلون اور ریلوے لائنون کا ڈھانچہ کھڑا کر دیتا ہے۔

اس نظریہ کے مطابق "فن برائے فن" کوئی چیز نہین، اصلی چیز "فن برائے زندگی" ہے، اور ڈاکٹر صاحب نے فنون لطیفہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اسی نظریہ کی تشریح ہے، ان کے نزدیک زندگی صرف خودی کا نام ہے اور وہ تمام فنون لطیفہ مین اسی زندگی کی تلاش کرتے ہین،

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر — گہر ہین ان کی گرہ مین تمام یکدانہ
ضمیر بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی — بلند تر ہے ستارون سے انکا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کرین تو عین حیات — نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیر فلک امتون کی رسوائی — خودی سے جب ادب و دین ہوئے ہین بیگانہ

تری خودی سے ہے روشن ترا حریم وجود — حیات کیا ہے؟ اسی کا سرور و سوز و ثبات
بلند تر مہ و پروین سے ہے اسی کا مقام — اسی کے نور سے پیدا ہین تیرے ذات و صفات
حریم تیرا خودی غیر کی معاذ اللہ — دوبارہ زندہ نہ کر کاروبار لات و منات۔
یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے — رہا نہ تو تو نہ سوز خودی نہ ساز حیات

گر ہنر مین نہین تعمیر خودی کا جوہر — وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود

لیکن مشرقی فنون لطیفہ کے جو بہترین نمونے ان کو نظر آئے ان مین خودی کا نام و نشان تک موجود نہین تھا،

ہے فروس نظر اہل ہنر کی تعمیر — فاش ہے چشم تماشا پہ نہان خانۂ ذات
نہ خودی ہے، نہ جہان سحر و شام کے دور — زندگانی کی حریفانہ کشاکش سے نجات

بلکہ ہمارے مصور جو تصویریں بناتے ہیں ان میں ہر جگہ خودی کی موت ہی موت نظر آتی ہے،

ہیچ‌ نان دیدم فن صورت گری | نے براہیمی در و نے آذری
راہبے در حلقہ دام ہوس | دلبرے با طائرے اندر قفس
خسروے پیش فقیرے خرقہ پوش | مرد کوہستانیٔ ہیزم بدوش
نازنینے در رہ بت خانۂ | جوگیٔ در خلوت ویرانۂ
پیرکے از دور پیری داغ داغ | آنکہ اندر دست او گل شد چراغ
مطربے از نغمۂ بیگانہ مست | بلبلے نالید و تار او گسست
نوجوانے از نگاہ خوردہ تیر | کودکے بر گردن باباے پیر
مے چکد از خامہا مضمون موت | ہر کجا افسانہ و افسون موت

اس قسم کی تصویریں قدیم زمانے کی درویشانہ، راہبانہ، عیاشانہ اور عاشقانہ زندگی کا منظر دکھاتی ہیں، لیکن دور جدید میں مشرقی مصور یورپ کی تقلید میں قدرتی مناظر مثلاً پہاڑ، دریا، صحرا اور جنگل وغیرہ کی تصویریں کھینچتے ہیں جو عام طور پر بہت پسند کی جاتی ہیں، اور یہی عام مقبولیت ان کو اس قسم کی تصویروں کے بنانے پر آمادہ کرتی ہے، لیکن اس قسم کی تصویروں سے بھی خودی نمایاں نہیں ہوتی۔

از خودی دور است و رنجور است و بس | رہبر او ذوق جمہور است و بس
حسن را دریوزہ از فطرت کند | رہزن در راہ تہی دستے زند
حسن را از خود برون جستن خطاست | آنچہ مے بایست پیش ما کجاست
نقشگر خود را چو با فطرت سپرد | نقش او انگند و نقش خود سترد

قدیم وضع کی مشرقی تصویروں میں تو مشرق کی روحانیت نظر بھی آتی تھی لیکن ان تصویروں نے اس کو بھی کھو دیا ہے۔

کس درجہ یہان عام ہوئی مرگِ تخیل — ہندی بھی فرنگی کا مقلد عجمی بھی
مجھکو تو یہی غم ہے کہ اس دَور کے بہزاد — کھو بیٹھے ہین مشرق کا سرورِ ازلی بھی
معلوم ہین اے مردِ ہنر تیرے کمالات — صنعت تجھے آتی ہے پرانی بھی نئی بھی
فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے — آئینۂ فطرت مین دکھا اپنی خودی بھی

فنونِ لطیفہ مین سب سے زیادہ موثر چیز موسیقی ہے لیکن مشرقی موسیقی جوش وطرب کے بجائے صرف رنج وغم کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے، اس لیے وہ زندگی کے بجائے موت کا پیغام ہے،

نغمۂ او خالی از نارِ حیات — ہمچو سیل او فتد بر دیوارِ حیات
از نئے او آشکارا رازِ او — مرگ یک شہر است اندر سازِ او
ناتوان و زار مے سازد ترا — از جہان بیزار مے سازد ترا
الحذر این نغمۂ موت است و بس — نیستی در کسوتِ صوت است و بس

غرض ہنروران ہند کے تمام فنون لطیفہ پر یہی مردنی چھائی ہوئی ہے،

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا — ان کے اندیشۂ تاریک مین قومون کا مزار
موت کی نقشگری ان کے صنم خانون مین — زندگی سے ہنر ان برہمنون کا بیزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہین مقاماتِ بلند — کرتے ہین روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس — آہ بیچارون کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

بالخصوص شاعری تو تمامتر حزن ویاس، افسردگی اور پژمردگی کا مرقع بنکر رہ گئی ہے، ہماری اردو شاعری بالکل فارسی شاعری کی نقل ہے، لیکن ہمارے شعراء نے فارسی شاعری کے دورِ تنزل کی نقالی کی ہے، جب وہ زندگی کے تمام مظاہر سے بیگانہ ہوکر صرف انفعالی جذبات کے اظہار کا ایک ذریعہ بن چکی تھی، ورنہ ابتدا مین فارسی شاعری بھی تمامتر قومی زندگی کا مظہر تھی اور اسی کی وجہ جیسا کہ

مولانا شبلی علیہ الرحمہ نے شعر العجم مین لکھا ہے یہ تھی کہ "ایران نے جس زمانے مین شاعری شروع کی قومی زندگی تمامتر فوجی زندگی تھی، سلاطین وقت شجاع اور بہادر ہوتے تھے. شاعری کے جو پایۂ تخت تھے، یعنی بخارا، غزنین، بلخ، سمرقند، خوارزم، یہان کی آب و ہوا سپہ گری، بہادری اور جانبازی کا اثر رکھتی تھی، اور یہان کے لوگ عموماً دیوپیکر، قوی، تنومند بلند بالا ہوتے تھے، ان تمام باتون کا شاعری پر یہ اثر پڑا کہ

(۱)، اصناف شاعری مین صرف دو قسمین پیدا ہوئین، یعنی قصیدہ اور مثنوی، اور مثنوی مین زیادہ تر رزمیہ واقعات بیان کیے جاتے تھے. غزل کی طرف لوگون نے توجہ نہین کی،

(۲)، قصائد مین بھی اکثر سلاطین کے ملکی فتوحات کا ذکر ہوتا تھا،

(۳)، ممدوح کے اوصاف مین شعراء سپاہیانہ ہنرون یعنی تیر افگنی، شمشیر بازی اور اسپ تازی کا ذکر بھی کرتے تھے،

(۴)، چونکہ اسباب سپہگری مین شکار بھی ہے، اس لیے ممدوح کی تعریف مین شکار کا ذکر اکثر کرتے تھے،

(۵)، عاشقانہ شاعری پر بھی یہی رنگ چڑھ گیا، معشوق کے اوصاف اور سراپا کی تشبیہات اور استعارات مین تمامتر فوجی سامان ہے، یہان تک کہ حسن کا مرقع میدان جنگ نظر آتا ہے، زلفین کمند ہین، ابرو خنجر، پلکین تیر، آنکھین قاتل وغیرہ وغیرہ،

لیکن ساتوین صدی کے آغاز مین تاتار کے قتل عام مین جو بے شمار جانین ضائع ہوئین، اس نے مسلمانون کے شجاعانہ جذبات کو بالکل فنا کر دیا،

(۱)، اس کا شاعری پر یہ اثر ہوا کہ رزمیہ نظمین ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گئین، شاعری کے فرائض پورا کرنے کے لیے متعدد رزمیہ مثنویان بے شبہہ لکھی گئین، لیکن قوم اس قدر افسردہ

ہوگئی تھی کہ ان مثنویون کے دو شعر بھی زبانون پر نہ رہ سکے،

(۲)، قصائد مین ممدوح کی معرکہ آرائی، لشکر کشی، سپہ سالاری، قلعہ کشائی، تیغ بازی، قدر اندازی کا جو ذکر کرتے تھے متروک ہوگیا،

(۳)، جنگی جذبات کے فنا ہونے سے طبیعتون مین انفعالی اثر زیادہ پیدا ہوا، اس لیے صوفیانہ اور عاشقانہ شاعری کو بہت زیادہ ترقی ہوئی،

(۴)، چونکہ تاتار اور تیمور کی عام سفاکی نے قومون کی قومین غارت کردی تھین اس لیے دنیا کی بے ثباتی اور انقلابات کا نقشہ مدت تک آنکھون کے سامنے پھرتا رہا، اس بنا پر دنیا کی بے ثباتی کے مضامین زیادہ تر اشعار مین آنے لگے، شیخ سعدی، ابن یمین اور خواجہ حافظ کے یہان ان مضامین کی بہتات اسی بنا پر ہے"

مسلمانون کے دور تنزل کی یہی فارسی شاعری ہے جس کی اردو شاعری نے تقلید کی ہے، اور اسی زمانہ کے بعد "فن برائے زندگی" یا محدود الفاظ مین "ادب برائے زندگی" کا نظریہ بدل کر "فن برائے فن" یا محدود الفاظ مین ادب برائے ادب" کا نظریہ قائم ہوا، اگرچہ اس نظریہ کے قائم ہوجانے کے بعد شعر و ادب مین نہایت لطافت و نزاکت پیدا ہوگئی، اور ڈاکٹر صاحب بھی فنی حیثیت سے اس کے منکر نہین ہین، تاہم ایسی لطیف و نازک چیز زندگی کی کشمکش کا مقابلہ نہین کرسکتی،

از نزاکت ہاے طبع موشگاف او مپرس	گر ز وم باد ے زجاج شاعر ما بشکند
کے تواند گفت شرح کار زار زندگی	مے پر از رنگش حباب چون بدریا بشکند

اس قسم کا لطیف اور نازک ادب یا فن لطف و تفریح کی چیز تو ہے لیکن اس سے زندگی کی کشمکش کا مقابلہ نہین کیا جا سکتا، بلکہ اس سے چستی کے بجائے سستی اور زندہ دلی کے بجائے مردہ دلی اور شگفتگی کے بجائے افسردگی پیدا ہوتی ہے،

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن | جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے | یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا | اے قطرۂ نیسان وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو | جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں | جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

بالخصوص اس جد و جہد کے زمانے میں جب ہر قوم دوسری قوم سے آگے بڑھنا بلکہ اس کو کچلنا چاہتی ہے، اس قسم کی نرم و نازک شاعری کسی طرح موزوں نہیں،

ہے شعرِ عجم گرچہ طربناک و دلآویز | اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستان | بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز
وہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہو تو کیا ہے | جس سے متزلزل نہ ہوئی دولتِ پرویز
اقبال یہ ہے خارہ تراشی کا زمانہ | از ہرچہ بآئینہ نمایند بہ پرہیز

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاجِ نفس نے | شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے

تاثیرِ غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم | اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو | شمشیر کے مانند ہو تیزی میں تری مے
ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے | بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کے
ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی | اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اس بنا پر ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ایسی شاعری کی داغ بیل ڈالنی چاہیے جس کی بنیاد یا تو حکمت، فلسفہ اور اخلاق پر قائم ہو، یا وہ پرجوش، ولولہ انگیز اور ہنگامہ خیز ہو، پہلی قسم کی شاعری کو وہ نغمۂ جبریل اور دوسری قسم کی شاعری کو بانگِ اسرافیل کہتے ہیں،

مین شعر کے اسرار سے محرم نہین لیکن — یہ نکتہ ہے تاریخِ امم جس کی ہے تفصیل

وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے — یا نغمۂ جبرئیل ہے یا بانگِ سرافیل

لیکن اپنی طبعی افتاد یا موجودہ زمانے کے حالات کے لحاظ سے وہ زیادہ تر اسی دوسرے قسم کے فن و ادب کی طرف مائل ہین،

وہ نغمہ سردیٔ خونِ غزل سرا کی دلیل — کہ جس کو سن کے ترا چہرہ تابناک نہین

کھل تو جاتا ہے مغنی کے بم و زیر سے دل — نہ رہا زندہ و پایندہ تو کیا دل کی کشود

ہے ابھی سینۂ افلاک مین پنہان وہ نوا — جس کی گرمی سے پگھل جائے ستارون کا وجود

جس کی تاثیر سے آدم ہو غم و خوف سے پاک — اور پیدا ہو ایازی سے مقامِ محمود

مہ و انجم کا یہ حیرت کدہ باقی نہ رہے — تو رہے اور ترا زمزمۂ لاموجود

جس کو مشروع سمجھتے ہین فقیہانِ خودی — منتظر ہے کسی مطرب کا ابھی تک وہ سرود

مرے لیے ہے فقط زورِ حیدری کافی — ترے نصیب فلاطون کی تیزیٔ ادراک

مری نظر مین یہی ہے جمال و زیبائی — کہ سر بسجدہ ہین قوت کے سامنے افلاک

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر — ترا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک

مجھے سزا کے لیے بھی نہین قبول وہ آگ — کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

اس لیے ان کو فنونِ لطیفہ کے وہی مناظر پسند آتے ہین جو حسن و جمال کے ساتھ جاہ و جلال کی بھی نمایش کرتے ہین،

یک زمان با رفتگان صحبت گزین — صنعت آزاد مردان ہم ببین

خیز و کار ایبک و سوری نگر — وانما چشمے اگر داری جگر

خویش را از خود برون آوردہ اند — این چنین خود را تماشا کردہ اند

سنگہا با سنگہا پیوستہ اند ‏ روزگارے را بآنے بستہ اند
دیدن او پختہ تر سازد ترا ‏ در جہانِ دیگر اندازد ترا
نقش سوئے نقشگر می آورد ‏ از ضمیر او خبر می آورد
ہمتِ مردانہ و طبع بلند ‏ در دلِ سنگ این دو لعلِ ارجمند

اور اس قسم کے فنون لطیفہ جن سے انسان کی خودی کی نمایش ہو اسی وقت پیدا ہو سکتے ہین، جب خود انسان کے اندر ایک جوش، ایک جذبہ اور ایک ولولہ موجود ہو،

آیا کہان سے نالۂ نے مین سرورِ مے ‏ اصل اسکی نے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نے
دل کیا ہے اسکی مستی و قوت کہان سے ہے ‏ کیون اسکی اک نگاہ الٹتی ہے تختِ کے
کیون اسکی زندگی سے ہے اقوام مین حیات ‏ کیون اسکے واردات بدلتے ہین پے بہ پے
کیا بات ہے کہ صاحبِ دل کی نگاہ مین ‏ جچتی نہین ہے سلطنتِ روم و شام و رے
جس روز دل کی رمز مغنی سمجھ گیا ‏ سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہین طے

قدرتی مناظر مثلاً پہاڑ، دریا اور صحرا کتنے ہی عظیم الشان ہون لیکن ان کی تصویرین انسان کی خودی کو نمایان نہین کرتین، بلکہ یہ فطرت کی غلامی ہے، اور فنون لطیفہ کو فطرت کی غلامی سے آزاد ہونا چاہیے

فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو ‏ صیاد ہین مردانِ ہنر مند کہ نخچیر

فنون لطیفہ مین جدت ہونی چاہیے، اور دوسرون کے افکار و خیالات کی تقلید سے یہ جدت پیدا نہین ہو سکتی، بلکہ ہر چیز کو اپنے نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیے،

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے ‏ افلاک منور ہون ترے نورِ سحر سے
خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے ‏ ظاہر تری تقدیر ہو سیماے سحر سے
دریا متلاطم ہو ترے موجِ گہر سے ‏ شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہنر سے

اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی　　　　کیا تجھکو نہین اپنی خودی تک بھی رسائی

اس لیے موجودہ دور مین اس حیثیت سے شاعری مین سخت انقلاب کی ضرورت ہی،
مولانا شبلی نے شعر العجم کی چوتھی جلد مین لکھا ہے کہ "عرب مین قوم کی باگ شعرا کے ہاتھ
مین تھی، وہ قوم کو جدھر چاہتے تھے جھونک دیتے تھے، اور جدھر سے چاہتے تھے روک لیتے تھے،
افسوس ہے کہ ایران نے کبھی یہ خواب نہین دیکھا، یہان کے شعرا ابتدا سے غلامی مین پلے
اور ہمیشہ غلام رہے، وہ اپنے لیے نہین بلکہ دوسرون کے لیے پیدا ہوئے تھے"
یہی ایرانی شاعری ہے جس کی تقلید دور تنزل مین ہندوستان کے شعرا نے کی ہے
اس لیے اردو شاعری مین انقلاب پیدا کرنے کے لیے سب سے مقدم چیز یہ ہے کہ ایرانی
شاعری کی تقلید سے احتراز کیا جائے،

تاثیر غلامی سے خودی جسکی ہوئی نرم　　　　اچھی نہین اس قوم کے حق مین عجمی لے

اور موجودہ دور ترقی مین شاعری کو قومی ترقی کا ذریعہ بنایا جائے، اردو شاعری کا یہی
انقلابی دور ہے جس کی ابتدا مولانا حالی نے کی اور ڈاکٹر صاحب نے اس کو معراج کمال تک پہنچایا
اور اس نے ان کی اس انقلاب انگیز شاعری مین جو خصوصیتین پیدا کر دین، ان کو انھون نے خود
جا بجا بیان کیا ہے،

(۱)، "ادب برائے ادب" اور "شعر برائے شعر" ان کا مقصد نہین، بلکہ مقصد دوسرا ہے،
اور ان کی شاعری اسی مقصد کی تکمیل کا ذریعہ ہے،

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست　　　　سوے قطار مے کشم ناقۂ بے زمام را

با من رازے کہ گفتم پے نبردند　　　　ز شاخ نخل من خرما نخوردند

من اے میر امم داد از تو خواہم　　　　مرا یاران غزلخوانے شمردند

نہ شعر است اینکہ برو‌ئے دل نہادم   گرہ از رشتہ، معنی کشادم
بامیدے کہ اکسیرے زند عشق   مسِ این مفلسان را تاب دادم

(۲) "ادب برائے ادب" کے نظریہ نے شعرو شاعری کی زیبایش و آرایش کے لیے جو لفظی اور معنوی صنعتین پیدا کر دی تھین ان سے ان کا کلام بالکل خالی ہے،

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو   کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنابندی

اگر معنی مین حسن ہے تو ان لفظی صنائع و بدائع کی ضرورت نہین، وہ خود اپنے لیے موزون قالب اختیار کرلے گا، جس طرح فطرت خود لالے کے ہاتھ مین منہدی لگاتی ہے،

(۳) "ادب برائے ادب" دوسرون کی لطف و تفریح کا ذریعہ ہوتا ہے، اس لیے شاعر جو کچھ کہتا ہے دوسرون کے ذوق کے مطابق کہتا ہے، خود اسکا کوئی ذوق نہین ہوتا،

اگر شہ روز را گوید شب است این   بباید گفت اینک ماہ و پروین

ایرانی شعرا اپنے لیے نہین بلکہ دوسرون کے لیے پیدا ہوئے تھے، اس لیے وہ شعر دوسرون کے ذوق کے مطابق کہتے تھے، اردو شعرا نے بھی انہی کی تقلید کی، اس لیے اردو شاعری امرا و سلاطین اور رندان شیوہ کار کی تفریح کا ذریعہ بن گئی، اور شعرا انہی لوگون کے ذوق کے مطابق شعر کہنے لگے، لیکن ڈاکٹر صاحب پہلے شخص ہین جنھون نے ذوق عام کی کچھ پروا نہین کی،

نم و رنگ از دم باد سحر نیم   ز فیض آفتاب تو بروییم
نگاہم از مہ و پروین بلند است   سخن را بر مزاج کس نگوییم

بلکہ ان کا خود ایک ذوق تھا اور اسی ذوق کے مطابق وہ شعر کہتے تھے،

(۴) ان قیود سے آزادی حاصل کر لینے کے بعد ان کی شاعری مین ایک سازندانہ اور قلندرانہ شان پیدا ہو گئی، ممکن ہے کہ "ادب برائے ادب" کے نظریہ کے مطابق اس مین شاعرانہ آب و رنگ

بہت زیادہ نہ ہو تاہم اس قلندرانہ اور آزادانہ شان نے ان کے کلام کو مقبول عام بنا دیا،

خوش آ گئی ہے جہان کو قلندری میری ۔۔۔۔ دگر نہ شعر مرا کیا ہے؟ شاعری کیا ہے؟

غرض ڈاکٹر صاحب نے فن برائے زندگی، یا محدود طریقہ پر ادب برائے زندگی کا جو نظریہ قائم کیا تھا، دور جدید کے شعرا اسی کی تقلید کر رہے ہین، لیکن باین ہمہ ڈاکٹر صاحب کی شاعری اور دور جدید کے شعرا کی شاعری مین زمین و آسمان کا فرق ہے، ڈاکٹر صاحب نے زندگی کے اہم مسائل مثلاً تعلیم، سیاست، مذہب، قومیت اور معاشرت کو لیا تھا، اور انہی کی تجدید و اصلاح کر کے قوم مین زندگی کی روح پیدا کرنا چاہتے تھے، لیکن دور جدید کے شعرا نے نہایت مبتذل چیزون کو اپنی شاعری کا موضوع بنا لیا، اور ہر وہ چیز جو راہ مین نظر آ جائے ان کے نزدیک زندگی کا مظہر بن گئی، اس لیے ان کی شاعری نہ نغمہ جبرئیل بن سکی نہ بانگ سرافیل بلکہ ایک بازاری چیز ہو کر رہ گئی،

ڈاکٹر صاحب نے صرف شاعرانہ خیالات مین تغیر پیدا کرنا چاہا تھا، شعر کی ظاہری شکل و صورت مین کسی قسم کی تبدیلی نہین کرنا چاہتے تھے، ان کے نزدیک قافیہ تو شعر کے لیے ضروری ہے اور ردیف کی پابندی بھی حسن سے خالی نہین، لیکن دور جدید کے شعرا نے ردیف و قافیہ سب کو اڑا دیا، اور نظم و نثر مین کوئی فرق باقی نہ رہا، اسی کا نام ترقی پسند ادب ہے، لیکن درحقیقت یہ ادب کی ترقی نہین بلکہ اس کا تنزل ہے، بہرحال ڈاکٹر صاحب کی شاعری جس طرح قدیم دور سے ممتاز ہے اسی طرح جدید دور سے بھی بالکل الگ ہے، اُس مین زندگی کے مسائل و خیالات اس کثرت سے پائے جاتے ہین کہ ان کا استقصار نہین کیا جا سکتا ہم نے صرف چند اہم مسائل لے لیے ہین، ورنہ ان کے کلام سے بے شمار عنوانات قائم ہو سکتے ہین، اور لوگون نے اس قسم کے عنوانات پر بکثرت مضامین لکھے ہین، جنکو ہم بخوف طوالت نظر انداز کرتے ہین، البتہ ڈاکٹر صاحب کی شاعری کے ایک اہم موضوع کو جس پر کسی کی نگاہ نہین پڑی ہے، نظر انداز نہین کر سکتے، اور وہ یہ ہے:

نظامِ اخلاق

ڈاکٹر صاحب کا نظام اخلاق کیا ہے؟ اور وہ کس فلسفۂ اخلاق کے متبع ہین؟ ان کی شاعری کا جس قدر اہم موضوع ہے اسی قدر مبہم اور غیر نمایان بھی ہے، کیونکہ انھون نے صرف جستہ جستہ اشعار مین ضمنی طور پر اس کی طرف اشارے کیے ہین، اس لیے اس موضوع پر کسی نے کچھ نہین لکھا ہے، اور اگر کسی نے کچھ لکھا بھی ہے تو اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ وہ نہایت سخت قسم کے وحشیانہ اخلاق اور جنگجویانہ جبر و اقتدار کی تعلیم دیتے ہین، چنانچہ ایک مضمون نگار نے اس خیال کو نہایت عامیانہ اور بھونڈے الفاظ مین اس طرح ظاہر کیا ہے کہ

صوفی کہتے ہین کہ چیونٹی بنو تاکہ لوگ تمھین پانون کے نیچے روندکر زندان ہست و بود سے نجات دلائین، بھڑ نہ بنو کیونکہ اگر بھڑ بنو گے تو خواہ مخواہ کسی کو ڈنک مارو گے، وہ بیچارہ درد سے چیخنے چلانے لگے گا اور ممکن ہے کہ اس کی بددعا سے تم بلکہ بھڑون کی تمام قوم قہر الٰہی کی مستوجب بن جائے، بھیڑ بنو تاکہ لوگ تمھارے بالون سے گرم کپڑے بناکر موسم سرما کی شدت سے اپنے تن بدن کو محفوظ کرسکین، اور تمھارے گوشت سے اپنا پیٹ بھر سکین، بھیڑیا نہ بنو، کیونکہ اگر بھیڑیا بنو گے تو ناچار روزانہ کئی جانورون کو ہلاک کرو گے اور ان کی بددعائین لوگے، مچھلی بنو تاکہ آدمی تمھین پکڑ پکڑ کر کھائین، اپنا اور اپنے بچون کا پیٹ پالین، نہنگ نہ بنو ورنہ انسانون اور مچھلیون کی ہلاکت کا باعث ہوگے، اور یہ فعل نہایت قبیح ہے وغیرہ وغیرہ

لیکن علامہ اقبال کہتے ہین کہ

چیونٹی نہ بنو ورنہ لوگ تمھین پانون کے نیچے کچل کر مار ڈالین گے، بھڑ بنو اور جو کوئی سامنے آئے اسے ڈنک مارو، بھیڑ نہ بنو ورنہ لوگ تمھین مار کر کھا جائین گے، بھیڑیا بنو تاکہ جو کوئی ملے اسے ہڑپ کر جاؤ اور آدمی ملے تو اسے چٹ کر جاؤ، شبنم کا قطرہ نہ بنو، شیر یا چیتا بنو، سانپ بنو، اژدہا بنو، عقاب بنو، شہباز بنو، الغرض اگر جاودی زندگی پسند ہو تو پتھر بنو تاکہ کسی کا سر توڑ سکو، حیوانی جامہ مین رہنا چاہو تو کسی قسم کا کوئی درندہ بن جاؤ تاکہ باقی جانورون کو چیر پھاڑ سکو، سست عناصر صوفیون کی باتین نہ سنو وہ اپنی جان کے بھی دشمن ہین اور تمھاری جان کے بھی،

اس غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اکثر اشعار مین جنگ کی ترغیب دی ہے، اور قوت کو کامیابی کا ذریعہ قرار دیا ہے، مثلاً

ع زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ ستیز

ع بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

ع حیات جاودان اندر ستیز است

ع بے زور سیل کشتی آدم نمے رود

ع گہے باشد کہ کار ناخدائی میکند طوفان

اس قسم کے اور بھی بہ کثرت اشعار ان کے کلام مین موجود ہین، اور ان سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ صرف جنگی اور فوجی اخلاق کی تعلیم دیتے ہین جن مین لازمی طور پر جبر و تشدد پایا جاتا ہے، لیکن یہ خیال غلط اور بالکل غلط ہے، کیونکہ اولاً تو وہ جنگ کا لفظ ایک نہایت عام اور وسیع معنی مین استعمال کرتے ہین، مثلاً مختلف عقائد و خیالات کی جنگ، مختلف قومون کے تہذیب و تمدن کی جنگ، مختلف رسم و رواج کی جنگ، قدیم و جدید طریقہ تعلیم کی جنگ، غرض دنیا کے تمام تغیرات

---

[1] نیرنگ خیال اقبال نمبر ص ۲۴۴، ۲۴۵

وانقلابات اُن کے نزدیک ایک مسلسل جنگ کی صورت رکھتے ہین اور اگر مسئلہ ارتقا صحیح ہے تو دنیا کی ہر طاقتور چیز اپنے سے کمزور چیز کو فنا کرنا چاہتی ہے، اس لیے وہ اسی فلسفیانہ یا قدرتی جنگ کے مقابلے کی ترغیب دیتے ہین، وحشیانہ جنگ کی تعلیم نہین دیتے، البتہ عام اصطلاحی معنی مین وہ دو قسم کی لڑائیون کو جائز سمجھتے ہین، ایک محافظانہ دوسری مصلحانہ، چنانچہ ایک خط مین ایک معترض کے جواب مین جس نے ان پر اس دور ترقی مین جنگ کی حمایت کا الزام لگایا تھا لکھتے ہین کہ

معترض کا یہ کہنا کہ اقبال اس دور ترقی مین جنگ کا حامی ہے، غلط ہے، مین جنگ کا حامی نہین ہون، نہ کوئی مسلمان شریعت کے حدود معینہ کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہو سکتا ہے، قرآن کی تعلیم کے رو سے جہاد یا جنگ کی صرف دو صورتین ہین محافظانہ اور مصلحانہ، پہلی صورت مین یعنی اس صورت مین جب کہ مسلمانون پر ظلم کیا جائے اور ان کو گھرون سے نکالا جائے مسلمانون کو تلوار اٹھانے کی اجازت ہے (نہ حکم)، اور دوسری صورت جس مین جہاد کا حکم ہے ۹: ۹ مین بیان ہوئی ہے، ان آیات کو غور سے پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ چیز جس کو سیمویل ہور جمعیت اقوام کے اجلاس مین (Collective Security) (یعنی اجتماعی سلامتی) کہتا ہے قرآن نے اس کا اصول کس سادگی اور فصاحت سے بیان کیا ہے، جنگ کی مذکورہ بالا دو صورتون کے سوا مین اور کسی جنگ کو نہین جانتا، جوع الارض کی تسکین کے لیے جنگ کرنا دین اسلام مین حرام ہے، علی ہذا القیاس دین کی اشاعت کے لیے تلوار اٹھانا بھی حرام ہے،[1]

لیکن یہ ایک ایسی مقدس جنگ ہے جس مین اگرچہ بعض موقعون پر تشدد بھی پایا جاتا ہے تاہم اس مین اور خوش خلقی اور نرم خوئی مین کوئی تضاد نہیں، سورہ فرقان مین خداوند تعالیٰ نے مسلمانون کے اخلاقی اوصاف یہ بتائے ہین،

---

[1] اقبال نامہ صفحہ ۲۰۳

وعباد الرحمن الذین یمشون	رحم کرنیوالے خدا کے نیک بندے ہین جو زمین پر نرم
علی الارض ھوناً و اذا خاطبھم	کے ساتھ چلتے ہین، اور جب اوچھے لوگ ان کو بدتمیزی
الجاھلون قالوا سلاما ؕ	کیساتھ مخاطب کرتے ہین تو کہتے ہین کہ خوش رہو،

اور کلبی اور ابو العتاہیہ کے بیان کے مطابق مسلمان اس قسم کے نرم اور خاکسارانہ اخلاق کے پابند صرف فرضیت جہاد سے پہلے تھے، لیکن جہاد کے فرض ہوجانے کے بعد یہ آیت منسوخ ہوگئی، لیکن امام رازی نے تفسیر کبیر مین لکھا ہے کہ اس آیت کے منسوخ ماننے کی کوئی ضرورت نہین، سفیہون سے چشم پوشی کرنا اور ان کا ترکی بہ ترکی جواب دینا عقلاً و شرعاً (ہر حالت مین) مستحسن ہے، اور اس سے عزت و آبرو اور ورع و پرہیزگاری کی حفاظت ہوتی ہے۔[1]

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اخلاقی فضائل کی متعدد قسمین ہین،

(۱) ایک ایجابی، مثلاً عزت نفس و خودداری، آزادی و صاف گوئی، عزم و استقلال، صبر و ثبات، سکون و وقار، جد و جہد، سعی و محنت، بہادری اور شجاعت وغیرہ،

(۲) دوسری سلبی، مثلاً زہد و تقشف، توکل و قناعت، تواضع و خاکساری، عفو و درگذر، حلم و بردباری، مسکینی و گمنامی وغیرہ وغیرہ،

ہمارے اکثر صوفیہ نے فضائل اخلاق کی ان دونون قسمون مین سے صرف سلبی اخلاق کو اختیار کیا تھا، چنانچہ ایک صوفی کا قول ہے کہ

جو شخص شرف کے اعلیٰ درجہ کو پہونچنا چاہتا ہے اس کو سات چیزون کے مقابلہ مین سات چیزون کو اختیار کرنا چاہیے (۱) یعنی احتیاج کو دولتمندی (۲) بھوک کو شکم سیری (۳) پستی کو بلندی (۴) ذلت کو عزت (۵) خاکساری کو غرور (۶) غم کو خوشی (۷) اور موت کو زندگی کے مقابلے مین

---

[1] تفسیر کبیر ج ۶ ص ۴۹۷

نٹشے نے مسیحی اخلاق پر جو اعتراضات کیے ہین وہ اسی دوسری قسم کے اخلاق سے تعلق رکھتے ہین، اور لیکی کے بیان کے مطابق اس قسم کے اخلاق تمدنی ترقی کا ساتھ نہین دے سکتے۔

(۳) تیسری انفرادی مثلاً تجرد اور عزلت گزینی وغیرہ۔

(۴) چوتھے اجتماعی مثلاً دیانت و امانت، مہمان نوازی، حاجت برآری اور حسن معاشرت وغیرہ، ان دونون قسمون مین سے بھی اکثر صوفیہ نے زیادہ تر انفرادی اخلاق اختیار کیے، اور اجتماعی اخلاق مین بیشتر ان اخلاق کو انتخاب کیا جن کی بنیاد ضعف پر قائم ہے۔ مثلاً رحم و احسان ایک اجتماعی وصف ہے، اور ان سے بڑے بڑے اجتماعی کام لیے جاسکتے ہین، مثلاً

۱- غلامون کی آزادی مین حصہ لینا اور اس کے لیے جد و جہد کرنا،

۲- شفاخانے اور محتاج خانے کھولنا،

۳- مریضون کی خدمت و تیمارداری اور مردون کی تجہیز و تکفین کرنا،

۴- قتل و خونریزی اور لوٹ مار سے ملک کی حفاظت کرنا۔

۵- زمانۂ جنگ مین بادشاہون کے درمیان مصالحت کرداکے ملک کو جنگ کے نقصانات سے بچانا،

۶- حکام کو ظلم و تشدد سے روکنا،

۷- مجرمون کو رہا کرانا،

۸- یتیمون اور بیواؤن کی مدد کرنا۔

۹- رفاہ عام کے چھوٹے چھوٹے کام کرنا، مثلاً بھولے ہوون کو راستہ دکھانا۔

۱۰- غلط کار آدمیون کو کام کرنے کا صحیح طریقہ بتانا، بےروزگارون کو روزی سے لگانا، بلاکرا کشتی چلانا، یا سبیل لگانا وغیرہ وغیرہ،

اور بہت سے پادریون اور راہبون نے جیسا کہ تاریخ اخلاق یورپ مین بتفصیل مذکور ہے،
یہ تمام اجتماعی خدمتین انجام دی ہین، لیکن ہمارے صوفیہ کی رحم و ہمدردی مین اس قسم کے اجتماعی فوائد
کی جھلک بہت کم نظر آتی ہے، کیونکہ جب کسی مذہب مین رہبانیت کا عنصر زیادہ شامل ہو جاتا ہے
تو اس کے پیرؤون سے اس قسم کے اخلاقی فضائل سلب ہو جاتے ہین، عیسائی پادریون نے بھی
اسی وقت یہ تمام خدمتین انجام دی تھین جب ان پر رہبانیت کا بہت زیادہ غلبہ نہین ہوا تھا،
لیکن ہمارے صوفیون کے لطف و احسان کی صورت زیادہ تر یہ تھی کہ وہ جانورون کو آزار دینے
اور ذبح کرنے سے اجتناب کرتے تھے، یہان تک کہ موذی جانورون کو بھی نہین ستاتے تھے،
چنانچہ ملا عبد الرحمن جامی نے نفحات الانس مین اس قسم کے متعدد واقعات نقل کیے ہین،
حدیثون مین بھی اگرچہ جانورون پر رحم کرنے کا حکم موجود ہے، لیکن موذی جانور اس سے
مستثنیٰ ہین، اور جانورون کے ذبح کرنے کی کوئی ممانعت نہین، بہرحال ہمارے صوفیہ کا اخلاقی
نظام زیادہ تر سلبی اور انفرادی اخلاق پر مشتمل ہے، اور امام غزالی نے احیاء العلوم مین انہی اخلاقی
فضائل کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، لیکن اسلام کے نظام اخلاق مین ان تمام قسمون کی گنجایش
ہے اور اس نے اپنی جامعیت کی بنا پر ایجابی، سلبی، انفرادی اور اجتماعی ہر قسم کے اخلاق کی تعلیم
دی ہے، البتہ ان مین جو ظاہری تضاد نظر آتا ہے اس کو اس طرح رفع کر دیا ہے، کہ سب کے مواقع
الگ الگ کر دیے ہین، مثلاً عام معاشرتی زندگی مین تواضع و خاکساری کی تعلیم اس طرح دی ہے،

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا	اور زمین پر اترا کر نہ چل (کیونکہ) خدا کسی اترانے
إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورًا	والے شیخی خورے کو پسند نہین کرتا،

لیکن جہان خاکسارانہ روش اختیار کرنے سے انسان کا ضعف ظاہر ہوتا ہے وہان اسلام
نے قوت کے اظہار کا حکم دیا ہے، چنانچہ جب صحابہ کرام عمرۃ القضا کے لیے مکہ مین آئے تو چونکہ

مدینہ کے وبائی بخار نے ان کو سخت کمزور کر دیا تھا، اس لیے کفار نے طنزاً کہا کہ "محمد اور ان کے اصحاب ضعف کی وجہ سے خانہ کعبہ کا طواف بھی نہیں کر سکتے۔" اس پر آپ نے صحابۂ کرام کو حکم دیا کہ طواف کا تین چکر اکڑ کر کریں تاکہ مشرکوں پر ان کی طاقت کا اظہار ہو، اور یہ سنت آج تک باقی ہے جس کو رمل کہتے ہین اور جس کے معنی اکڑ کر چلنے کے ہین،

قوت کے اظہار کا اصلی موقع جہاد مین پیش آتا ہے، اور اس موقع پر اسلام نے خاکساری کے بجائے کبر و غرور کو پسند کیا ہے، چنانچہ حدیث مین ہے کہ بعض غرور کو خدا ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے جنگ وصدقہ کے موقع پر اترانا خدا کو پسند ہے، اور ظلم وفخر پر اترانا ناپسند۔[1]

حضرت ابو دجانہؓ جو ایک بہادر صحابی تھے، غزوۂ احد مین شریک ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تلوار کو ہاتھ مین لے کر فرمایا کہ "اس تلوار کو لیکر اس کا حق کون ادا کرے گا؟" بہت سے صحابہ آپ کی طرف بڑھے لیکن آپ نے وہ تلوار کسی کو نہین دی، یہان تک کہ حضرت ابو دجانہؓ اٹھے اور کہا کہ "اس کا حق کیا ہے؟" ارشاد ہوا "یہ کہ دشمن پر اس کو اس قدر چلاؤ کہ ٹیڑھی ہو جائے" بعض روایتون مین ہے کہ "مسلمان پر اس کو نہ چلانا، اور کافر سے نہ بھاگنا"۔ انھون نے کہا کہ مین اس کا حق ادا کرون گا" اب آپ نے ان کو وہ تلوار عنایت فرمائی، اور وہ نشۂ مسرت مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے تلوار لے کر اکڑتے اور تنتے ہوئے چلے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مغرورانہ چال کو دیکھکر فرمایا کہ "اس موقع کے سوا خدا ہر جگہ اس چال کو ناپسند کرتا ہے"۔[2]

اسی طرح اسلام نے اگرچہ عام طور پر اجتماعی اخلاق کی تعلیم دی ہے، چنانچہ حدیث شریف مین ہے کہ "جو مسلمان لوگون سے میل جول پیدا کرتا ہے اور ان کی پہنچائی ہوئی تکلیفون کو برداشت کر لیتا ہے وہ اُس مسلمان سے بہتر ہے جو لوگون سے میل جول نہین پیدا کرتا اور ان کی پہنچائی

[1] ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی الخیلاء فی الحرب۔ [2] اسد الغابہ و اصابہ تذکرہ حضرت ابو دجانہؓ

ہوئی تکلیفوں کو نہیں سہتا،[1] لیکن بعض حالتوں مین انفرادی اخلاق کی تعلیم بھی دی ہے، مثلاً

خیر مال المسلم غنم یتبع بھا	مسلمان کا بہترین مال وہ بکریاں ہین جن کو وہ
شعف الجبال ومواقع القطر	پہاڑون کی چوٹیون اور شاداب مقامات میں چرا
یفر بدینہ من الفتن[2]	ہے اور اس طرح اپنے دین کو فتنوں سے محفوظ رکھنے کیلیے

اس قسم کی اور بھی متعدد حدیثین ہین لیکن محدثین نے تصریح کر دی ہے کہ اس قسم کی عزلت گزینی صرف اس حالت مین جائز ہے جب ملک گیری کی ہوس مین باہم خود مسلمانون مین خانہ جنگی ہو جائے اور ایک مسلمان اس کا فیصلہ نہ کر سکے کہ دونون مین کونسا فریق حق پر ہے، یا یہ کہ وہ اس فتنہ کے ازالہ کی طاقت نہ رکھتا ہو، ورنہ عام حالات مین مسلمانون سے میل جول رکھنا اخلاقی حیثیت سے افضل ہے لیکن بہر حال اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی وسعت ہر قسم کے ایجابی، سلبی، انفرادی اور اجتماعی اخلاق کو شامل ہے، اور ڈاکٹر صاحب نے اسی اسلامی نظامِ اخلاق کی تعلیم دی ہے، اور ان کے مختلف محل و مواقع متعین کر دیے ہین، مثلاً

قلندران کہ بہ تسخیرِ آب و گل کوشند | ز شاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بجلوت اند و کمندے بہ مہر و مہ پیچند | بخلوت اند و زمان و مکان در آغوشند
بروز بزم سراپا چو پرنیان و حریر | بروز رزم خود آگاہ و تن فراموش اند

زندگی انجمن آرا و نگہدار خود است | اے کہ در قافلۂ بے ہمہ شو با ہمہ رو
تو فروزندہ تر از مہر منیر آمدۂ | آنچنان زی کہ بہر ذرہ رسانی پرتو

مصافِ زندگی مین سیرتِ فولاد پیدا کر | شبستانِ محبت مین حریر و پرنیان ہو جا
گذر جا بنکے سیل تند رو کوہ و بیابان سے | گلستان راہ مین آئے تو جوئے نغمہ خوان ہو جا

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت | یہ چار عناصر ہون تو بنتا ہے مسلمان

[1] ترمذی کتاب الزہد ص ۳۱۲ [2] بخاری کتاب الایمان،

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اے پیر حرم رسم و رہ خانقہی چھوڑ مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اس بنا پر وہ اخلاقی حیثیت سے نٹشے کے مقلد ہیں، نہ صوفیوں کا اتباع کرتے ہیں، بلکہ وہ خالص اسلامی اور قرآنی اخلاق کی تعلیم اور دعوت دیتے ہیں جو صلح و جنگ، رزم و بزم سب پر حاوی ہے،

خاتمۂ کتاب

نعتیہ کلام

ڈاکٹر صاحب کی شاعری محبت وطن اور محبت قوم سے شروع ہوئی اور محبت الٰہی و محبت رسول پر اس کا خاتمہ ہوا، اس لیے ہم بھی اس کتاب کا خاتمہ انہی دونوں پر کرتے ہیں، عام رسم و رواج کے مطابق ہر کتاب کی ابتدا حمد و نعت سے کی جاتی ہے، لیکن ہماری اس کتاب کو یہ مزید شرف حاصل ہے کہ اس کا خاتمہ بھی حمد و نعت پر ہوتا ہے،

ڈاکٹر صاحب کی شاعری پر ایک صوفیانہ اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس کو پڑھ کر خدا کے ساتھ انسان کا تعلق عبودیت و معبودیت اور عشق و محبت کا باقی نہیں رہتا، بلکہ حریفانہ و مساویانہ ہو جاتا ہے، خلیفہ عبد الحکیم نے لکھا ہے کہ اقبال نے شکوہ میں خدا کے ساتھ جو شوخیاں کی ہیں، وہ نٹشے کے الحادی فلسفہ کا نتیجہ ہیں، لیکن ہمارے نزدیک یہ نٹشے کے فلسفے کا نتیجہ نہیں بلکہ وہ انسان کی قوتِ تخلیق اور قدرت و اختیار کو اس زور و مبالغہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں، کہ جوش بیان میں اس قسم کے مصرعے

مگر با ایزد انباز است آدم

خود بخود ان کے قلم سے ٹپک پڑتے ہیں، کیونکہ جب تک وہ لوگون کو نہایت پرجوش اور مبالغہ آمیز طریقہ پر انسان کی قوت عمل کا یقین نہ دلاتے اس وقت تک ان کے فلسفۂ خودی کے اثبات مین شاعرانہ زور نہ پیدا ہوتا، لیکن اس مین شبہہ نہیں کہ ان کا زور بیان حسن ادب کے خلاف ہے،

معتزلہ بھی انسان کی قوت تخلیق اور قدرت و اختیار کے قائل ہین لیکن باانہمہ وہ انسان کو خدا کے پاس ادب سے خالق نہین کہتے، لیکن آخر عمر مین جب زور بیان کے بجائے ڈاکٹر صاحب کے کلام مین سوز و گداز پیدا ہوا تو انھون نے اس سوء ادب کی تلافی کر دی اور نہایت عجز و الحاح کے ساتھ خدا کے سامنے گنہگار بندون کی طرح سر جھکایا اور اس حیثیت سے ارمغان حجاز مین "حضورِ حق" کے عنوان سے جو قطعات لکھے وہ نہایت پر درد، پر سوز اور موثر ہین، ہم ان مین سے اس موقع پر چند قطعون کا انتخاب درج کرتے ہین،

عطا کن شور رومی سوز خسرو | عطا کن صدق و اخلاص سنائی
چنان با بندگی در ساختم من | نہ گیرم گر مرا بخشی خدائی

بپایان چون رسد این عالم پیر | شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور خواجہ ما را | حساب من ز چشم او نہان گیر

سخن ہا رفت از بود و نبود م | من از خجلت لب خودم کشودم
سجود زندہ مردان مے شناسی | عیار کار من گیر از سجودم

دلے در سینہ دارم بے سرورے | نہ سوزے در کف خاکم نہ نورے
بگیر از من کہ بر من بار دوش است | ثواب این نماز بے حضورے

مسلمانے کہ در بند فرنگ است | دلش در دست او آسان نیاید
ز سیمائے کہ سودم بر در غیر | سجودِ بوذر و سلمانؓ نیاید

نخواہم این جہان و آن جہان را | مرا این بس کہ دانم رمز جان را
سجودے دہ کہ از سوز و سرورش | بوجد آرم زمین و آسمان را

دل ما بیدلان بردند و رفتند | مثال شعلہ افسردند و رفتند

بیا یک لحظہ با عامان در آمیز — کہ خاصان بادہ با خود روند و رفتند

چہ شور است این کہ در آب و گل افتاد — زیک دل عشق را صد مشکل افتاد

قرار یک نفس بر من حرام است — بمن رحمے کہ کارم با دل افتاد

لیکن ڈاکٹر صاحب کے دل مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت محبتِ الٰہی پر بھی غالب آگئی تھی، انکی آخری آرزو فریضۂ حج کی ادائگی تھی لیکن اس آرزو کی اصل محرک دیارِ حبیب کی زیارت تھی، چنانچہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرماتے ہین،

در آن دریا کہ او را ساحلے نیست — دلیل عاشقان غیر از دلے نیست

تو فرمودی رہ بطحا گرفتم — وگرنہ جز تو ما را منزلے نیست

لیکن بدقسمتی سے ان کو یہ دونون سعادتین نصیب نہین ہوئین، تاہم عالم خیال اور عالم شوق مین انھون نے سفر حج کی تمام منزلین طے کرلین اور جب مکہ سے مدینہ کا خیالی سفر کیا تو محبتِ رسول مین خدا کو مکہ ہی مین چھوڑ آئے اور خود خدا سے صاف صاف کہدیا،

تو باش اینجا و با خاصان بیامیز — کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

اس بنا پر ڈاکٹر صاحب کے نعتیہ کلام مین جو جوش و خروش، جو صدق و اخلاص اور جو سوز و گداز پایا جاتا ہے اس کی نظیر فارسی اور اردو شاعری مین بہ مشکل مل سکتی ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب کی شاعری کے تیسرے دور مین سوز و گداز کم اور جوش و خروش زیادہ ہے، اس لیے انھون نے جواب شکوہ کے اخیر مین جو چند نعتیہ اشعار لکھے ہین وہ جوش بیان کا بے مثل نمونہ ہین، نعت گوئی اگرچہ ایشیائی شاعری کی ایک مستقل صنف بن گئی ہے لیکن بہرحال وہ فرض و واجب نہین ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان نعتیہ اشعار کی ابتدا خود خدا کے حکم سے کی ہے، جس کے معنی یہ ہین کہ یہ اشعار انھون نے حکم خداوندی کی بجاآوری مین فرضِ عین سمجھ کر لکھے ہین، اور وہ محض لطف و تفریح کا ذریعہ نہین

ہین ملکہ نعت گوئی ایسی متبرک چیز ہے کہ اس کی برکت سے مسلمانون کے تمام مصائب دور ہو سکتے ہین اور وہ خلافت الٰہی کا مستحق ہو سکتا ہے،

خداوند تعالیٰ ان کو حکم دیتا ہے،

مثلِ بو قید ہے غنچے مین پریشان ہو جا | رخت بر دوش ہوائے چمنستان ہو جا
ہے تنک مایہ تو ذرے سے بیابان ہو جا | نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفان ہو جا
قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے | دہر مین اسم محمدؐ سے اجالا کر دے

اور وہ اس حکم کی تعمیل مین اس طرح زمزمہ سنج ہوتے ہین،

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو | چمن دہر مین کلیون کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو | بزم توحید بھی دنیا مین نہ ہو تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے | نبض ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے
دشت مین، دامن کہسار مین، میدان مین ہے | بحر مین، موج کی آغوش مین، طوفان مین ہے
چین کے شہر، مراقش کے بیابان مین ہے | اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان مین ہے
چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے | رفعتِ شانِ رفعنالکَ ذکرکَ دیکھے
مردم چشم زمین یعنی وہ کالی دنیا | وہ تمھارے شہدا پالنے والی دنیا
گرمیِ مہر کی پروردہ ہلالی دنیا | عشق والے جسے کہتے ہین بلالی دنیا
تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح | غوطہ زن نور مین ہے آنکھ کے تارے کی طرح
عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری | میرے درویش خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری | تو مسلمان ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہین | یہ جہان چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہین

اردو شاعری مین نعت گوئی کا یہ سب سے اعلیٰ نمونہ ہے جس مین جوشِ بیان کے ساتھ نہایت لطیف تخئیلی رنگ موجود ہے، اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اسرارِ خودی مین چند نعتیہ اشعار لکھے ہین، اور وہ علانیہ عام نعت گو شعراء سے ممتاز ہین، ہمارے نعت گو شعراء نے اپنی حیثیت ایک عاشق کی فرض کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معشوق فرض کرکے آپ کے حقیقی اوصاف کو چھوڑ کر زیادہ تر آپ کے حسن وجمال اور خط وخال کی مبالغہ آمیز تعریف کی ہے، اگرچہ اس مین شبہہ نہین کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجولیت کاملہ کے بہترین مظہر تھے، اور مردانہ حسن وجمال کی تمام خصوصیات آپ مین موجود تھین، اور صحابہؓ نے بھی بعض موقعون پر آپ کے ظاہری حسن وجمال کی تعریف کی ہے، بااینہمہ قرآن مجید مین صرف آپ کے روحانی واخلاقی فضائل مذکور ہین، حسن وجمال کا کہین تذکرہ نہین، اس لیے نعت گوئی کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس معاملے مین قرآن مجید کا اتباع کیا جائے اور نعتیہ اشعار مین آپ کے روحانی اور اخلاقی فضائل بیان کیے جائین، اور ڈاکٹر صاحب نے اسرارِ خودی مین یہی طریقہ اختیار کیا ہے،

عاشقی آموز و محبوبے طلب — چشمِ نوحے قلبِ ایوبے طلب
کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے — بوسہ زن بر آستانِ کاملے
شمعِ خود را ہمچو رومی بر فروز — روم را در آتشِ تبریز سوز
ہست معشوقے نہان اندر دلت — چشم اگر داری بیا بنمایمت
عاشقانِ او ز خوبان خوب تر — از حسینانِ جہان محبوب تر
دل ز عشقِ او توانا مے شود — خاک ہمدوشِ ثریا مے شود
خاکِ نجد از فیضِ او چالاک شد — آمد اندر وجد و بر افلاک شد
در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است — آبروے ما ز نامِ مصطفیٰ است

بوریا ممنون خوابِ راحتش — تاجِ کسریٰ زیرِ پاے امتش

در شبستانِ حرا خلوت گزید — قوم و آئینِ حکومت آفرید

ماندِ شبہا چشمِ او محروم نوم — تا بہ تختِ خسروی خوابیدہ قوم

وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز — دیدۂ او اشکبار اندر نماز

در دعاے نصرت آمین تیغِ او — قاطعِ نسلِ سلاطین تیغِ او

در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خوان نشست

در مصافے پیشِ آن گردون سریر — دخترِ سردارِ طے آمد اسیر

پاے در زنجیر و ہم بے پردہ بود — گردن از شرم و حیا خم کردہ بود

چون نبی دخترِ چہ را بے پردہ دید — چادرِ او پیشِ روے او کشید

ما از ان خاتونِ طے عریان تریم — پیشِ اقوامِ جہان بے پردہ ایم

ان اشعار کا رنگ تخئیلی نہین ہے بلکہ حقیقی واقعات کو موثر طریقہ پر بیان کیا گیا ہے لیکن چونکہ خود واقعات غیر معمولی ہین اس لیے خود بخود ان اشعار مین مخفی جوش پیدا ہو گیا ہے، اسکے بعد ڈاکٹر صاحب ایک مدت تک خودی کے نشے مین چور رہے، اس لیے انھون نے اس موضوع پر کچھ نہین لکھا، لیکن اخیر عمر بالخصوص زمانہ علالت مین جب ان کے دل مین غیر معمولی سوز و گداز پیدا ہوا تو انھون نے پھر نعتیہ شاعری کی طرف توجہ کی اور اس موضوع پر ارمغان حجاز مین نہایت پر درد اور پر تاثیر قطعات لکھے، جن کا ایک حصہ ہم سفر حج کے سلسلہ مین نقل کر چکے ہین، بقیہ چند منتخب قطعات، جو اس خیالی سفر سے تعلق نہین رکھتے، اس موقع پر بھی نقل کرتے ہین،

حکیمان را بہا کمتر نہادند — بنادان جلوۂ مستانہ دادند

چہ خوش بختے، چہ خرم روزگارے — در سلطان بہ درویشے کشایند

مسلمان آن فقیر کج کلاہے — رمید از سینۂ او سوز آہے

دلش نالد! چرا نالد؟ نداند — نگاہے یا رسول اللہ نگاہے

تب و تاب دل از سوز غم تست — نوائے من ز تاثیر دم تست

بنالم زانکہ اندر کشور ہند — ندیدم بندۂ کو محرم تست

شب ہندی غلامان را سحر نیست — باین خاک آفتابے راگذر نیست

بما کن گوشۂ چشمے کہ در شرق — مسلمانے ز ما بیچارہ تر نیست

نماند آن تاب و تب در خون نابش — نروید لالہ از کشت خرابش

نیام او تہی چون کیسۂ او — بطاق خانۂ ویران کتابش

حق آن دہ کہ مسکین و اسیر است — فقیر و غیرت او دیر میرست

بروے او در میخانہ بستند — درین کشور مسلمان تشنہ میر است

مپرس از من کہ احوالش چسان است — زمینش بدگہر چون آسمان است

بآن مرغے کہ پروردی بانجیر — تلاش دانہ در صحرا گران است

دگرگون کرد لادینی جہان را — ز آثار بدن گفتند جان را

ازان فقرے کہ با صدیق دادی — بشورے آور این آسودہ جان را

شبے پیش خدا بگریستم زار — مسلمانان چرا زارند و خوارند

ندا آمد نمیدانی کہ این قوم — دلے دارند و محبوبے ندارند

مرا تنہائی و آہ و فغان بہ — سوے یثرب سفر بے کاروان بہ

کجا مکتب، کجا میخانۂ شوق — تو خود فرما مرا این بہ کہ آن بہ

یہ اور اس قسم کے اور بہت سے قطعات سے ڈاکٹر صاحب اور دوسرے نعت گو شعرار کے کلام کا فرق معلوم ہو سکتا ہے، تمام نعت گو شعرار کا انداز بالکل عاشقانہ شاعری کا ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا معشوق فرض کرتے ہین، اور آپ کے سامنے زیادہ تر اپنا ذاتی دکھڑا روتے ہین، لیکن ڈاکٹر صاحب نے نعتیہ شاعری کو بالکل قومی شاعری بنا دیا ہے، اور موجودہ دور مین مسلمان جن مصیبتون مین مبتلا ہین ان کو ایک ایک کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک مین پیش کیا ہے، مثلاً

ملوکیت سراپا شیشہ بازی است | از و ایمن نہ رومی نے حجازی است
حضور تو غم یاران بگوییم | بامیدے کہ وقتِ دلنوازی است

ہنوز این چرخ نیلی کج خرام است | ہنوز این کاروان دور از مقام است
ز کارِ بے نظامِ او چہ گوییم | تو مے دانی کہ ملت بے امام است

لوگ کہتے ہین کہ خودی کا فلسفہ ڈاکٹر صاحب نے یورپ کے فلسفیون سے سیکھا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب کے نعتیہ اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فلسفہ انھون نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کیا ہے،

چو خود را در کنار خود کشیدم | بہ نورِ تو مقامِ خویش دیدم
درین دیر از نوائے صبحگاہی | جہانِ عشق و مستی آفریدم

اثبات خودی کا سب سے زیادہ پرجوش مقدمہ عشق ہے، لیکن اس عشق کا ماخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ ہے،

جہان از عشق و عشق از سینۂ تست | سرورش از مے دیرینۂ تست
جز این چیزے نمیدانم ز جبرئیل | کہ او یک جوہر از آئینۂ تست

غرض ڈاکٹر صاحب کی شاعری کے عنوانات مین سب سے زیادہ پرجوش، پرسوز اور پر درد عنوان

اسی نعتیہ شاعری کا ہے، لیکن اس پر بہت کم لوگوں نے لکھا ہے، ہماری نظر سے صرف ایک مضمون سید وحید اللہ وحید کا گذرا ہے، جو آثار اقبال میں درج ہے، لیکن وہ نہایت تشنہ و ناکمل ہے، بلکہ سچ پوچھیئے تو نعتیہ شاعری ڈاکٹر صاحب کی پوری شاعری کا خلاصہ ہے، جس کی تشریح کے لیے ایک دفتر درکار ہے، اس لیے ہم بھی اس موضوع کو تشنہ و ناکمل چھوڑ کر صرف ایک عاشقانہ قطعہ پر اس عنوان کو ختم کرتے ہیں،

دلے برکفِ نہادم دلبرے نیست — متاعے داشتم غارتگرے نیست

درونِ سینۂ من منزلے گیر — مسلمانے زمن تنہاترے نیست

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

———:———
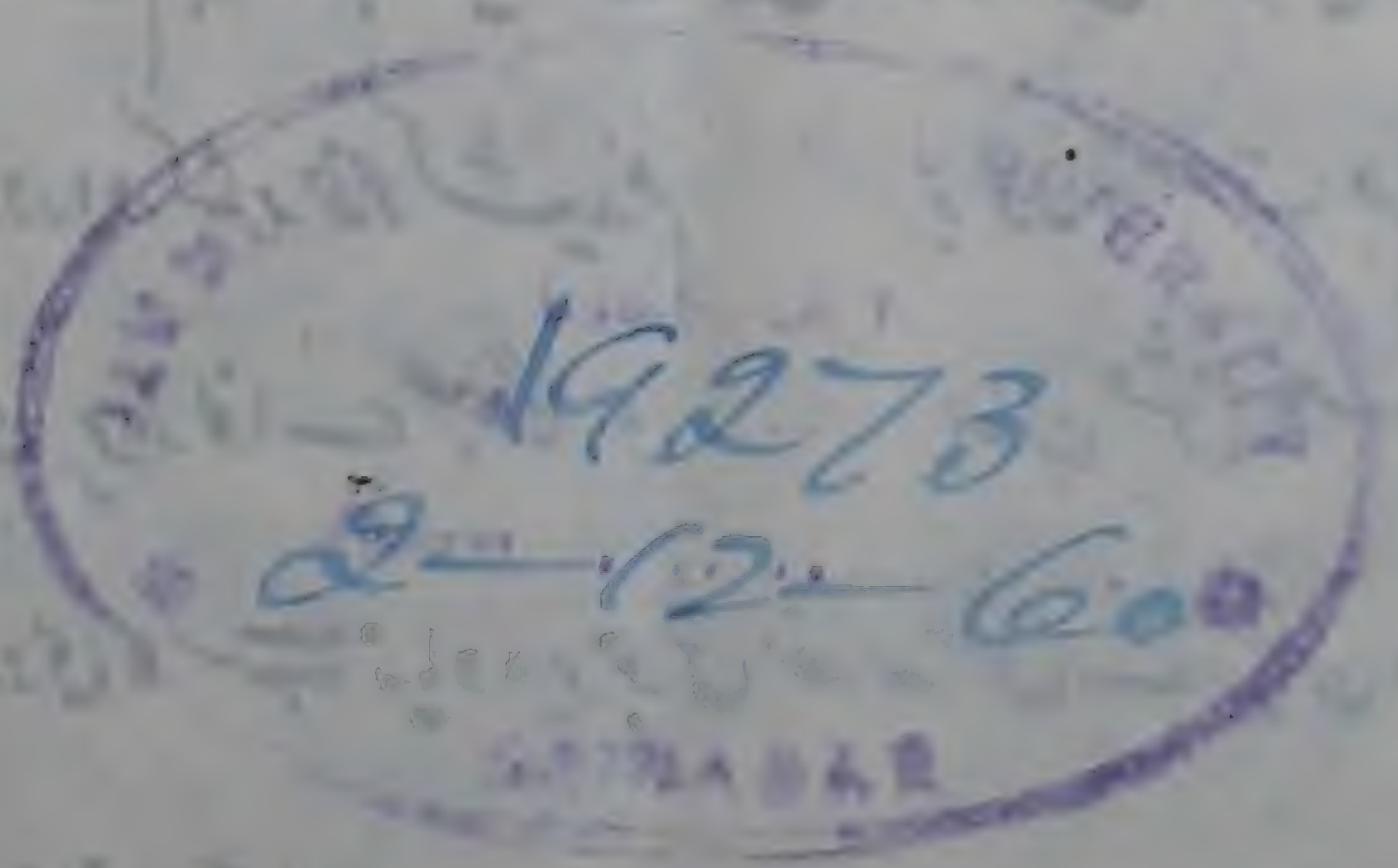
آلِ تیمور کا علمی و ادبی تذکرہ

یعنی

بزمِ تیموریہ

تیموریون کی علم نوازی و علم پروری اور اُن کے دربار کے علمار، وفضلار، وشعرار کا حال پڑھنا ہو تو اس کتاب کا مطالعہ کیجئے، اس کو پڑھنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ تیموری بادشاہون، شاہزادون، اور شاہزادیون مین کون زیادہ علم و فن کا شیدائی، اور زبان و ادب کا صحیح مذاق رکھتا تھا، تیموری فرمانرواؤن کی رزم آرائیون، اور فتوحات کے قصّے تو بہت لکھے گئے تھے، لیکن اُن کی علم و فن کی بزم آرائیون اور اُن کے ذوقِ علم و ادب کی داستانین مرتّب و مربوط طریقہ پر اب تک کسی زبان مین قلم بند نہین کی گئین، دنیا صرف یہ جانتی تھی، کہ تیموری بادشاہ جنگ و جدل اور رزم و پیکار کے مردِ میدان تھے، مگر اس کتاب کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا کہ اُن مین سے ہر ایک شعر و سخن کا ادا شناس، اور علم و فن کا جان دادہ تھا، انھون نے علمار، وفضلار، وشعرار کی جس طرح سرپرستی کی، وہ دنیا کی تاریخ مین اپنی مثال آپ ہے،

مرتبہ: سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے علیگ رفیق دار المصنفین،

ضخامت:- ۴۰۰ صفحے، قیمت:- معہ ر

"منیجر"

(طابع و ناشر صدیق احمد)